آج

۵۷

یوسف القعید　　ارجمند آرا　　نیر مسعود

محمد انور خالد　　رمیش بخشی　　دھیریندر استھانا

شیلیش مٹیانی　　گیتانجلی شری　　کملیشور

ترتیب

اجمل کمال

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

آج

ادبی کتابی سلسلہ شمارہ ۵۷

جون ۲۰۰۷ء

سالانہ خریداری:
پاکستان: ایک سال (چار شمارے) ۳۰۰ روپے (بشمول ڈاک خرچ)
بیرون ملک: ایک سال (چار شمارے) ۴۵ امریکی ڈالر (بشمول ڈاک خرچ)

رابطہ:
پاکستان: آج کی کتابیں، 316 مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی 74400
فون: 5213916 5650623
ای میل: ajmalkamal@gmail.com, aajquarterly@gmail.com

دیگر ممالک:
Dr. Baidar Bakht, 21 White Leaf Crescent, Scarborough,
Ontario M1V 3G1, Canada.
Phone: (416) 292 4391Fax: (416) 292 7374
E-mail: bbakht@rogers.com

Scanned with CamScanner

ترتیب

یوسف القعید

۵

سرزمینِ مصر میں جنگ

(ناول)

ارجمند آرا

۱۶۹

بے خطر جیتے ہیں اربابِ ریا میرے بعد

نیر مسعود

۱۸۷

نسخۂ کیمیا

محمد انور خالد

آخری نظمیں

۱۹۷

اداس لڑکیاں

مفاہمت ایک ویران راستہ ہے

Scanned with CamScanner

جان کہانی بند کرو

گلابی لڑکیاں

وصل قسمت میں نہیں

رمیش بخشی

۲۰۵

شبری

دھیریندر استھانا

۲۲۳

مانسی

شیلیش ٹیانی

۲۴۶

اردھانگنی

گیتانجلی شری

۲۷۲

پرائیویٹ لائف

کملیشور

۲۸۲

ماس کا دریا

Scanned with CamScanner

يوسف القعيد

سرزمینِ مصر میں جنگ

انگریزی سے ترجمہ

اجمل کمال

Scanned with CamScanner

آئندہ صفحات میں مصری ادیب یوسف القعید کے ناول الحرب فی برّ مصر کا مکمل اردو ترجمہ سرزمین مصر میں جنگ کے عنوان سے پیش کیا جارہا ہے۔ عربی میں یہ ناول ۱۹۷۸ء میں بیروت سے شائع ہوا تھا۔ اردو ترجمے کے لیے الساقی بکس، لندن، کے شائع کردہ انگریزی ترجمے کو استعمال کیا گیا ہے۔ یہ ترجمہ اولیو کینی (Olive Kenny)، لورنے کینی (Lorne Kenny) اور کرسٹوفر ٹنگلی (Christopher Tingley) نے کیا اور پہلی بار ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا۔ انگریزی ترجمے کے ساتھ ساتھ ناول کے اصل عربی متن کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے جو مکتبہ مدبولی، قاہرہ، نے ۱۹۹۱ء میں شائع کیا تھا۔ ناول کا تعارف اس متن کے ترجمہ شدہ اقتباسات پر مشتمل ہے جو الساقی بکس والے ایڈیشن میں Afterword کے عنوان سے شامل ہے اور فدوی مالتی ڈگلس (Fedwa Malti-Douglas) کا تحریر کردہ ہے جو یونیورسٹی آف ٹیکسس، آسٹن، کے اورینٹل اینڈ افریکن لینگویجز اینڈ لٹریچر کے شعبے سے وابستہ رہی ہیں۔

یہ ناول 'مغربی' پڑھنے والوں سے کہیں زیادہ ہمارے خطے خصوصاً پاکستان کے پڑھنے والوں کے لیے قریبی معنویت رکھتا ہے، کیونکہ اس میں کہانی کے خدوخال جن موضوعات سے متعین ہوتے ہیں وہ جاگیرداری نظام اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی سماجی ناہمواری، طبقاتی جبر، موقع پرستی کی سیاست اور بےحس نوکرشاہی کی سفاکی کے حقائق سے تعلق رکھتے ہیں جن سے ہمارے لکھنے والے تخلیقی طور پر بےنیاز سہی لیکن بہت سے پڑھنے والے یقیناً مانوس ہیں۔ اس کہانی سنانے کے لیے یوسف القعید نے جس انوکھے ڈھنگ کو برتا ہے اس کی بدولت مصری سماج کی مختلف پرتیں انسانی زندگی کے نشیب وفراز کی صورت میں پڑھنے والے کے سامنے آجاتی ہیں، اور یہ ڈھنگ کہانی کے مرکزی کرداروں پر گزرنے والے المیے کو نہایت متاثر کن طور پر روشن کردیتا ہے۔

ناول کے واقعات جس زمانے میں پیش آئے ہیں وہ ۱۹۷۳ء کی عرب اسرائیل جنگ کا زمانہ ہے، لیکن یہ زمانہ مصر کی داخلی سیاست میں بھی ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس دور میں مصر کے مقتدر طبقوں (جاگیردار اور فوج) کے بیرونی استعماری طاقتوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کے نتیجے میں سیاست کا رخ تبدیل ہوا اور جمال عبدالناصر کے دورِ حکومت میں کی جانے والی زرعی اور سماجی اصلاحات کا پہیہ واپس پھیرا گیا۔ اس ناول میں جنگ کی المناک حقیقت داخلی سیاست سے اتنی مضبوطی کے ساتھ پیوست ہے کہ نہ انھیں ایک دوسرے سے الگ کیا جاسکتا ہے اور نہ ایک دوسرے کے بغیر سمجھا جاسکتا ہے۔

— اجمل کمال

Scanned with CamScanner

تعارف

محمد یوسف القعید کا جنم ۱۹۴۴ء میں مصر کے ساحلی علاقے البحیرہ کے الدہریہ نامی گاؤں میں ہوا۔ ان کے باپ کا تعلق ان بے زمین فلاحین (کسانوں) کے طبقے سے تھا جو اپنے چھوٹے چھوٹے کھیتوں پر تمام عمر مزدوری کرنے کے باوجود ان کی ملکیت کے حق سے محروم رہتے ہیں اور جن پر فرعونی دور سے اب تک مصری باشندوں کی اکثریت مشتمل رہی ہے۔ مصر کے ادبی حلقوں میں (بلکہ تمام پیشہ ور حلقوں میں) یہ پس منظر عموماً پایا نہیں جاتا۔ علاوہ ازیں، مصر کے بیشتر معروف ادیبوں اور دانشوروں کے برخلاف، یوسف القعید نے اپنی تمام تر تعلیم اپنے آبائی علاقے ہی میں رہ کر حاصل کی۔ وہیں انھوں نے تعلیم مکمل کر کے تین سال تک پڑھایا اور پھر فوج میں بھرتی ہو کر ۱۹۶۷ء اور ۱۹۷۳ء کی جنگوں کا قریبی مشاہدہ کیا۔

القعید ایک پُرنویس ادیب ہیں اور ان کے گیارہ ناول اور کہانیوں کے چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا پہلا ناول ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا تھا، اور تب سے ناول کی صنف ان کے تخلیقی اظہار کا بنیادی وسیلہ رہی ہے۔ عربی ادب میں ناول (جسے عربی زبان میں روایۃ کہا جاتا ہے جبکہ مختصر کہانی کے لیے قصۃ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے) ایک مقابلتاً نئی صنف ہے۔ اس کا آغاز بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں ہوا۔ ابتدا کے تجرباتی دور میں عرب ادیب روایتی ادبی ہیئتوں کو جدید بنا کر انھیں ناول کی صورت دینے کی کوشش کرتے رہے، لیکن آگے چل کر عرب دنیا کے بیشتر نثر نگاروں نے ناول اور کہانی کی ایسی ہیئتوں کو اپنا لیا جو بنیادی طور پر مغربی تھیں۔

عرب ادیبوں کو سیاسی اور سماجی ناولوں میں بے حد کشش محسوس ہوتی رہی ہے، اور زیادہ تر صورتوں میں ان کے ناولوں کی ہیئت، بیانیے اور تنظیم کے اعتبار سے، کلاسیکی، بلکہ روایتی طرز کی رہی ہے۔ مصر کے عام ناولوں کی ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ شہری پس منظر رکھتے ہیں؛ اگر دیہاتی کردار ان میں نمودار ہوتے بھی ہیں تو اس وقت جب وہ قاہرہ یا اسکندریہ جیسے شہروں میں قدم رکھتے ہیں۔ تاہم، مصری ادیبوں کی نئی نسل کی آمد کے ساتھ عربی ناول کی صورت حال میں بہت تبدیلی آئی۔ اب دیہی پس منظر پر زیادہ زور دیا جانے لگا۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اگرچہ بیشتر نئے ناول اب بھی سماجی موضوعات پر مبنی ہوتے ہیں، ان کی تعمیر اور تنظیم بہت مختلف ڈھنگ سے کی جانے لگی۔

Scanned with CamScanner

یوسف القعید کو مصری ناول نگاروں کی اس نئی نسل کا ایک نمائندہ ترین ادیب سمجھا جاتا ہے۔ ان کے ناولوں میں سماجی ضمیر کا نہایت طاقتور اظہار بیانیہ تکنیکوں کے بے حد خلاقانہ استعمال کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔ مثلاً ان کے ناول ثلاثیة شکاوی المصری الفصیح (ایک فصیح مصری کی شکایتیں) میں ایک ادیب کو ایک ناول لکھنے میں مصروف دکھایا گیا ہے، اور اس زیرِ تحریر ناول کے مختلف مسودوں کو، دیگر دستاویزات سمیت، ناول کا حصہ بنا دیا گیا ہے۔ ایک اور ناول یحدث فی مصر الآن (یہ مصر میں اس وقت ہو رہا ہے) کے آغاز میں پڑھنے والے کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ مصنف کے ساتھ مل کر ناول کو وضع کرے، اور آگے چل کر اس مقصد کے لیے کچھ دستاویزات مہیا کی جاتی ہیں۔

ناول الحرب فی برّ مصر (سرزمینِ مصر میں جنگ) کی بنیاد اسی عنوان سے لکھی گئی ایک کہانی پر رکھی گئی۔ یہ ناول ۱۹۷۵ء میں لکھا گیا لیکن ۱۹۷۸ء سے پہلے شائع نہ ہو سکا، اور اس وقت بھی مصر میں نہیں بلکہ بیروت میں چھپا۔ اس کا پہلا مصری ایڈیشن کہیں ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا۔ اپنی متعدد دوسری تحریروں کی طرح اس ناول میں بھی یوسف القعید نے ادبی اختراع کو خود بیانیے کا حصہ بنا دیا ہے؛ کہانی چھ کرداروں کی زبانی بیان کی گئی ہے جن میں سے ہر ایک کہانی کا ایک حصہ بیان کرتا ہے۔ متعدد راویوں کی تکنیک عربی فکشن میں اس سے پہلے بھی استعمال کی جاتی رہی ہے اور اس سلسلے میں نجیب محفوظ کا نام خاصا نمایاں ہے۔ لیکن القعید کے اس ناول میں یہ تکنیک محفوظ سے مختلف صورت میں سامنے آئی ہے۔ یہاں کوئی بھی راوی پورے پلاٹ کو پیش نہیں کرتا؛ درحقیقت ان مختلف راویوں کے سنائے ہوئے کہانی کے حصوں میں مشترک چیزیں بہت کم ہیں اور واقعات کی تکرار قریب قریب بالکل نہیں ہے۔ اس طرح ناول کا پلاٹ بالکل اسی طرح آگے بڑھتا جاتا ہے جیسے کسی ایسے ناول میں جو کسی ایک راوی کی زبانی بیان کیا گیا ہو۔ یہ متعدد راویوں کی تکنیک کا ایک منفرد استعمال ہے جس سے مختلف راویوں کے درمیان بیانیے کا ایک کھنچاؤ پیدا ہو گیا ہے اور کہانی کا تسلسل برقرار رہتا ہے۔ تکرار کی عدم موجودگی نے کہانی کے ڈرامائی تاثر کو بڑھا دیا ہے، جبکہ اس ڈرامائی صراحت کو پانے کے لیے متعدد راویوں کے متنوع تناظر قربان کرنے کی بھی ضرورت نہیں پڑی۔ ناول کے راویوں کی صورت میں القعید نے مصر کے سماجی ٹائپس کا ایک مختصر سا کیٹلاگ فراہم کر دیا ہے۔ ناول کا ہر راوی گویا اپنی باری پر اسٹیج پر آتا ہے اور اپنی خودکلامی کو بلند آواز سے پیش کرتا ہے۔ متعدد راویوں کی تکنیک اس موضوع کو بھی ابھار کر سامنے لاتی ہے جو یوسف القعید کے فکشن میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے، یعنی خود فنی تخلیق کا موضوع۔ کہانی کے راوی نہ صرف اپنے بیانیہ کرداروں کا شعور رکھتے ہیں بلکہ انھیں دیگر راویوں کی موجودگی کا بھی احساس ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ راویوں کا باہمی رشتہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ تکنیک محض ہیئت کا معاملہ نہیں بلکہ کرداروں

Scanned with CamScanner

کے درمیان موجود تنازعات کے اظہار کا ذریعہ بھی ہے، اور یہ تنازعات ان تضادات کی جانب اشارہ کرتے ہیں جو مصر کے دیہی سماج میں حقیقتاً موجود ہیں۔

ناول کے چھ کے چھ راوی کسی نام کے بغیر ہیں اور کہانی کے اہم کردار بھی ہیں، واحد استثنیٰ ناول کا مرکزی کردار ''مصری'' ہے، جس کو راوی کا کردار نہیں سونپا گیا۔ پہلے تین راوی وہ ہیں جن کا گاؤں کی زندگی سے براہ راست تعلق ہے، جبکہ آخری تین راوی شہر سے تعلق رکھتے ہیں اور گاؤں کی زندگی کے لیے اجنبی ہیں۔ راوی جس ترتیب سے سامنے آتے ہیں اس کی بھی معنویت ہے۔ پہلے تین راوی کہانی کے مرکزی کردار مصری سے قریب آتے جاتے ہیں، اس طرح کہ پہلا راوی، گاؤں کا عمدہ (مکھیا)، اس سے سب سے زیادہ دور جبکہ تیسرا، یعنی اس کا باپ، اس کے سب سے زیادہ قریب ہے۔ اس کے برعکس آخری تین راوی مصری سے رفتہ رفتہ دور ہوتے چلے جاتے ہیں، اس طرح کہ چوتھا راوی مصری کا فوج کا ساتھی اور دوست ہونے کی بنا پر اس سے سب سے زیادہ قریب اور چھٹا راوی، تفتیش کار، اس سے سب سے زیادہ فاصلے پر ہے اور کہانی کے واقعات سے باہر رہتا ہے۔ چنانچہ ناول پہلے نصف میں رفتہ رفتہ مرکز سے قریب آتا اور بعد کے نصف میں اس سے دور ہوتا چلا گیا ہے، اور یہ مرکز کہانی کا مرکزی کردار مصری ہے۔

تاہم مصری کا کردار کئی اعتبار سے ابہام رکھتا ہے۔ اسے کہانی کا مرکزی کردار ہونے کے باوجود بیانیہ آواز سے محروم رکھا گیا ہے: ناول کا کوئی باب اس کے حوالے نہیں کیا گیا جہاں وہ واقعات کو اپنے زاویے سے بیان کر سکے۔ مصری کی بے نوائی کا تعلق اس کی بے طاقتی سے ہے۔ کہانی کے باقی تمام کردار مصری کی تقدیر پر اثر انداز ہوتے ہیں، اور ہم ان کو باری باری اس کی زندگی کے خدوخال کا تعین کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ القعید کے فکشن کے متعدد دوسرے مرکزی کرداروں کی طرح مصری بھی اپنی زندگی پر کوئی اختیار نہیں رکھتا۔

لیکن مصری ایک اور اعتبار سے بھی ناول کے دوسرے کرداروں سے ممتاز ہے: صرف وہی ایک ایسا کردار ہے جسے ایک نام دیا گیا ہے۔ البتہ اس نام کے سلسلے میں اس کی ملکیت محض ظاہری حیثیت رکھتی ہے۔ ''مصری'' کے معنی ''مصر کا باشندہ'' کے ہیں، چنانچہ یہ نام کسی انفرادیت سے عاری ہے۔ بلاشبہ نام کسی بھی شخص کی شناخت کا جز ہوتا ہے، اور مصری کے نام میں موجود ابہام صرف اتنا ہی نہیں کرتا کہ اسے مصر کے تمام باشندوں کا نمائندہ بنا دے، بلکہ شناخت کے اس الجھاوے کو بھی ظاہر کرتا ہے جو اس کے خلاف ہونے والی سازش کا مرکزی نکتہ ہے، کیونکہ مصری کا نام اور اس کی شناخت ناول کے پلاٹ ہی نہیں بلکہ اس کی تنظیم کے سلسلے میں بھی انتہائی اہمیت رکھتی ہے۔ صرف اسی کو ایک نام دیا گیا ہے، تاہم اس کا اصل نام مسلسل پوشیدہ رکھا جاتا ہے۔ ایک موقعے پر جہاں وہ رجسٹر میں اندراج کے لیے اپنا نام بتاتا ہے، ناول نگار نے اس نام کو پڑھنے والے سے پوشیدہ

Scanned with CamScanner

رکھا ہے۔ مصری کہانی کا مرکز سہی لیکن یہ ایک غیر موجود مرکز ہے: وہ نہ صرف راوی کے طور پر غیر موجود بلکہ ایک لحاظ سے کردار کے طور پر بھی معدوم ہے، کیونکہ اس کی شناخت ایک اور کردار، عمدہ کے بیٹے، کی شناخت میں ضم ہو گئی ہے۔ حتیٰ کہ اس کا نام بھی جو دوسرے کرداروں کی بے نامی کے مقابلے میں ایک موجودگی کا التباس پیش کرتا ہے، دراصل ایک قسم کی غیر موجودگی ہے کیونکہ ایک نام جس کا اطلاق مصر کے تمام باشندوں پر ہوتا ہو، وہ کسی ایک باشندے کی شناخت کو متعین نہیں کر سکتا۔ اس طرح دیکھیے تو مصری کو صرف انصاف سے محروم نہیں کیا گیا بلکہ اس کی پوری شناخت ہی خطرے کی زد میں آ گئی ہے۔

ناول کے دیگر تصورات اسی مرکزی غیر موجودگی کے اردگرد تعمیر کیے گئے ہیں۔ القعید کا سب سے مستحکم سروکار امیر اور غریب کے درمیان واقع خلیج، اس بے پناہ فرق سے ہے جو ان طبقوں کی زندگیوں کے طرز میں پایا جاتا ہے۔ عمدہ اور چوکیدار دونوں کے خاندانوں کے درمیان موجود سماجی فرق اس حقیقت سے اور بھی زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے کہ دونوں کے بیٹے ایک ہی گاؤں میں ایک ہی دن پیدا ہوئے تھے۔ امیروں اور غریبوں کی زندگی نہایت بنیادی طور پر مختلف ہے۔ جیسا کہ چوکیدار وضاحت کرتا ہے، نیند ہی لوگوں کو دو گروہوں میں بانٹ دیتی ہے: ''ایک وہ جو اپنی مرضی سے جتنا چاہیں سو سکتے ہیں، اور دوسرے وہ جو ایسا نہیں کر سکتے۔''

القعید کے ہاں پایا جانے والا ایک اور تضاد شہر اور گاؤں کی زندگی کا ہے۔ شہر کے لوگ مختلف طرح زندگی گزارتے ہیں اور گاؤں میں داخل ہوتے ہی خود کو ایک اجنبی سرزمین میں محسوس کرتے ہیں۔ ان شہری کرداروں میں سے ایک رات کو ''دیہات کی تمام پراسرار آوازوں سے بھری ہوئی'' اور ایک ''مرموز زبان'' سے مشابہ قرار دیتا ہے۔ ایک اور جگہ اسی کردار کو دیہات کی زندگی ''اسرار اور حکایات سے پُر'' محسوس ہوتی ہے۔ ''حکایت'' کا لغوی مطلب کہانی ہے، لیکن اصطلاح کے طور پر یہ لفظ زبانی سنائی جانے والی داستان کے لیے بھی برتا جاتا ہے۔ تاہم کلاسیکی دور میں اسے خاص قسم کے بیانیہ ادبی متون کے لیے استعمال کیا جاتا تھا جن میں سے بعض اتنے طویل بھی ہوتے تھے جیسے جدید دور کے ناول۔ ایک لحاظ سے مصری کے دوبہت کے کہے ہوئے یہ مذکورہ بالا الفاظ یوسف القعید کے ناول نگاری کے مسلک اور ان کی زندگی دونوں کا احاطہ کرتے ہیں۔ اسرار گاؤں کی زندگی میں بھی موجود ہے اور اس کے متن کے مرکز میں بھی۔ اپنے مصنف کی طرح اس ناول نے بھی دیہات سے جنم لیا ہے اور یہ دیہات ہی کی کہانی سناتا ہے۔

— فدویٰ مالتی ڈگلس

Scanned with CamScanner

— ۱ —

عمدہ[1]

میں نہیں جانتا یہ کہانی کہاں سے سنانا شروع کروں۔ میں نے سوچا تھا کہ کل کی رات میرے خاندان کی زندگی میں ایک تاریخی رات ہے۔ سوتے وقت میرا ذہن اسی نشے کی کیفیت میں تھا، لیکن آج جو کچھ ہوا اس نے مجھے ایک عجیب حیرت میں ڈال دیا ہے۔ کل کی رات تاریخی تھی یا آج کا دن؟ میں نہیں جانتا۔ کل کا دن ایک عظیم دن تھا۔ برسوں بعد کل مجھے خوشی اپنے دل میں داخل ہوتی محسوس ہوئی۔ جو زمین ہم سے ۱۹۵۴ء میں چھین لی گئی تھی، وہ ہمیں لوٹا دی گئی۔ کل ہمیں اپنی عزت واپس مل گئی۔ کل کا دن ایسا تھا کہ اس کے وصف بیان کرنا دشوار ہے۔ چونکہ اپنی زمین دوبارہ پا لینے سے بڑھ کر زندگی میں اور کوئی خوشی نہیں ہو سکتی، میں اسی ساعت میں مر جانا چاہتا تھا۔ جس لمحے مجھے عدالت کے قاضی کے اس عادلانہ حکم کا علم ہوا کہ ہماری زمین ہمیں واپس ملے گی، میرا رخ شمال کی سمت ہو گیا، اُس سرخ اینٹ کی طرف جو میرے باپ کی لحد میں ان کے سر کے نیچے رکھی گئی تھی اور جو اَب شکستہ ہو کر بھربھرا گئی ہوگی۔ مرنے سے پہلے انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ جب تک ہماری زمین غیروں کے قبضے میں ہے، انھیں آرام نہیں ملے گا، اور قبر میں ان کے سر کے نیچے رکھی جانے والی اینٹ سخت اور سالم رہے گی اور انھیں ابدی نیند سے دور رکھے گی۔ یہ اینٹ اس وقت تک شکستہ نہیں ہوگی جب تک ہمیں

---

[1] ''عمدہ'' کا لفظ گاؤں یا دیہات کے کسی مجموعے کے مکھیا یا سربراہ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، لیکن اس کے انسلاکات میں وہ تمام معنی شامل ہیں جو مثلاً سندھ میں برتے جانے والے دو لفظوں ''وڈیرا'' اور ''رئیس'' میں مضمر ہیں۔ علاوہ ازیں ''عمدہ'' لفظ خود زبان کی سطح پر جس سماجی تعصب کی عکاسی کرتا ہے اس کا اظہار کرنے کے لیے اسے اردو ترجمے میں بھی (انگریزی ترجمے کی طرح) جوں کا توں رکھا گیا ہے۔ (ا۔ک۔)

Scanned with CamScanner

حقیقی خوشی نصیب نہیں ہو جاتی۔ اب ہماری زمین ہمیں واپس مل گئی ہے۔ خوشی کی اونچی آوازیں— مردوں کی بندوقوں کے دھماکے اور عورتوں کی مسرت بھری چیخیں — آدھی رات کے بعد تک گونجتی رہیں۔ رات کے آخری حصے میں مجھے خوشی کی زیادتی سے تھکن محسوس ہونے لگی اور پسلیوں میں، جن سے میرا دل زور زور سے دھڑکتے ہوئے ٹکرا رہا تھا، درد ہونے لگا۔ بستر پر جاتے وقت میں نے ہدایت کر دی کہ صبح مجھے نہ جگایا جائے۔ میں بیس برس بعد آخرکار جی بھر کر سونا چاہتا تھا۔ اگلی صبح مجھے کوئی کام بھی نہیں تھا، تو پھر کیوں نہ اس لذت بھری کسالت اور شیریں آرام کا پورا لطف اٹھایا جائے جو ہمیں پرانے دنوں میں حاصل تھا۔ یہ سب ابھی کل کا واقعہ ہے۔ وقت کتنی عجیب سرعت سے گزرتا ہے۔ آج صبح سویرے، مرغوں کے بانگ دینے سے بھی پہلے، مجھے کھانسی کا ایسا شدید دورہ پڑا کہ جب تک قے نہ ہوگئی آرام نہ آیا، اور اس کے بعد میں نیند میں واپس نہ جا سکا۔ کچھ عرصے سے میری عادت ہوگئی ہے کہ رات ہمیشہ اپنی سب سے چھوٹی بیوی کے کمرے میں گزارتا ہوں۔ کچھ لوگ کہیں گے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ 'نئی' ہے، اور ہر نئی شے کا خاص مزہ ہوتا ہے۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں؛ میری سب سے چھوٹی بیوی دراصل نئی نہیں ہے: اسے میرے ساتھ رہتے ہوئے بہت سال ہو چکے ہیں۔ ہر رات اس کے کمرے میں گزارنے کی اصل وجہ یہ ہے کہ مجھے اس کے ساتھ بہت آرام ملتا ہے، اس کا کمرہ مجھے سب سے زیادہ پسند ہے۔ کھانسی کے دورے کے بعد درد سے میرے سر اور کنپٹیوں میں دھمک ہونے لگی۔ آسمان صاف تھا اور ہوا ساکن۔ دو ستارے اب تک روشن تھے، شاید رات انھیں بھول گئی تھی۔ دریا کے اوپر آسمان پر مجھے تاروں کا ایک جھرمٹ دکھائی دیا، اور اس کے برابر میں دو جھنڈوں کے بانس ایک دوسرے سے گلے ملتے نظر آئے۔ ہوا میں نیلی روشنی پھیلی ہوئی تھی جو صبح کے دھندلے اجالے میں گھل رہی تھی۔ سورج نکلنے سے پہلے مجھے کوئی کام نہ تھا اور اس کے بعد مجھے دَوار (مردان خانے) میں جانا تھا۔ میں نے خادمہ کو آواز دے کر اس سے وضو کا پانی لانے کو کہا۔ وہ پانی کا جگ اور پیتل کی سلفچی لے آئی اور میرے ہاتھوں پر پانی ڈالنے لگی۔ جگ میں سے کچھ مٹی بہہ کر میرے ہاتھ پر گری، لیکن میں اس پر چیخا چلایا نہیں۔ میں نے ایک لفظ تک نہ کہا۔ میری بیوی میرے لیے چائے بنا کر لائی۔ میں طلائی کنارے والے پیالے کو اپنے ہونٹوں تک لے گیا اور چائے کا بڑا سا گھونٹ میری زبان پر دوڑ گیا۔ میں نے فوراً پیالے کو واپس تپائی پر رکھ دیا۔ چائے بالکل تلخ تھی۔ میری بیوی اس میں شکر ڈالنا بھول

گئی تھی۔ میں نے اپنے آپ سے کہا، اللہ ہمیں مصیبت سے بچائے۔ میں ڈر رہا تھا، کیونکہ کل رات میں نے خود کو انتہائی مسرت کے عالم میں محسوس کیا تھا۔ آخر کار میں ان کتے کے پلوں پر غالب آ گیا تھا۔ زمین ہمیں واپس مل گئی تھی اور بہت جلد ہم سے چھینی گئی ہر شے ہمارے پاس واپس آنے والی تھی۔

فجر کی نماز میں سورۂ فاتحہ اور التحیات پڑھتے ہوئے مجھ سے سہو ہوا۔ مجھے اپنی توجہ کو مرکوز رکھنے میں مشکل ہو رہی تھی۔ پھر میری بائیں آنکھ پھڑکنے لگی، اور مجھے یقین ہو گیا کہ کوئی بات پیش آنے والی ہے۔ میں نے نماز پوری کر کے سلام پھیرا اور اپنی بیوی سے پوچھا کہ آج کون سا دن ہے۔ معلوم ہوا کہ آج جمعہ نہیں ہے۔ مجھے کچھ سکون ہوا۔ کیونکہ جمعے کا دن اپنی نحس ساعت کے لیے معروف ہے۔

میری بیوی ناشتے کی سینی لے آئی۔ جونہی میں نے خوان پوش ہٹایا، تلے ہوئے انڈوں اور گرم دودھ کے گلاس سے بھاپ کا ایک مرغولہ اٹھا۔ میں نے ہر چیز پر نظر ڈالی — انڈے، فلافل، پنیر اور سبز سلاد — لیکن میری بھوک رخصت ہو چکی تھی۔ میں نے روٹی اٹھائی، اسے دو حصوں میں توڑا اور ایک لقمہ بنا کر کسی چیز میں ڈبویا۔ لیکن اس ایک لقمے کے بعد اور کچھ نہ کھا سکا۔ میں نے ہاتھ دھوئے اور چائے کے دو تین پیالے پیے۔ پھر اپنی بیوی سے کہا، ''الحمدللہ۔''

اس کی پلکوں میں عجیب سی حرکت پیدا ہوئی اور چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ ''کیا کھانے میں کچھ خرابی ہے؟''

''نہیں۔''

میں نے اسے بتایا کہ مجھے بھوک نہیں ہے، کیونکہ کل رات کے ہنگامے کے بعد میں رات کو ٹھیک سے سو نہیں سکا۔ لیکن اسے میری بات پر یقین نہ آیا۔ کہنے لگی کہ اسے صبح سویرے سے میرے بارے میں فکر ہو رہی ہے۔ میں اٹھا، خواب گاہ میں جا کر الماری میں سے دن کے کپڑے نکالنے لگا۔ وہ میرے بالکل پیچھے آ کھڑی ہوئی۔ میں نے اس کی چھاتیوں کا لمس اپنی پیٹھ پر محسوس کیا۔ لیکن اس سے مجھے ناگواری سی ہوئی۔ وہ مجھ سے یوں سٹ کر کھڑی تھی کہ مجھے اس کی چھاتیوں کی گولائی صاف معلوم ہو رہی تھی۔ لیکن اپنی حالت کا خیال کر کے میں چپ رہا۔ اس نے اپنا ہاتھ پھیلا کر سوال کیا: ''کیا آپ ناشتہ کیے بغیر چلے جائیں گے؟'' لیکن میں اپنے خیالوں میں گم تھا، میں نے اس کی بات کا کچھ جواب نہ دیا اور باہر نکل آیا۔ میں اس کے لیے خاص طور پر بنوائے ہوئے مکان سے باہر آیا اور پرانے مکان

کا دروازہ کھول کر اس میں داخل ہو گیا۔ سارے کمروں کے دروازے بند تھے اور برآمدے میں نیند کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ میں اپنی پہلی بیوی کے حجرے کے سامنے سے گزرا جو میرے بڑے بچوں کی ماں ہے اور جسے سب 'بڑی اماں' کہتے ہیں۔ اس کے سامنے میری دوسری بیوی کا کمرہ تھا، اور پھر بچوں کے کمرے تھے۔ میں ان سب کے پاس سے گزر کر طویلے میں پہنچا جہاں مویشی نیم غنودہ تھے؛ آنکھیں بند، جبڑے کاہلی سے آہستہ آہستہ جگالی کرتے ہوئے۔ ان کی چارے کی ناندیں خالی اور چاٹ چاٹ کر صاف کی ہوئی تھیں۔ البتہ کتا جاگ رہا تھا اور اس نے دم ہلا کر اور میری ٹانگوں سے لپٹ کر مجھے پہچاننے کا اظہار کیا۔ میں مویشیوں پر ایک نظر ڈال کر آگے ذخیرے کی کوٹھریوں کی طرف بڑھا۔ فصل کے غلے کی کوٹھری، کھاد کی کوٹھری، کیڑے مار دواؤں کی کوٹھری، زرعی آلات کی کوٹھری۔ سب کوٹھریوں کے دروازے ٹھیک طرح بند تھے۔ میں دوار میں چلا گیا۔ ابھی بہت سویرا تھا لیکن عادت کے برخلاف میری توانائی پر بظاہر کسی کو تعجب نہیں ہوا۔ بعض نے کہا، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمیں ہماری زمین واپس مل گئی ہے؛ صرف زمین ہی نہیں، ان کا کہنا تھا کہ ہمیں ہماری زندگی واپس مل گئی ہے۔ پھر میں بیٹھ کر سگریٹ پر سگریٹ پینے لگا۔ رات کے چوکیدار اپنی بندوقیں اور کارتوس جمع کرانے آئے۔ پھر دن کا چوکیدار آیا اور ہچکچاتا ہوا میری طرف بڑھا، وہ کسی بات سے خوفزدہ معلوم ہوتا تھا۔ جب اس نے رات میں وصول ہونے والے پیغامات کا دفتر مجھے تھمایا تو میں نے اسے ڈانٹا اور کہا کہ وہ مجھے یہ پیغام پڑھ کر سنائے جیسا کہ روز سنایا کرتا تھا۔ اس کے ہاتھ کانپنے لگے اور اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کچھ لفظ پڑھے۔ میں نے دفتر اس کے ہاتھ سے چھین لیا اور فوراً اس کے خوف کا سبب جان گیا: میرے سب سے چھوٹے بیٹے کو لازمی فوجی خدمت کے لیے طلب کیا گیا تھا۔ اب میرے سامنے سب کچھ صاف ہو گیا۔ دن یا تو دودھ کی طرح سفید ہوتا ہے یا تنور کے دھوئیں کی طرح سیاہ۔ میں پیٹھ ٹکا کر بیٹھ گیا۔ اونچی آواز میں اپنے باپ کے لیے مغفرت کی دعا کی۔ وہ ہمیشہ خیر سے خوف کھایا کرتے تھے۔ مجھے ان کی بات آج تک یاد ہے۔ ''اگر زندگی تم پر مہربان دکھائی دے اور تمھارے داہنے ہاتھ میں کوئی بڑی نعمت آ جائے، تو تمھارا بایاں ہاتھ ضرور خالی ہو چکا ہوگا۔ جانتے ہو کیوں؟ اس لیے کہ زندگی اگر داہنے ہاتھ میں کچھ دیتی ہے تو بائیں ہاتھ سے کچھ واپس بھی لے لیتی ہے۔'' اب مجھے احساس ہوا کہ میرے باپ کو بہت سی ایسی چیزوں کا علم تھا جن سے میں بے خبر تھا۔ چوکیدار اب تک

Scanned with CamScanner

میرے سامنے کھڑا تھا اور پیغامات کا دفتر اب تک میرے ہاتھ میں تھا۔ مجھے اعتراف ہے، اس وقت میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کروں۔ میں ماضی کے دنوں کو حسرت سے یاد کرنے لگا جب میرے باپ کوئی بھی ناممکن کام کر لیا کرتے تھے۔ اور میں بھی، جوانی کے دنوں میں، سب کچھ کرنے پر قادر تھا۔ مجھے اپنا سر درد واپس آتا محسوس ہوا اور میرے خیالات لہروں کی طرح حرکت کرنے اور مجھے اپنے ساتھ دور افق تک لے جانے اور واپس صحن کی اس بنچ تک واپس لانے لگے جہاں میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے چوکیدار کو بھیج دیا لیکن پیغام اب تک میرے ہاتھ میں تھا اور دنیا بالکل مجھے اپنے چہرے کے مقابل معلوم ہو رہی تھی۔ اگر میرے باپ کو ایسی کسی صورت حال سے سابقہ پڑتا تو وہ ہنس دیتے اور ان کی سبز آنکھیں ربیع کی فصل کی طرح چمکنے لگتیں۔ پھر وہ مسکرا کر کہتے کہ ابوزید[۲] اپنی ہر مشکل سے نمٹنے کی تدبیر جانتا ہے۔ لیکن مجھے اس وقت ایک بھی تدبیر نہیں سوجھ رہی تھی۔ منشی ٹیلیفون کے کمرے سے نکل کر آیا اور مجھے اتنے سویرے وہاں بیٹھے دیکھ کر، اور سگریٹ کے دھوئیں سے گھرے میرے مایوس چہرے پر نگاہ ڈال کر حیرت زدہ رہ گیا۔ اس نے مجھے غور سے دیکھا، استغفار پڑھی اور پھر مجھ سے پوچھا کہ کیا بات ہے۔ جواب دینے کو میرا جی نہ چاہا۔ لوگوں نے اسے بتا دیا کہ کیا ہوا ہے۔

اس نے اس پیغام کی طرف دیکھا جو اب تک میرے ہاتھ میں تھا اور مسکرایا۔ مجھے اس کے مسکرانے پر غصہ آیا۔ تب وہ بولا کہ یہ معمولی سی بات ہے اور اس قابل نہیں کہ اس پر زیادہ فکر مند ہوا جائے۔ اس نے میرے قریب آ کر سرگوشی میں صرف ایک لفظ کہا: ''دلال۔'' اس کی بات میری سمجھ میں نہ آئی تو اس نے وضاحت کی کہ دلال وہ شخص ہے جو کسی بھی بڑی سے بڑی مشکل کا حل ڈھونڈ سکتا ہے۔ تب مجھے وہ آدمی یاد آیا جسے علاقے کے سب لوگ معبد یا دلال ہی کہہ کر پکارتے تھے اور کسی کو بھی اس کا اصل نام یاد نہ تھا۔ وہ ہر قسم کے کام کر لیتا تھا اور اس سے کچھ بھی طلب کیا جا سکتا تھا۔ وہ شروع میں پرائمری اسکول میں استاد تھا، لیکن پھر اسے رشوت یا شاید جعلسازی کے الزام میں، مجھے ٹھیک سے یاد نہیں، سزا ہو گئی تھی۔ اس کا مقدمہ قصبے کی نچلی عدالت میں پیش ہونا تھا، لیکن عدالتی نظام اس قدر سست رفتار ہے کہ جو کام ایک دن میں ہو سکتا ہے، اسے کرنے میں عدالتوں کو سال بھر لگ جاتا

[۲] ابوزید قبیلہ بنوہلال سے متعلق ایک لوک داستان کا کردار ہے جو کسی بھی جال یا دشوار صورت حال سے نکلنے کی تدبیر ڈھونڈ لینے کی صلاحیت کے لیے معروف ہے۔

Scanned with CamScanner

ہے۔ چنانچہ مقدمہ کئی برس چلتا رہا، پہلے نچلی عدالت میں، پھر ضلعی عدالت میں، اور آخر کار قاہرہ کی عدالت عالیہ میں، جس نے اسے مجرم قرار دیا۔ اس نے اپیل کی، لیکن اپیل مسترد ہو گئی۔ اس کی اسکول کی ملازمت جاتی رہی، لیکن اس نے دلال کے طور پر کام کرنا جاری رکھا۔ میں باتوں باتوں میں کہاں سے کہاں نکل گیا۔ عجیب بات ہے، جب کوئی قصہ سنانا شروع کرو تو لفظ امام مسجد کی تسبیح کے دانوں کی طرح ایک کے پیچھے ایک پھسلتے چلے آتے ہیں، اور کسی مقام پر رکنا یا پیچھے جا کر کسی نکتے کی وضاحت کرنا ممکن نہیں رہتا۔ جس وقت منشی دلال کے بارے میں بتا رہا تھا کہ وہ ہر طرح کی مشکل کو حل کر سکتا ہے، میں متردد تھا۔ ایک طرف میں چاہتا تھا کہ میرا بیٹا فوج میں جائے اور تربیت حاصل کرے۔ آخر وہ کب تک لاڈلا بنا رہے گا! میں تمام عمر تو اس کی دیکھ بھال کرنے کے لیے بیٹھا نہیں رہوں گا؛ ایک نہ ایک دن تو اسے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا ہی ہوگا۔ لیکن دوسری طرف اس سے دن بھر کی جدائی کا خیال بھی میری برداشت سے باہر تھا۔ وہ میری سب سے چھوٹی اولاد تھا، اور اس کی پیدائش کے بعد میں بیمار پڑ گیا تھا۔ علاج کے سلسلے میں میں نے شہر شہر کی خاک چھانی لیکن کوئی طبیب یا کسی کی دوا میرے لیے شفا بخش ثابت نہ ہوئی۔ میری حالت بگڑتی ہی گئی۔ مجھے احساس ہوا کہ انسان کے لیے بیماری سے بڑھ کر کوئی ابتلا نہیں، اور اچھی صحت قارون کے خزانوں کے برابر ہے۔ آخر میرے غدۂ قدامیہ کو کاٹ کر الگ کر دیا گیا۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ یہی واحد علاج ہے: اس کے سوا وہ ہر تدبیر آزما چکے تھے۔ آپریشن سے پہلے مجھے ایک فارم پر رضامندی کے دستخط کرنے تھے۔ کاغذ کے نچلے حصے پر دستخط کرتے ہوئے میں نے عہد کیا کہ کسی کو اس بات کا علم نہ ہونے دوں گا؛ اس راز کو پوری طرح محفوظ رکھوں گا۔ میرے اس آپریشن کا نتیجہ مردانگی سے محرومی تھا، اور اگر گاؤں والوں کو اس بات کا پتا چل جاتا تو وہ کہہ سکتے تھے کہ اب میں گاؤں کے عمدہ کے عہدے کا اہل نہیں رہا، کیونکہ عمدہ کے لیے مکمل مرد ہونا ضروری ہے۔ میں نے خود کو سمجھایا کہ میری پہلے سے بہت سی اولادیں ہیں، لیکن اس کے باوجود گھر لوٹنے پر میری دل گرفتگی بڑھتی گئی اور اپنے سب سے چھوٹے بیٹے سے میرا لگاؤ بھی بڑھتا گیا۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ اس سے میری محبت کی وجہ یہ ہے کہ اس کی ماں میری سب سے چھوٹی بیوی ہے، جو میری بڑی اولادوں کی ہم عمر ہے۔ لیکن اصل سبب کی کسی کو خبر نہ تھی۔ اسپتال سے لوٹنے کے بعد میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ تینوں بیویوں میں سے کس کے پاس رہوں۔ میں نے تینوں سے اپنے

Scanned with CamScanner

تعلق کا جائزہ لیا۔ بڑی بیوی کے لیے میرا وجود نا قابل برداشت تھا۔ دوسری بیوی اس لیے چراغ پا تھی کہ میں نے اس کے بعد ایک اور شادی کر لی تھی۔ چنانچہ صرف تیسری بیوی باقی رہ گئی۔ میں نے خود کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ تینوں کو علم ہونے سے بہتر ہے کہ صرف ایک بیوی کو میری حالت کا پتا چلے۔ اس وقت سے میری زندگی بدل کر رہ گئی۔ میری نیند کم ہو گئی۔ رات میں کئی بار میری آنکھ کھلنے لگی۔ نیند کی نعمت سے محروم ہونے کے بعد رات مجھے کسی کابوس جیسی معلوم ہونے لگی۔ میں نے ریڈیو اپنے سرہانے رکھ لیا اور جب اس کے پروگرام ختم ہو جاتے تو مجھے بہت غصہ آتا، کیونکہ ابھی رات کا بڑا حصہ باقی ہوتا، جو مجھے تنہا گزارنا ہوتا تھا۔ میں پرانے دنوں کو حسرت سے یاد کیا کرتا، جب راتیں میری نیند کے مقابلے میں بہت چھوٹی ہوتی تھیں۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا، مجھے اپنی چھوٹی بیوی سے، اس کے شباب اور تازگی اور کم سنی سے، خوف محسوس ہونے لگا۔ اس سے دور رہنے کا میرے پاس کوئی بہانہ نہ تھا۔ میں اسے اس بڑے مکان میں تنہا نہیں چھوڑ سکتا تھا، سو میں اللہ سے مدد مانگتا اور اس کے کمرے میں اس عذاب کو جھیلتا جسے رات کا نام دیا جاتا ہے۔ میں خود سے سوال کرتا: آخر انسان کو یہ عذاب کیوں برداشت کرنا پڑتا ہے؟ اس سست رو موت کے بدلے اچانک اور فوری موت کیوں نہیں آ جاتی؟ لیکن خیر، مجھے اپنے بیٹے کی کہانی کی طرف لوٹنا چاہیے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بتایا، اس سے ذرا دیر کی جدائی بھی مجھے شاق تھی۔ لیکن اسے اپنے پاس رکھنے کا میرے پاس ایک اور اچھا جواز بھی تھا: اس کے کسی بھی بھائی نے لازمی فوجی خدمت انجام نہیں دی تھی۔ میرے سب سے بڑے بیٹے کو اس قانون کے تحت استثنیٰ مل گیا تھا جس کی رو سے کسی گاؤں کے عمدہ کا بڑا بیٹا مستثنیٰ قرار پاتا تھا۔ دوسرے کو اس لیے کہ وہ حافظِ قرآن تھا، اس کے سینے میں کلامِ رب محفوظ تھا اور اسے فقیہ کہا جاتا تھا۔ تیسرے کو طلبی سے بچانے کے لیے میں نے پورے بیس پاؤنڈ خرچ کیے تھے ــــ اور اُن دنوں پاؤنڈ بڑی قیمت رکھتا تھا۔ ان برے دنوں میں مجھے بیس پاؤنڈ خرچ کرنے پڑے تھے۔ رہا میرا چوتھا بیٹا تو اس کی ماں گاؤں کی سب سے حسین عورت تھی... آہ! اچھے دن اب گزر چکے ہیں، اور ان کے ساتھ بہت سی حسین چیزیں بھی۔ کیا وہ دن پھر لوٹیں گے؟ مجھے یقین ہے ضرور لوٹیں گے: ان دنوں کے اچھے شگون بھی یہی بتاتے ہیں۔ میں نے اپنے اس چوتھے بیٹے کی ماں کو طلاق دے دی، سچ مچ نہیں، صرف کاغذی طلاق۔ چنانچہ وہ بیٹا مطلقہ عورت کے تنہا سہارے کے طور پر فوجی خدمت سے مستثنیٰ قرار پایا۔

Scanned with CamScanner

یہاں مجھے رک کر ایک بات واضح کر دینی چاہیے۔ میں ان سب باتوں پر اپنے آپ سے بالکل شرمندہ نہیں ہوں۔ بلکہ ہمیں اس موضوع پر باضابطہ بات چیت کر لینی چاہیے، تا کہ آپ میرے اصل احساسات کو جان سکیں۔ میں جانتا ہوں آپ کو اس بات پر غصہ آئے گا۔ آپ کہیں گے، یہ کیسا مصری ہے کہ اسے اپنے بیٹوں کو وطن کے دفاع سے دور رکھنے میں کوئی طریقہ اختیار کرنے سے عار نہیں؟ لام بندی کے قانون میں جو بھی ترمیم کی جاتی ہے، یہ اسے اپنے مقصد کے لیے استعمال کر لیتا ہے۔ اور آپ یہ بھی کہیں گے، کیا ہم سب مصر کے بیٹے نہیں؟ کیا یہ ہمارا وطن نہیں جس کی حفاظت ہمیں دل و جان سے کرنی چاہیے؟ اس کے علاوہ، گاؤں کے عمدہ کے طور پر میری ذمے داری ہے کہ گاؤں کا ہر جوان شخص لازمی فوجی خدمت انجام دے۔ تو پھر میں اپنے بیٹوں کو طلبی سے کیونکر بچا سکتا ہوں؟ اگر گاؤں والوں کو پتا چل جائے تو وہ کیا کہیں گے؟ میں آپ کے احساسات کو سمجھتا ہوں، اور آپ کے سوالات جس نتیجے کی طرف اشارہ کرتے ہیں اس سے بھی واقف ہوں: کہ میں نے اپنے بیٹوں کو اس زمانے میں فوجی خدمت سے دور رکھا جب مصر کو تین سنگین جنگوں کا سامنا کرنا پڑا تھا جو اس کی تقدیر پر اثر انداز ہونے والی تھیں۔ لیکن ان سوالوں کا سامنا کرتے ہوئے، میں آپ کو اپنی صورت حال سمجھانے کی کوشش کروں گا۔ میرا خیال ہے آپ کو میرے حالات کا پوری طرح علم نہیں ہے۔ سب سے پہلے میں کہوں گا کہ مجھے اپنے وطن مصر سے محبت ہے، اور وادیِ نیل کی پرستش میرے خون میں شامل ہے۔ اور یہ پرستش مجھے اپنے آباواجداد سے ورثے میں ملی ہے۔ اس محبت کی جڑیں تاریخ میں گہری اتری ہوئی ہیں اور یہ اس زبانی کلامی حب الوطنی سے کہیں زیادہ حقیقی ہے جو آج کل کی نسل کا شعار ہے۔ میرے جدِاعلیٰ احمد پاشا عرابی[۳] کی فوج کے ایک گمنام سپاہی تھے، جنھوں نے مصر کے وقار کو بچانے کے لیے جنگ میں حصہ لیا تھا۔ یہ میری مصر سے محبت کی سب سے بڑی دلیل اور وطن سے وفاداری کی سب سے واضح شہادت ہے۔ لیکن میں نے کبھی اپنے خاندان کے ان بزرگ کا ذکر نہیں کیا جنھوں نے عرابی کی جدوجہد آزادی میں شہادت پائی تھی۔ میں نے اس راز کو اپنے تک ہی محدود رکھا ہے اور آج پہلی بار اس کا ذکر کر رہا ہوں۔ آپ بلاشبہ جانتے ہیں کہ میں گاؤں کا عمدہ ہوں۔ میرے

[۳] احمد پاشا عرابی ایک مصری کرنل تھے جو کسانوں کے خاندان میں پیدا ہوئے اور جنھوں نے ۱۸۸۲ء میں مصر پر انگریزی اور فرانسیسی تسلط اور ترک جرکسی مملوکوں کی حکمرانی کے خلاف مسلح جدوجہد کی قیادت کی۔

باپ کہا کرتے تھے: اگر ہمارے خاندان میں سے کوئی جنگ پر گیا تو ہمارا شجرۂ نسب مرجھا کر زمین کی طرف ڈھلکنے لگے گا اور پھر یہ خاندان اپنے اُس ابتدائی دور سے اپنا سلسلہ نہیں جوڑ سکے گا جب مصر میں مملوکوں اور ترکوں کی حکومت تھی۔ تو اب آپ کو پتا چلا کہ مجھے اس شجرۂ نسب کو خطرے میں ڈالنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ ذاتی طور پر مجھے اپنے بیٹوں کو فوج میں بھیجنے پر بہت خوشی ہوتی؛ مسلح افواج میں خدمت انجام دینا تو ایک بڑا اعزاز ہے۔ لیکن میری پہلی خطا نے سارا معاملہ بگاڑ دیا جب میں نے اپنے سب سے بڑے بیٹے کو فوجی خدمت سے استثنیٰ دلوایا۔ اس کے بعد سے ہر بیٹا اپنا موازنہ اپنے بڑے بھائی سے کرتا ہے، اور جب میری ان سے اس بات پر تکرار ہوتی ہے تو ان کا تلوار کی دھار جیسا تیز جواب یہی ہوتا ہے کہ ''اور کسی بھائی نے بھی تو فوجی خدمت انجام نہیں دی۔'' میں ان سے کہتا ہوں کہ اب زمانہ بدل گیا ہے اور ہمیں بھی وقت کے ساتھ تبدیل ہونا ہوگا۔ میں اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کو فوج میں ضرور بھیجنا چاہتا تھا۔ لیکن بالفرض اس کی ماں اپنا موازنہ میری دوسری بیویوں سے کرے اور اپنے ساتھ بھی انھی جیسے سلوک کا مطالبہ کرے؟ کیا ہو اگر وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہے: ''کیا یہ کافی نہیں کہ مجھے تمھارا عیب جھیلنا پڑ رہا ہے؟'' صرف وہی میرے راز سے واقف ہے، میری تینوں بیویوں میں سے وہی سب سے زیادہ قابلِ اعتبار تھی اور اسپتال سے لوٹ کر میں اسی کے بستر پر سوتا آ رہا ہوں۔ لیکن اگر اس کے بیٹے کو فوج میں بھیج دیا گیا تو شاید یہ راز راز نہ رہ سکے اور پورے گاؤں کو معلوم ہو جائے۔ ہم اس ماں کے احساسات کا کیونکر تصور کر سکتے ہیں جس کے اکلوتے بیٹے کو آگ میں جھونک دیا جائے؟ آج کل کی فوج اور ہمارے زمانے کی فوج میں بہت فرق ہے۔ اب فوج کے سپاہیوں کو حقیقی جنگیں لڑنی پڑتی ہیں، اصلی حرب وضرب اور قتال سے دوچار ہونا ہوتا ہے، اور اللہ ہی جانتا ہے کہ یہ سلسلہ کب ختم ہوگا۔ چنانچہ مجھے کچھ نہ کچھ کرنا ہی تھا، میرے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا— کون ہے جو اپنے بیٹے کو مرنے کے لیے بھیج سکے؟ اس لیے میرا دلال سے ملنا نہایت ضروری تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور بات بھی تھی: میری سب سے چھوٹی بیوی برسوں سے اپنے بیٹے کے لیے ایک بھائی کی آرزومند تھی۔ میں نہیں جانتا کہ وہ دوبارہ کیوں حاملہ نہیں ہوئی؛ دیہات میں یہ سب باتیں عورتوں تک محدود رہتی ہیں اور مرد ان کا ذکر نہیں کیا کرتے۔ لیکن جب میں نے اسے اپنے آپریشن کے بارے میں بتایا تو وہ رونے لگی اور بولی کہ کاش اسے اس بات کا پہلے سے علم ہو جاتا اور وہ اپنے بیٹے کو

Scanned with CamScanner

زندگی بھر کے اکلوتے پن کے عذاب سے بچا سکتی۔ میں نے اسے یہ کہہ کر تسلی دینے کی کوشش کی کہ اس کے بھائیوں کی پوری پلٹن موجود ہے، لیکن اس نے کہا کہ وہ سب سوتیلے بھائی ہیں۔ یوں میں اس مصیبت میں پھنس گیا۔ لیکن ایک بات مجھے اچھی طرح معلوم تھی: چاہے کچھ بھی ہو جائے، میرا سب سے چھوٹا بیٹا میری نظروں سے ہرگز دور نہیں ہوگا۔ میں نے جا کر دلال سے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے یہ سوچ کر کچھ اطمینان محسوس کیا کہ میری مشکل جلد ہی حل ہو جائے گی۔ میں دلال کو اس کا منھ مانگا معاوضہ دوں گا اور اس کی کوششوں کو تقویت دینے کے لیے اپنے تعلقات، دوستوں، رشتے داروں، اور سب سے بڑھ کر اپنے پیسے کو استعمال کروں گا۔ ہم سب آج کل کے شعار سے واقف ہیں: اگر آپ کی جیب میں ایک پیسہ ہے تو آپ کی قدر ایک پینیے کے برابر ہے۔ اور میرے پاس، الحمدللہ، لاکھوں ہیں۔ اور جب تک پیسے کو رب سمجھا جاتا ہے، جیسا کہ آج کل دستور ہے، اس وقت تک مجھے کوئی اندیشہ نہیں۔ بہت جلد اس ملک میں ڈاکٹر لوگوں کا آپریشن کر کے ان کے دل کی جگہ پاؤنڈ کا سکہ رکھنے لگیں گے، تاکہ خون کے سرخ اور سفید خلیوں کے بدلے سنہری سکے رگوں میں گردش کریں۔ جب وہ وقت آیا تو ہمیں ہمارا جاہ و حشم اور رعب داب واپس مل جائے گا اور ہم ایک بار پھر مصر کے حکمران ہوں گے۔ میں کچھ دیر آرام کر کے اٹھ کھڑا ہوا اور گھر کے اندر گیا جہاں میرا سب سے چھوٹا بیٹا اب تک سو رہا تھا۔ اسے دیکھ کر میرا خون کھول اٹھا — ظہر کی اذان کے وقت تک صاحبزادے پڑے سو رہے ہیں! میں نے خود سے کہا، واللہ، اسے راہ پر لانے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اسے فوج میں بھیج دیا جائے۔ لیکن حالات جب ایسے دشوار ہوں تو انسان کیا کرے! میں نے اپنی بیوی سے سفر کا لباس نکالنے کو کہا۔ گاؤں میں تو میں بھی سب کی طرح جلابیہ ہی پہنتا ہوں، اگرچہ میرا جلابیہ درآمد شدہ قیمتی کپڑے کا ہوتا ہے جو آج کل پورے صوبے میں نایاب ہے، لیکن سفر پر جاتے وقت — یعنی گاؤں سے باہر نکلتے وقت — میں سوٹ پہنتا اور تازہ ترین ماڈل کا سیاہ چشمہ لگاتا ہوں، کولون کی خوشبو چھڑکتا ہوں اور کسی بھی بڑی سے بڑی تنخواہ اور اونچے سے اونچے عہدے والے آفندی سے کہیں بڑھ کر دکھائی دیتا ہوں۔ میں نے اپنی بیوی کو بتایا کہ میں ضلعی صدر مقام جا رہا ہوں۔ اُس کے سوا میرے گھر میں کوئی اور میرے آنے جانے کے بارے میں سوال کرنے کی مجال نہیں رکھتا۔ صرف اسی کو میں نے یہ امتیاز بخش رکھا ہے۔ لیکن اس نے میرے وہاں جانے کا سبب نہیں پوچھا۔ میں اسے بتانا چاہتا تھا،

Scanned with CamScanner

تا کہ اسے میری اہمیت اور رسوخ کا اندازہ ہو سکے، مگر مجھے ڈر ہوا کہ بات پھیل جائے گی اور اس میں اَور باتیں، اَور تفصیلات بھی جوڑ دی جائیں گی۔ میرے باپ نے مجھے سکھایا تھا کہ اگر کوئی بات دو سے زیادہ افراد کو معلوم ہو جائے تو پھر اس کا چھپا رہنا دشوار ہوتا ہے۔ ہم اعلیٰ طبقے کے لوگ ہیں، اونچے خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں، اور لوگ ہم سے حسد کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے رازداری برتنی پڑتی ہے۔ لیکن ایک روز میری بیوی میرے کیے ہوئے کام کو جان جائے گی اور تب وہ مجھے پہاڑ سے زیادہ اونچا اور شیر سے زیادہ قوی سمجھے گی۔ میں نے کرائے کی خاص کار طلب کی اور دروازے کے پاس اس کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں کار آ پہنچی۔ میں پچھلی سیٹ پر بیٹھا۔ ٹیلیفون کے کمرے کے منشی نے کار کا دروازہ بند کیا اور خود آگے کی سیٹ پر ڈرائیور کے برابر بیٹھ گیا۔ اس نے سامنے لگے ہوئے آئینے میں میرا فکرمند چہرہ دیکھا اور مسکرایا۔ وہ راستے بھر میرا حوصلہ بڑھاتا رہا، کہتا رہا کہ یہ معمولی سی مشکل ہے جو آسانی سے حل ہو جائے گی۔ میں نے اس کی باتوں کا کوئی جواب نہ دیا۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ سفر کے دوران میں خوش تھا، لیکن غمگین بھی نہ تھا۔ گاؤں کے کئی لوگوں نے مجھے گزرتے ہوئے دیکھا اور مجھے سلام کرنے کے لیے کار کو اشارے سے ٹھہرایا۔ ان میں سے ایک نے خیال ظاہر کیا کہ میں حکومت کے اعلیٰ اہلکاروں کا شکریہ ادا کرنے قاہرہ جا رہا ہوں کیونکہ میری زمینیں مجھے واپس مل گئی ہیں۔ میں نے اس کی بات کی تردید یا تائید میں کچھ نہ کہا۔ میرے خیال میں یہی طریقہ سب سے بہتر تھا — اس طرح لوگ میرے سفر کا اصل سبب نہیں جان سکیں گے۔ راستے میں کار زمین کے ان قطعوں کے پاس سے گزری جو لوٹائی جانے والی زمین میں شامل تھے، اور انھیں دیکھ کر گزرے ہوئے کل کے واقعات میرے ذہن میں تازہ ہو گئے۔ مجھے دوبارہ اپنے باپ کا خیال آیا۔ مرنے سے پہلے انھوں نے مجھ سے کہا تھا، ''ہمارا حق ایک نہ ایک دن بحال ہو کر رہے گا۔'' میں نے انھیں جواب دیا تھا، ''غیب کا علم صرف اللہ کو ہے۔'' یہ ایک تلخ کہانی ہے، لیکن اب جبکہ وہ دن گزر چکے ہیں، آپ کو گریز کے طور پر یہ کہانی سنانے میں کوئی حرج نہیں۔ یہ فوجی انقلاب کے دو سال بعد کی بات ہے۔ میرے باپ نے اپنی زمین ہم سب بہن بھائیوں میں بانٹ دی تھی۔ زمین کا ایک قطعہ ایسا تھا جو ہم نے انھی دنوں خریدا تھا، لیکن اس کی رجسٹری کا طویل عمل ابھی مکمل نہیں ہوا تھا، اس لیے اس کا بٹوارا نہیں ہو سکا تھا۔

ایک صبح انقلابی حکومت کی طرف سے کچھ اہلکار ہمارے گاؤں میں پہنچے جن کی قیادت فوجی ہیڈکوارٹر کا ایک افسر کر رہا تھا۔ انھوں نے کہا کہ ان کے پاس کچھ ایسی دستاویزات ہیں جن سے میرے باپ کا ترکی الاصل ہونا ثابت ہوتا ہے، اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے مصری شہریت حاصل کرنے کے لیے جو طریقے اختیار کیے تھے وہ قانون سے پوری طرح مطابقت نہ رکھتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے وہ زمین ضبط کر لی جو اب تک ان کے نام پر تھی۔ چونکہ ہماری ماں اور ان کے والدین مصری تھے اور ہم سب بھائی بہن یہیں پیدا ہوے تھے، اس لیے انھوں نے ہماری پوری زمینیں ضبط نہیں کیں، البتہ ان پر زرعی اصلاحات کے قانون کا اطلاق ہوا اور مقررہ حد سے زائد زمین حکومت نے اپنے قبضے میں لے لی۔ میری بہنوں کی زمینیں نہیں لی گئیں، اور میرے چھوٹے بھائیوں پر بھی اس قانون کا اطلاق نہیں ہوا، لیکن میرا معاملہ مختلف تھا۔ میرے نام پر بہت سی زمینیں تھیں کیونکہ میرے باپ نے بٹوارے کے وقت مجھے میرے بھائیوں پر ترجیح دی تھی۔ پھر کچھ زمین میری پہلی بیوی کی ملکیت میں تھی جو اس نے شادی کے بعد میرے نام کر دی تھی اور یہ بھی سرکاری طور پر میری ملکیت ہو گئی تھی۔ قانون میں مقرر کردہ حد سے زائد میری ساری زمینیں ضبط کر لی گئیں۔ میرے پاس صرف دو سو فدان[1] زمین رہ گئی۔ زمین کی ملکیت چھین لیے جانے کا صدمہ میرے باپ کی برداشت سے باہر تھا۔ ان پر فالج کا حملہ ہوا اور ان کا پورا داہنا پہلو شل ہو کر رہ گیا۔ وہ اپنے داہنے بازو، داہنی ٹانگ، یہاں تک کہ اپنے منھ کے داہنے حصے کو بھی حرکت دینے کے قابل نہ رہے۔ وہ بڑے ہولناک دن تھے۔ وہ لوگ جنھیں اب تک بھرا ہوا پیٹ صرف خواب میں دکھائی دیتا تھا، ہم سے گستاخی سے پیش آنے لگے۔ اس سے چند دن پہلے تک گاؤں کے کسی شخص کی مجال نہ تھی کہ میرے باپ کے سامنے سے گزرتے ہوے اپنے گدھے سے اتر نہ پڑے۔ وہ دن رخصت ہوے جب میرے باپ جس کسی پر خفا ہوتے اسے لے جا کر کافور کے اس پیڑ سے باندھ دیا کرتے تھے جو ہمارے آنگن میں اب تک کھڑا ہے۔ زمانہ ہر چیز کو خاک میں ملا دیتا ہے۔ جس دن ہماری زمین فوجیوں کے قبضے میں گئی، اس دن سے کھیت مزدور اور دوسرے ملازم ہم سے اور ہی طرح پیش آنے لگے۔ لوگ مشتمانہ اطمینان کے ساتھ کھلم کھلا کہنے لگے کہ انھیں میرے باپ کی بیماری سے بہت خوشی ہے؛ بعض اوقات یہ باتیں

---

[1] فدان زمین کی پیمائش کی اکائی ہے جو رقبے میں کم و بیش ایک ایکڑ کے برابر ہوتی ہے۔

میرے منھ پر بھی کی جاتیں۔ مستقبل تاریک دکھائی دیتا تھا۔ مجھے خوف ہوتا تھا کہ اپنی زمینیں واپس لیے بغیر ہی مرجاؤں گا؛ جس کا مطلب یہ تھا کہ مرنے سے پہلے ان اصولوں پر میرا ایمان بحال نہیں ہو پائے گا جن میں سب سے بڑا اصول یہ تھا کہ دنیا میں حق کی فتح ہوتی ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ نہیں چاہتا کہ میں ناقص ایمان کے ساتھ اس کے حضور میں پیش ہوں۔ اچانک، اور بالکل توقع کے برخلاف، صبح کا نور پھیل گیا۔ ہماری زمینیں اب حکومت کے قبضے سے آزاد تھیں اور ان میں سے کچھ ہمیں لوٹا بھی دی گئیں۔ پھر میں نے یہ ثابت کرنے کے لیے مقدمہ دائر کیا کہ میرے باپ کی رگوں میں دوڑنے والا خون خالص مصری تھا اور غیرملکی خون کبھی ہمارے خاندان کے کسی فرد کی رگوں میں نہیں دوڑا۔ ہمارے جدِاعلیٰ نے خوفو کے ہرم کی تعمیر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ یہ بات ایک سال پہلے ہماری زمینوں میں شامل ایک کھیت کی کھدائی سے تاریخی اور سائنسی طور پر ثابت ہوگئی تھی۔ پھر کل وہ فیصلہ آیا جس کی رو سے ہماری زمینیں ہمیں واپس ملنے والی ہیں۔ میں اس حکم کے اس قدر جلد صادر ہونے پر متعجب تھا کیونکہ مصر کی عدالتیں اپنی سست روی کے لیے معروف ہیں۔ لیکن شاید ہم جیسے مظلوموں کے معاملات کو جلد سے جلد نمٹانے کے لیے انھیں خاص ہدایتیں جاری کی گئی تھیں۔ جس وقت مجھے یہ خبر ملی، میرے منھ سے نکلا، ''جو کچھ لوٹایا گیا ہے وہ اتنا اہم نہیں۔ اصل اہمیت اس کی ہے جو آگے چل کر ہمیں واپس ملے گا۔'' میری پچھلی توانائی لوٹ آئی۔ میرا جوش و خروش جو مظالم کے بوجھ تلے دب گیا تھا، پھر پہلے کی طرح پھوٹ نکلا اور گزرے دنوں کی مسرت مجھے ایک بار پھر محسوس ہونے لگی۔ میں نے اگلے پارلیمانی انتخابات میں امیدوار بننے کا فیصلہ کرلیا۔ عرب اشتراکی پارٹی کے لونڈوں کا ہمیشہ کے لیے صفایا کرنا بہت ضروری ہے۔ اگر انھوں نے مجھے اپنی پارٹی کا سیکرٹری جنرل بنانے کی بھی پیشکش کی تو میں اسے ٹھکرا دوں گا۔ اب یا تو وہ رہیں گے یا میں۔ انھیں بس پچھلے سولہ برس کے عرصے پر ہی صبر کرنا ہوگا جب وہ معاملات کو اپنی مرضی سے چلایا کیے، اور تقریروں اور تالیوں کے مزے لوٹتے رہے۔ اب ایک بار پھر اعلیٰ خاندانی لوگوں کی مرضی چلے گی، اور کیا عجب کہ میرے کسی بیٹے کو کوئی اونچا عہدہ مل جائے۔ میرے باپ کہا کرتے تھے کہ مصر کی سرزمین میں دو طرح کے لوگ بستے ہیں: اعلیٰ خاندانوں کے بچے، اور کتوں کے پلّے۔ دیہات میں اونچے لوگ وہ ہیں جن کے پاس سو فدان سے زیادہ زمین ہے، اور جن کے پاس کوئی زمین نہیں وہ دوسرے طبقے میں ہیں۔ ان دو

انتہاؤں کے درمیان مراتب کا پورا سلسلہ ہے جس میں کھیت مزدور، بٹائی پر کھیتی کرنے والے اور بے روزگار، ہر طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ میں آپ کو یہ سب اس لیے بتا رہا ہوں کہ آپ جان سکیں کہ کل رات میں کس قدر خوش تھا۔ تب آپ کو میری بات کا یقین آسکے گا کہ رات میری پلک سے پلک نہیں لگی۔ اب جو حالات ہیں ان میں میرے بیٹے کو فوجی خدمت کے لیے طلب نہیں کیا جائے گا۔ اگر آپ سن پچاس کے عشرے کے ابتدائی برسوں میں مصر میں رہے ہوتے تب آپ کی سمجھ میں آتا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں: اس وقت آپ کو اس کی سنگینی کا اندازہ ہوتا اور آپ میرے افعال سے درگزر کرنے کے ایک ہزار سبب تلاش کر لیتے۔ دوسری طرف اگر آپ ان میں سے ہیں جنھوں نے اُس عجیب وغریب دور کی زبان کو اپنی ماں کے دودھ کے ساتھ پیا ہے، تو پھر آپ کی طرف سے میری بات' سمجھنے یا میرے طرزِ عمل کا جواز تلاش کرنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ لیکن میں نے اپنی ساری امیدیں آنے والے دنوں سے لگا رکھی ہیں۔ وہ دن آپ پر ہر چیز کو بخوبی واضح کر دیں گے۔ ہماری نسل ہی بدقسمت ہے۔ فوجی انقلاب نے محض ہماری زمین، شان وشوکت اور اقتدار ہی کو نہیں چھینا، بلکہ سولہ برس کا عرصہ ہماری عمر سے ساقط ہو گیا۔ اور ان برسوں میں ہم کیا کچھ کر سکتے تھے، اس مصر کے لیے جس سے ہمیں اس قدر محبت ہے۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ اب ایک بار پھر ہم پہلے کی طرح محفوظ ہیں۔ کابوس ختم ہوا، نفرت مٹ گئی اور صرف محبت باقی رہ گئی۔ یہ کم بخت جنگ معلوم نہیں کب ختم ہوگی۔ امن اس قتل وغارت سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔

ہم ضلعی صدر مقام ایتای البارود پہنچے۔ منشی نے ڈرائیور کو دلال کے گھر کا راستہ بتایا اور جب ہم وہاں پہنچ گئے تو وہ دروازہ کھٹکھٹانے کے لیے اترا۔ میں کار ہی میں بیٹھا رہا۔ صبح منشی نے کہا تھا کہ مجھے دلال سے ملنے خود نہیں جانا چاہیے۔ اس نے پیشکش کی تھی کہ وہ جا کر دلال کو گاؤں تک لا سکتا ہے، لیکن میں نے انکار کر دیا کیونکہ اس کی آمد سے لوگوں کے ذہنوں میں شبہات پیدا ہو سکتے تھے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ دلال کے آنے کا سبب ہمیشہ کوئی غیر قانونی کام ہوتا ہے۔ اور خاص کر اگر وہ ایسے مسرت کے موقعے پر آیا ہوتا جب ہماری زمینوں کے لوٹائے جانے کا حکم جاری ہوا ہے، تو ہمارے دشمن اس حکم کے استناد پر شک کرنے لگتے۔ وہ سوچتے کہ یہ حکم رشوت یا 'خاص تعلقات' کی بنیاد پر جاری کروایا گیا ہے۔ اور کسے معلوم کہ اس سے مستقبل میں میرے یا میری اولاد کے لیے کیا مسائل پیدا ہوتے۔ منشی

Scanned with CamScanner

لوٹا اور مجھ سے بلند آواز میں اندر چلنے کی درخواست کی۔ اس نے میرے نام کے ساتھ 'بے' کا لاحقہ جوڑ دیا، جو اُن پرانے اچھے دنوں کی یادگار ہے جو اب میرے ذہن سے محو ہو چکے ہیں۔ میں کار سے اترا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا دلال کے گھر میں داخل ہو گیا اور بیٹھک میں اس کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔ منشی نے مجھے بتایا کہ دلال سو رہا تھا۔ مجھے اس بے فکری پر اس سے حسد محسوس ہوا۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوا تو اس کے وجود سے دن کی نیند کی بو آ رہی تھی اور آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ اس کے داہنے گال پر پڑے ہوئے سرخ نشانوں سے لگتا تھا کہ وہ چٹائی پر بغیر تکیے کے سوتا رہا ہے، یا سوتے میں اس کا سر تکیے سے سرک کر چٹائی پر آ گیا ہوگا اور وہ جاگے بغیر یونہی سوتا رہا ہوگا۔ اس نے میرے سامنے کی کرسی پر بیٹھ کر مجھے خوش آمدید کہا اور حال دریافت کیا۔ اس نے کہا کہ اسے میرے چہرے سے فکرمندی جھلکتی محسوس ہو رہی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ کوئی پریشانی کی بات ہے۔ چنانچہ میں نے اسے پوری بات بتائی۔ اس نے سگریٹ سلگایا اور ایک سگریٹ مجھے بھی پیش کیا، لیکن میں اپنے درآمد شدہ برانڈ کے سوا کوئی اور سگریٹ نہیں پیتا۔ پھر اس نے پوچھا کہ کیا میں نے اس سے پہلے اپنے بیٹے کی طلبی کو ملتوی کرانے کی کوئی کوشش کی ہے۔ اس نے کہا کہ ظاہر ہے میرے بیٹے اسکول تو جاتے ہی ہوں گے اور میرا یہ بیٹا بھی کہیں پڑھ رہا ہوگا اور اس طرح اسے اپنی طلبی کو کئی بار ملتوی کرانے کا قانونی حق حاصل ہوگا۔ میں اپنی مایوسی اور غصے کو چھپانے کے لیے ہنسا اور پھر اسے بتایا کہ میرا یہ بیٹا بالکل ناکارہ ثابت ہوا ہے اور ابتدائی اسکول کی تعلیم بھی پوری نہیں کر سکا۔ میں نے اسے ہر طرح کی سہولت فراہم کی لیکن وہ کئی سال تک فیل ہوتا رہا۔ پھر میں نے اس کا دوبارہ داخلہ کرایا، اور جب وہ اس بار بھی فیل ہوا تو میں نے اسے صدر مقام کے ایک پرائیویٹ اسکول میں داخل کرایا۔ لیکن اس کی ماں نے اسے گاؤں سے باہر بھیجنے سے انکار کر دیا کیونکہ اسے ڈر تھا کہ اس کے سوتیلے بھائی اس کے ساتھ برا سلوک کریں گے۔ وہ بولی کہ اس نے خواب میں دیکھا ہے کہ اس کے بھائی حسد کے مارے اسے زہر دے رہے ہیں، اور وہ اسے اپنی نظروں سے دور کرنا برداشت نہیں کر سکتی۔ دوسری صورت میں وہ خود اس کے ساتھ جائے گی۔ اسے جانے کی اجازت دینے کو میں تیار نہ تھا۔ پھر چند روز بعد اس نے مجھ سے ایسی فرمائش کی جس کا میں تصور تک نہ کر سکتا تھا۔ اس نے اصرار کیا کہ اس کے بیٹے کو اسکول سے اٹھا لیا جائے، کیونکہ وہ یقیناً اس بار بھی فیل ہوگا اور اس ناکامی سے اس کے لیے زندگی بھر کی نفسیاتی الجھنیں

پیدا ہو جائیں گی۔ یوں بھی، اس کا خیال تھا، پڑھائی لکھائی اور ڈگری اس کے کس کام کی؟ کام کی تلاش میں تو انھیں نکلنا پڑتا ہے جن کے گھر میں کھانے کو نہ ہو۔

دلال اس وقت تک دوسرا سگریٹ سلگا چکا تھا اور میری بات سنتے ہوئے دھویں کے چھلے بنا بنا کر انھیں ہوا میں تحلیل ہوتے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے بولنا شروع کیا۔ اس نے کہا کہ اگرچہ میرے بیٹے کو طلبی سے بچانا اس کے لیے آسانی پیدا کرنا ہے لیکن اتنا کہہ دینا اس کا فرض ہے کہ لڑکے کو مرد بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اسے فوج میں بھیجا جائے، اور اگر یہ موقع ضائع ہو گیا تو پھر اسے سدھارنا ممکن نہیں رہے گا۔ میں نے کہا کہ میں اس کی باتوں کی قدر کرتا ہوں اور اس ہمدردی کے لیے اس کا ممنون ہوں، لیکن ہر شخص کی اپنی مجبوریاں ہوتی ہیں اور میں بھی ایک دشوار اور پیچیدہ صورت حال میں ہوں۔ میں اپنے بیٹے کو خود سے دور نہیں کر سکتا؛ اگر طلبی کا حکم کسی اور موقعے پر آیا ہوتا تو میں خود اسے زبردستی محاذ پر بھیج دیتا۔ دلال نے میری بات کاٹ دی اور براہ راست اصل موضوع پر آ گیا۔ اس نے کہا کہ مجھے شروع ہی میں اس کے پاس آنا چاہیے تھا۔ اس پر میں نے تعجب کا اظہار کیا اور کہا کہ میں طلبی کا حکم ملتے ہی سیدھا اس کے پاس آیا ہوں۔ اس نے کہا نہیں، شروع سے مراد یہ ہے کہ جب میرا بیٹا کم عمر تھا تب ہی مجھے فیصلہ کر لینا چاہیے تھا کہ اسے فوجی خدمت انجام نہیں دینی ہے۔ تب وہ کوئی آسان راہ نکال سکتا تھا اور اس میں میرا ایک پیسہ بھی خرچ نہ ہوتا۔ بولتے ہوئے اس کے انداز سے نیند اور کسالت غائب ہو چکی تھی اور وہ پُرجوش معلوم ہونے لگا تھا۔ اس نے کہا، ”کیا آپ جانتے ہیں کہ آج آپ کے بیٹے کی طلبی کا حکم کیوں جاری ہوا ہے؟ اس لیے کہ چند مہینے پہلے اس نے ضلعی صدر مقام میں اپنے شناختی کارڈ کے اجرا کی درخواست دی تھی۔ درخواست کے کاغذات میں سے ایک فارم ایسا ہے جو قاہرہ میں فوجی بھرتی کے دفتر کو بھیجا جاتا ہے تاکہ وہ جانچ کر سکیں کہ درخواست دینے والے نے لازمی فوجی خدمت انجام دی ہے یا نہیں۔ اگر نہ دی ہو تو فوراً طلبی کا حکم جاری کیا جاتا ہے۔ اگر مجھے اس وقت معلوم ہوتا تو میں شناختی کارڈ کے دفتر کے کلرک سے بات کر لیتا، کیونکہ اس مرحلے پر یہ ایک نہایت سادہ سی بات ہوتی: فوجی خدمت والا فارم قاہرہ بھیجا ہی نہ جاتا اور وہاں کسی کو آپ کے بیٹے کے بارے میں معلوم ہی نہ ہوتا۔ ہوا یہ ہے کہ اس نے شناختی کارڈ کی درخواست دیتے وقت آپ سے صلاح نہیں لی — جس کا مطلب ہے کہ مجھے بھی اس بارے میں کچھ معلوم نہ

ہوا ـــ اور نتیجہ یہ کہ اب آپ اس مشکل میں پڑ گئے۔ بہر حال، اب کوئی نہ کوئی راستہ تو نکالنا ہی ہوگا۔ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے، لیکن مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ ناممکن بھی نہیں ہے۔ میں کچھ نہ کچھ کر لوں گا۔" میرے چہرے کے عضلات کچھ ڈھیلے پڑے اور مجھے قدرے اطمینان محسوس ہونے لگا۔ میں نے اس سے کہا کہ خطا ہم سب سے ہوتی ہے اور اب وہی ہے جو اس معاملے سے نمٹنے کی کوئی راہ نکال سکتا ہے۔ ہم اپنے لیے بہت سے مسائل پیدا ہی اس لیے کرتے ہیں، میں نے کہا، کہ ہمیں اُس کی اہلیت پر اعتماد ہے کہ وہ ان مسائل کو حل کر سکتا ہے۔ اس نے مجھے یقین دلایا کہ وہ میری خدمت کے لیے ہر طرح حاضر ہے۔ اس نے میرے بیٹے کے کاغذات رکھ لیے اور ہم سے دو ایک دن بعد آنے کو کہا۔ منشی نے اسے فوری طلبی کا حکم یاد دلایا۔ دلال نے کہا کہ وہ چند دن کا التوا حاصل کر لے گا۔ وہ بھرتی کے افسر سے بات کر کے اسے ہفتے بھر کی رعایت دینے پر آمادہ کر لے گا اور اس عرصے میں اس مشکل کا کوئی نہ کوئی حل نکال لیا جائے گا۔ یہ بتاتے ہوئے کہ بھرتی کا افسر اس سے بہت سے معاملوں میں تعاون کرتا ہے، وہ مسکرایا اور اس کے پیلے دانت چمک اٹھے۔ دلال کے گھر سے باہر نکلتے ہوئے مجھے کچھ بے چینی سی محسوس ہوئی۔ مجھے دلال کے سرد رویے سے تشویش ہو رہی تھی، کیونکہ ہر ایک نے بتایا تھا کہ اس کا رویہ بہت اطمینان دلانے والا ہوتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میں گاؤں کا عمدہ ہوں، یعنی خود حکومت کا ایک نمائندہ۔ یا شاید وہ منشی کی موجودگی کی وجہ سے خوفزدہ ہو کہ کہیں وہ بعد میں اس کے خلاف گواہی نہ دے دے۔ چنانچہ میں نے منشی کو دلال کے پاس واپس بھیجا تاکہ وہ اسے اطمینان دلا سکے کہ میری عادت ہے کہ کسی نہ کسی شخص کو، چوکیدار یا منشی کو، ایسے موقعوں پر اپنے ساتھ رکھتا ہوں۔

گھر میں کسی کو ان واقعات کی کچھ خبر نہ تھی۔ میں باہر دوار میں چلا گیا اور منشی اور چوکیدار دونوں کو تاکید کی کہ اس معاملے کا کسی کو علم نہ ہونے پائے۔ منشی یہ بات سن کر ہنسا اور بولا کہ جہاں تک اس کا تعلق ہے، طلبی کا حکم کبھی وصول ہی نہیں ہوا! کسی رجسٹر یا سرکاری کاغذ میں اس کی آمد کا اندراج ہی نہیں کیا گیا۔ اس کے بعد میں نے کچھ دوسرے معاملات کی طرف توجہ کی۔ جائیداد کے منتظم نے ان زمینوں کے کاغذات پیش کیے جو اس عادلانہ حکم کے نتیجے میں مجھے واپس ملنے والی تھیں۔ مجھے ان کو اپنے قبضے میں لینے کی تیاری کرنی تھی۔ ان کاغذات کے ساتھ ان کسانوں کے ناموں کی فہرست

Scanned with CamScanner

منسلک تھی جو ضبطی کے وقت سے ان پر کھیتی کرتے آ رہے تھے۔ ان میں سے بعض نے کرایہ نامے بنوا رکھے تھے، بعض زمین کے چھوٹے قطعوں کو آسان قسطوں میں، مضحکہ خیز حد تک قلیل رقموں کے عوض، خرید رہے تھے۔ میں نے تمام کاغذات کا جائزہ لیا۔ کل میں منشی کو بھیجوں گا کہ وہ عدالت میں جا کر پتا لگائے کہ فیصلے کی نقل کب تک مل سکے گی تاکہ اس پر عمل درآمد کے احکام جاری کرائے جا سکیں۔ اس دوران میں یہاں کے لوگوں کی نبض ٹٹول لوں گا۔ معلوم نہیں وہ پُر امن اور دوستانہ طور پر زمین کا قبضہ چھوڑنے پر آمادہ ہو جائیں گے یا مجھے پولیس کی مدد طلب کرنی ہو گی جو، الحمدللہ، ہم جیسے مظلوموں کو ان کا حق دلوانے کے لیے موجود ہے۔ میں اس وقت تک زمین کا قبضہ نہیں لوں گا جب تک ان پر ایک بھی کرایہ دار موجود ہے۔ ان شرائط پر زمین واپس لینے سے تو نہ لینا ہی بہتر ہے۔ بٹائی پر دینے سے ایک فدان پر سال میں کُل تیس پاؤنڈ ملتے ہیں، اور اس پر مختلف قسم کے محصول دینے پڑتے ہیں، قرض کی قسطیں اور فیسیں اس کے علاوہ ہیں۔ جبکہ اگر زمین میرے قبضے میں ہو، میری جائیداد میں شامل ہو، اور میں خود اسے کاشت کراؤں تو ایک فدان پر تمام خرچ نکال کر سالانہ پانچ سو پاؤنڈ کی آمدنی ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ اگر میں کاشتکاروں سمیت زمین کا قبضہ لے لوں تو پھر ان کو نکالنا مشکل ہو گا۔ میں نے سوچا، میں پہلے ہی پورا معاملہ صاف کر لوں گا، حالانکہ مجھے یقین ہے کہ زمینداروں اور کاشتکاروں کے معاہدوں کا قانون جلد ہی تبدیل کر دیا جائے گا۔ کون مان سکتا تھا کہ ہماری زمینیں ہمیں واپس مل جائیں گی؟ اور اب جب یہ ناممکن بات واقع ہو گئی ہے تو اور بھی بہت سی ناانصافیوں کا خاتمہ ہو گا، اور بہت جلد پرانا دور واپس آ جائے گا۔ جیسا کہ ہمارے بزرگ کہا کرتے تھے، جسے صبر کی نعمت نصیب ہوتی ہے وہی اپنے دل کی مراد پاتا ہے۔

رات ہو گئی۔ جب مہمان آئے ہوئے ہوتے ہیں تو میں رات کا کھانا دوار ہی میں کھاتا ہوں۔ لیکن آج میں نے گھر میں، اپنی سب سے چھوٹی بیوی کے مکان میں کھانا کھانے کا فیصلہ کیا۔ وہ میری سب سے چھوٹی بیوی رہے گی، کیونکہ اب میں کوئی اور شادی نہیں کروں گا۔ جب میں راہداری سے گزرا تو 'بڑی اماں' اپنے دروازے پر کھڑی تھی اور اس نے مجھے دیکھ کر منھ ہی منھ میں کچھ کہا۔ مجھے فوراً اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کا معاملہ یاد آیا اور میں نے سوچا کہ اگر یہ بات کھل جائے تو یہ عورت اور اس کی اولادیں سب سے زیادہ خوشی منائیں گی۔ میں نے کھانا کھایا، چائے پی، اور اللہ کا شکر ادا کیا۔

Scanned with CamScanner

پھر میں اپنی بیوی کے پاس بیٹھ گیا اور اس کو پوری بات بتائی؛ اسے یقین دلایا کہ اس کا بیٹا اس سے ہرگز جدا نہیں ہوگا۔ لیکن بات کرتے کرتے مجھے احساس ہوا کہ وہ بہت کم عمر اور ناتجربہ کار ہے اور جو کچھ ہوا ہے اس کے صحیح معنی جاننے سے عاجز ہے۔ مجھے خیال ہوا کہ میں نے اس کے ساتھ ناانصافی کی ہے، کیونکہ وہ ہماری دنیا سے زیادہ واقفیت نہیں رکھتی۔

اگلی صبح منشی دلال سے ملنے کے لیے گیا، اور جب لوٹا تو اس کی باتیں اطمینان سے بھرپور تھیں۔ اگرچہ اس نے یہ بھی کہا کہ دلال کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ جب اس کی خدمات کا معاوضہ دینے کا موقع آئے گا تو وہ بہت بڑی رقم طلب کرے گا۔ میں طے شدہ وقت پر دوبارہ دلال سے ملنے گیا، اور اس کے رویے میں وہی سردمہری محسوس کی جس کا تجربہ پہلے ہوا تھا۔ شاید یہ شخص زندگی کے بارے میں کوئی جوش وخروش محسوس ہی نہیں کرتا۔ اس نے بتایا کہ اس مسئلے کو دو طریقوں سے حل کیا جا سکتا ہے۔ پہلا حل آسان، محفوظ اور بے عیب ہے، جبکہ دوسرا دشوار اور پیچیدہ۔ پہلا حل یہ ہے کہ میرے بیٹے کی دستاویزات تیار کرا کے اسے ملک سے باہر بھیج دیا جائے اور وہ وہاں رہ کر لام بندی کے اس تمام معاملے کے ٹھنڈا ہونے تک انتظار کرے۔ میں نے اس حل کو سنتے ہی مسترد کر دیا۔ وہ ملک سے باہر کیونکر جا سکتا تھا؟ میرے بیٹے کے مجھ سے جدا ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

''چلیے، پہلا حل تو یوں ختم ہوا۔'' اس کے بعد اس نے دوسرے حل کے طریق کار کی تفصیلات بیان کرنی شروع کیں، جو اس قدر پیچیدہ تھیں کہ پہلے پہل تو میری سمجھ ہی میں نہ آئیں۔ جب آخرکار سمجھ میں آئیں تو میں گھبرا گیا، کیونکہ اس میں ہر قسم کے لوگوں کو ملوث کرنے کی ضرورت پڑتی تھی۔ لیکن میں کر کیا سکتا تھا؟ جب کسی شے کی احتیاج ہو تو اسے حاصل کرنے کی مشکلوں کا بھی سامنا کرنا ہی پڑتا ہے۔ میں نے اس معاملے کو اگلے دن پر ٹالنے کی کوشش کی تاکہ اچھی طرح اس پر غور کر سکوں، لیکن منشی مجھ سے بحث کرنے لگا کہ اس سلسلے میں کسی تردد کی ضرورت نہیں اور ہم اس معاملے کو ابھی نمٹا سکتے ہیں۔ چنانچہ میں نے دلال کی تجویز پر رضامندی ظاہر کر دی۔ لیکن پھر رک کر اس منصوبے کے آخری حصے پر غور کرنے لگا جس کے تحت میرے بیٹے کو اس وقت تک گاؤں سے دور رہنا تھا جب تک منصوبے پر پوری طرح عمل نہ ہو جائے۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا کہ وہ پندرہ دن یا مہینے بھر کے لیے گاؤں چھوڑ کر جا سکتا ہے۔ اس پر دلال نے مجھے غور سے دیکھا اور دھیمے لہجے میں کہا کہ یہ مہینے دو مہینے کی بات نہیں؛

میرے بیٹے کو طویل عرصے تک گاؤں سے باہر رہنا ہوگا، اور یہ عرصہ پانچ سال کا بھی ہو سکتا ہے۔ اگر معاملے کو راز میں رکھنا ہے تو اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ لڑکے کی گاؤں میں موجودگی ایسی صریح شہادت ہوگی جو ہم سب کو قید خانے تک پہنچا سکتی ہے۔ میں نے کہا کہ میں اسے آخری موقع دینا چاہتا ہوں کہ وہ کسی شہر کے پرائیویٹ اسکول سے اپنا ابتدائی امتحان پاس کر لے۔ ''آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں!'' دلال نے زور سے کہا۔ ''آپ کا بیٹا فوج میں جا رہا ہے۔ کیسا اسکول اور کہاں کی پڑھائی؟'' پھر وہ ہنسا اور کہنے لگا کہ ابتدائی یا ثانوی اسکول کی سند حاصل کرنا کوئی مسئلہ نہیں۔ یہ سب سندیں قاہرہ میں آسانی سے خریدی جا سکتی ہیں، اور وہ عباسیہ کے علاقے میں ایک ڈاکٹر سے واقف ہے جس کے پاس ان سندوں کا ڈھیر پڑا ہے۔ ہر سند کی قیمت اس کی نوعیت، حصول کے سال، مضمون اور نتیجے کے اعتبار سے مقرر ہوتی ہے۔ مجھے ناقابل یقین حد تک بے چینی محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ مجھ سے کوئی بہت بڑی غلطی سرزد ہونے والی ہے۔ میں اپنے بیٹے کو فوجی بھرتی سے بچا کر ایسی صورت حال میں مبتلا کر رہا ہوں جہاں اس کا کوئی مستقبل نہیں ہوگا۔ میں اس کی ماں کے پاس واپس گیا، اسے ساری بات بتائی اور تجویز کیا کہ وہ اپنے گاؤں چلی جائے۔ مجھے تعجب ہوا جب اس نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا، کیونکہ لگتا تھا کہ وہ وہاں اپنی اور اپنے بیٹے کی سلامتی کے بارے میں خوفزدہ ہے۔ وہ جس بڑے خاندان سے تعلق رکھتی تھی وہ بہت سی شاخوں میں تقسیم ہو گیا تھا اور ان شاخوں کے درمیان آپسی رنجشیں اور دشمنیاں بہت پھیلی ہوئی تھیں۔ مجھے یقین نہ آیا جب اس نے خواہش ظاہر کی کہ وہ شہر میں کرائے پر فلیٹ لے کر اپنے بیٹے کے ساتھ رہے۔ میں ہفتے میں تین بار ان دونوں سے ملنے وہاں آ سکتا ہوں، اس نے کہا، یا ایک کار خرید سکتا ہوں تاکہ وہاں رہ کر روز گاؤں آ سکوں۔ مجھے لگا کہ وہ مذاق کر رہی ہے، کیونکہ اسے اچھی طرح علم ہے کہ میں اپنے گاؤں سے دور رہ ہی نہیں سکتا۔ میں مچھلی کی طرح ہوں جو پانی سے باہر ایک منٹ بھی زندہ نہیں رہ سکتی۔ میری جو کچھ زندگی ہے وہ یہیں ہے۔ اور اب جبکہ اچھے دن لوٹ رہے ہیں اور پہلی بار مستقبل خوش آئند دکھائی دے رہا ہے، میں گاؤں چھوڑ کر کیونکر جا سکتا ہوں؟ مجھے اس کے ارادوں پر شک محسوس ہونے لگا۔ یہاں گاؤں میں میں اس پر نظر رکھ سکتا ہوں اور کوئی شخص اس کے کمرے میں داخل نہیں ہو سکتا۔ لیکن بیٹے کے ساتھ اس کے شہر چلے جانے کے بعد مجھے کیا معلوم ہوگا؟ میں نے اس کی بات پر بہت دیر تک غور کیا۔ مجھے خیال ہوا کہ اگر

Scanned with CamScanner

مجھے معلوم ہوتا کہ اس معاملے کا یہ نتیجہ نکلنے والا ہے تو میں نے اپنے بیٹے کو فوج میں بھیج دیا ہوتا۔ میں خواب گاہ میں جا کر سونے کی کوشش کرنے لگا، لیکن نیند نہ آئی۔ میرے کروٹیں بدلنے سے چارپائی میرے بدن کے نیچے چرچراتی رہی اور مجھے وہ دن یاد آتے رہے جب میں واقعی مرد تھا۔ تب مجھے معاملے کا ایک اور پہلو یاد آیا: دلال نے مجھ سے کسی ایسے لڑکے کا پتا لگانے کو کہا تھا جو میرے بیٹے کا ہم عمر ہو، جس کی پیدائش کا دن وہی ہو جس دن میرا بیٹا پیدا ہوا تھا، اور جس کے خدوخال بھی اس سے ملتے جلتے ہوں، تاکہ اسے میرے بیٹے کی جگہ بھرتی کے لیے بھیجا جا سکے۔ گاؤں لوٹ کر منشی نے گاؤں کے پیدائش اور موت کے رجسٹر کا جائزہ لینا شروع کیا اور آخر کاغذ کا ایک پرزہ مجھے تھمایا جس پر ایک نام ''مصری'' لکھا ہوا تھا۔ میں غصے میں آ گیا اور اس سے کوئی اور شخص تلاش کرنے کو کہا۔ اگر میں اپنے اس ردعمل کی وجہ بتاؤں تو آپ ہنسنے لگیں گے، شاید آپ کو میری بات پر یقین ہی نہ آئے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لڑکا، مصری، ایک سابق چوکیدار کا بیٹا ہے اور گاؤں بھر میں اپنی ذہانت اور اسکول میں اچھی کارکردگی کے باعث مشہور ہے: ہمیشہ اپنی جماعت میں اول آتا ہے اور میں نے اس کے لیے اپنی پسندیدگی کو کبھی پوشیدہ نہیں رکھا۔ کتنی ہی بار میں نے اس سے حسد محسوس کیا ہے اور چاہا ہے کہ کاش وہ میرا بیٹا ہوتا! میں نے دنیا کے ان ناقابل فہم طریقوں پر مایوسی سے اپنی مٹھیاں بھینچی ہیں جہاں ایسے لوگوں کو آویزے نصیب ہو جاتے ہیں جو کان ہی نہیں رکھتے۔ مصری کو پچھلے سال اپنی پڑھائی ادھوری چھوڑنی پڑی تھی، کیونکہ وہ کئی بہنوں کا اکلوتا بھائی ہے، اور اس کا باپ یہ استطاعت نہ رکھتا تھا کہ مصری کو پڑھنے کے لیے شہر بھیج دے جبکہ گاؤں میں زرعی اصلاحات کے تحت اسے پٹے پر ملنے والی تین فدان زمین کی کاشت کے لیے اسے کسی ہاتھ بٹانے والے کی ضرورت تھی۔ میں بیٹھا زندگی کی بوالعجبیوں پر غور کرتا رہا۔ میرا بیٹا، جسے میں چاہوں تو تعلیم حاصل کرنے کے لیے چین تک بھیج سکتا ہوں، پڑھائی میں بالکل ناکام ہے، جبکہ یہ لڑکا، جسے کپڑوں کا دوسرا جوڑا بھی نصیب نہیں، ذہین اور کامیاب ہے۔ چھ اولادوں میں واحد بیٹا ہونے کے باعث اسے لازمی فوجی خدمت سے استثنیٰ حاصل ہے، جبکہ میرا اپنا بیٹا، جو اپنی تعلیم مکمل نہیں کر سکا، بھرتی کے لیے طلب کر لیا گیا ہے۔ منشی واپس آیا اور اصرار کرنے لگا کہ مصری ہی مناسب ترین شخص ہے۔ میں نے اس سے کسی اور کا نام تجویز کرنے کی التجا کی، کیونکہ میں بھی انسان ہوں اور سینے میں دل اور دل میں لوگوں کے لیے رحم رکھتا ہوں اور نہیں چاہتا

کہ کسی کے ساتھ ظلم ہو۔ منشی نے کہا کہ اگر معاملہ صرف کسی اور نوجوان کو تلاش کرنے کا ہوتا تو بہت سادہ تھا۔ مصری کے علاوہ بھی بہت سے لڑکے موجود ہیں۔ یہ کہہ کر اس نے مجھے ان نرینہ اولادوں کی ایک فہرست دی جو اسی دن پیدا ہوئے تھے جو میرے بیٹے کی پیدائش کا دن تھا۔ میں نے ان ناموں پر نظر ڈالی اور اسی نتیجے پر پہنچا کہ مصری ہی مناسب ترین انتخاب ہے۔ منشی نے پوچھا کہ مجھے آخر کیا تردد ہے: میں تو مصری پر ایک طرح کا احسان کر رہا ہوں۔ جو زمین اس وقت اس کے باپ کے پاس ہے وہ بہت جلد اس سے واپس لے کر مجھے دی جانے والی ہے، اور اس کے خاندان کی واحد آمدنی مصری کے باپ کی تنخواہ رہ جائے گی، جو محض چھ پاؤنڈ ماہانہ ہے۔ مصری کو کوئی نہ کوئی کام تو ڈھونڈنا ہی ہے، اور اگر کوئی کام نہ ملا تو اسے فوج میں بھرتی ہونا ہی ہوگا۔ اس طرح اپنے بیٹے کی جگہ اسے فوج میں بھیج کر میں اس کے لیے روزی کمانے اور اپنے خاندان کا پیٹ پالنے کا ایک ذریعہ پیدا کر رہا ہوں۔ اس کی ساری ضرورتیں پوری ہوں گی، اس کے کھانے پینے، پہننے اوڑھنے اور رہنے سہنے کا سرکاری بندوبست ہوگا، اور یہاں میں اس کے گھر والوں کا خیال رکھوں گا ہی۔ کیا یہ لوگ ایسی کسی صورت حال کا خواب بھی دیکھ سکتے تھے؟ منشی مجھے یقین دلا رہا تھا۔ اس نے کہا کہ یقینی روزگار حاصل کرنے کا واحد ذریعہ فوج میں بھرتی ہونا ہے، کیونکہ قانون میں کہا گیا ہے کہ جس شخص نے اپنی لازمی فوجی خدمت پوری کر لی ہو اسے فارغ ہوتے ہی سرکاری ملازمت دی جائے گی۔ اور اگر وہ فوج کی ملازمت نہ چھوڑنا چاہے تو وہ اسے جاری رکھ کر بڑی تنخواہ والے کسی اعلیٰ عہدے تک بھی پہنچ سکتا ہے۔ کسی طرح بھی دیکھا جائے، یہ مصری کے لیے بڑے فائدے کی بات ہے۔ منشی نے شافعی اور مالکی اور حنفی طلاق کی قسم کھا کر بتایا کہ مصری خود فوج میں بھرتی ہونے کے موقعے کی تلاش میں ہے۔ ابھی کل ہی اس نے ڈاک خانے جا کر اس سلسلے میں معلومات حاصل کی تھیں اور وہاں اسے بتایا گیا تھا کہ بھرتی کا فارم صدر دفتر میں بھرتی کے نائب افسر سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ مصری کے گھر والوں نے ان سے زمین واپس لے کر اصل مالک کو لوٹائے جانے کی خبر سن لی ہے، اور ان کے پاس کوئی اور راستہ باقی نہیں رہا۔ انھوں نے قریب کے گاؤں کے ایک کسان کا ذکر بھی سنا ہے جس نے زمین واپس دینے سے انکار کیا اور پولیس کے ہاتھوں مارا گیا۔ مصری تو فوج میں بھرتی ہو ہی رہا ہے، خواہ اپنے نام سے ہو یا کسی اور کی عیوضی میں، اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ رضا کار کے طور پر بھرتی

Scanned with CamScanner

ہونے کے بجائے وہ عمدہ کے بیٹے کی حیثیت سے بھرتی ہوسکتا ہے۔

میں منشی کی باتوں سے قائل نہ ہوا اور اس معاملے کے نیک و بد پر غور کرتا رہا۔ میرے ساتھ مشکل یہ ہے کہ میرا ضمیر ہمیشہ مجھے ٹوکتا رہتا ہے، چھوٹے سے چھوٹے فعل کے بارے میں مجھ سے حساب طلب کیا کرتا ہے۔ اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھنے والے اور اچھی تعلیم حاصل کرنے والے فرد کے ساتھ، کسی ان پڑھ گنوار کے برعکس، یہی مشکل ہوتی ہے۔ منشی متواتر مجھے اس بات پر قائل کرنے کے لیے دلیلیں دیتا رہا کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں دراصل چوکیدار اور اس کے بیٹے کے فائدے میں ہے، اور اس سے میرے بیٹے کو جو فائدہ پہنچ رہا ہے وہ محض اتفاقی ہے۔ جب منشی بولتے بولتے اور میں سنتے سنتے تھک گیا، تو میں نے اپنی موافقت ظاہر کردی۔

میرے گھر سے باہر نکلتے ہوئے منشی نے کہا:

''ٹھیک ہے، تو پھر اللہ کا نام لے کر کام شروع کرتے ہیں۔''

— ۲ —
دلال

آج کل میرے نصیب میں جو واحد نعمت ہے وہ نیند ہے۔ میں جاگتا ہی اس واسطے ہوں کہ دوبارہ سو سکوں۔ یہی میرا فلسفہ ہے اور اس پر میں ہر روز عمل کرتا ہوں۔ میں کبھی داہنی کروٹ لیتا ہوں کبھی بائیں، کبھی پیٹھ کے بل لیٹتا ہوں اور کبھی پیٹ کے بل، اور رہٹ کے پہیے کی طرح چکراتا رہتا ہوں۔ جب میرا بدن اس متواتر نیند پر احتجاج کرنے لگتا ہے، تب میں جاگتا ہوں، اور وہ بھی اس کیفیت میں کہ میرا بدن دُکھ رہا ہوتا ہے، آنکھیں سوجی ہوئی ہوتی ہیں، اور ذہن سکون کے سمندر کی ساکت سطح پر تیر رہا ہوتا ہے۔ جب لوگ میرے گھر کے پاس سے گزرتے ہیں، یہ جانتے ہوئے کہ میں سو رہا ہوں، تب آپ کے خیال میں وہ کیا کرتے ہیں؟ وہ بلند آواز میں پکارتے ہیں: ظالم کی نیند عبادت ہے۔ جبکہ میں نے کبھی کسی پر ظلم نہیں کیا؛ حقیقت یہ ہے کہ میں زندگی بھر لوگوں کی خدمت کرتا رہا ہوں۔ لیکن ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ جونہی کسی کی مشکل حل ہوئی اور میں نے اپنا معاوضہ طلب کیا، اس کی نظروں میں فوراً ظالم قرار پایا۔ اس دن بھی میں اپنی عادت کے مطابق سو رہا تھا اور وہی پرانے خواب دیکھ رہا تھا جو میری زندگی کی بے وقعتی اور خستہ حالی کو کسی قدر کم کر دیتے ہیں۔ خواب میں مدیر تربیت و تعلیم ایک بڑے اجتماع میں مجھ سے معذرت طلب کر رہا تھا اور التجا کر رہا تھا کہ میں اپنی پرانی ملازمت پر بطور استاد واپس آ جاؤں۔ میں اس سے کہہ رہا تھا کہ میری عمر اور تجربے کو دیکھتے ہوئے مجھے اسکول کا ہیڈ ماسٹر بنایا جانا چاہیے، اور وہ میری تمام شرائط مانتا جا رہا تھا اور بار بار وزارت کی طرف سے مجھ سے معافی کا طلب گار ہو رہا تھا۔ میں نے اس کی معذرت قبول کرتے ہوئے کہا کہ میں اگلے روز سے اسکول آ جاؤں گا۔ عین اس لمحے کار کے ہارن کی آواز نے مجھے میٹھی نیند سے چونکا دیا۔ اس پر مجھے غصہ

آیا کیونکہ میں اس خواب میں کچھ اور وقت بسر کرنا چاہتا تھا۔ ہارن کی آواز ایک بار پھر سنائی دی۔ یہ عجیب بات تھی، کیونکہ ہمارے قصبے میں کاریں گنی چنی ہیں اور میرے موکل عام طور پر اس طرح کے لوگ نہیں ہوتے جو کاروں کے مالک ہوں۔ جو شخص کار میں سفر کرتا ہو اس کے تعلقات تمام اونچے لوگوں سے ہوتے ہیں اور وہ اپنے رشتے داروں اور دوستوں کی مدد سے اپنے معاملات سلجھالیتا ہے۔ اس کے پاس اتنے بے شمار راستے اور اتنی تدبیریں ہوتی ہیں جتنے اس کے سر پر بال۔ میرے پاس آنے والے غریب اور بے آسرا لوگ ہوتے ہیں، جن کے پاس زندگی میں کچھ زیادہ امکانات نہیں ہوتے، وہ لوگ جن کو اپنے سامنے ہر دروازہ بند ملتا ہے۔ میرے ایک بیٹے نے آ کر بتایا کہ کوئی اجنبی مہمان آئے ہیں۔ میں باہر نکلا تو دیکھا کہ ہمارے ضلعے کے ایک گاؤں کا عمدہ مجھ سے ملنے آیا ہے۔ میں نے اپنے دل میں کہا، کیا عجب وقت آ گیا ہے! عمدہ اب محض کاغذی شیر رہ گئے ہیں؛ ذرا نگاہ بھر کر دیکھنے کی دیر ہے کہ پگھل کر بہہ جاتے ہیں۔ وہ دن گزر گئے جب عمدہ ناممکن کو ممکن کر دکھاتے تھے۔ میں اپنا نیند کا جلابیہ پہنے پہنے باہر نکل آیا تھا۔ پیاس سے میرا حلق سوکھ رہا تھا۔ میں نے دیوان خانے میں، جہاں عمدہ میرے انتظار میں بیٹھا تھا، جانے سے پہلے پانی پیا۔ تب میرا دل ڈوبنے لگا۔ کیونکہ یہ عمدہ ضلعے کا سب سے مالدار شخص تھا۔ یہ بظاہر بڑی مبارک بات معلوم ہوتی ہے، لیکن دراصل مالدار لوگ ہی معاوضہ ادا کرنے میں زیادہ ہچر مچر کرتے ہیں۔ غریب لوگ ایک لفظ منہ سے نکالے بغیر ادائیگی کر دیتے ہیں، حالانکہ یہ میں کبھی نہ جان سکا کہ وہ رقم کا بندوبست کہاں سے کرتے ہیں۔

بہر حال، اس وقت میرے ہاتھ میں کوئی کام نہ تھا۔ بازار سرد تھا۔ سو میں نے اپنے آپ سے کہا کہ اندھا ہونے سے کانا ہونا بہتر ہے۔ دیوان خانے میں عمدہ اکیلا نہ تھا۔ اس کے ساتھ ایک اجنبی شخص بیٹھا دکھائی دیا، لیکن قریب جانے پر میں اسے پہچان گیا۔ وہ عمدہ کے پاس ٹیلیفون کے کلرک کی حیثیت سے ملازم تھا۔ میں سلام کر کے بیٹھ گیا۔ پھر ہم نے ایک دوسرے کا حال احوال دریافت کیا اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ میں نے اس موقعے کی مناسبت سے کہے جانے والے خیر مقدمی کلمات ادا کیے۔ میں نے جس قدر تواضع کے انداز میں مجھ سے ممکن تھا، کہا کہ اس کے آنے سے میرے گھر میں نور اتر آیا ہے، اور غریب خانے پر عمدہ جیسے شخص کی آمد میرے لیے بڑا اعزاز ہے، وغیرہ۔ کلرک نے مجھ سے عمدہ کو مبارک باد دینے کو کہا، کیونکہ پچھلے روز اس کی زمینیں واپس کیے جانے کا

Scanned with CamScanner

حکم جاری ہوا تھا۔ اس نے بتایا کہ گاؤں میں زبردست جشن منایا گیا جس میں ضلعے کے ہر قابل ذکر فرد کو مدعو کیا جانا چاہیے تھا، مجھ سمیت۔ لیکن سب کچھ اتنی جلدی میں ہوا کہ عمدہ کی طرف سے دعوت نامے نہ بھجوائے جا سکے۔ بہر کیف، اصل جشن کو اُس دن کے لیے اٹھا رکھا گیا ہے جب زمینیں واقعی واپس کر دی جائیں گی، اور مجھے ابھی سے اس شاندار جشن میں شرکت کی دعوت ہے۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ کلرک جھوٹ بول رہا ہے، اور مجھے مدعو کرنے کا خیال تک ان کے ذہن سے نہ گزرا ہوگا، اور صرف آج کی ملاقات کے باعث وہ مجبوراً یہ سب باتیں کہہ رہا ہے۔ لیکن میں نے یہی ظاہر کیا کہ اس کی باتوں پر یقین کر رہا ہوں۔ میں نے عمدہ کو مبارک باد پیش کی، اور کہا کہ اس کی کامیابی دراصل ہم سب کی کامیابی ہے، اور یہ کہتے ہوئے بالکل نہ سوچا کہ ہم سب سے کیا مراد ہے۔ عمدہ سے معانقہ کرنے کے لیے کھڑے ہوتے ہوئے میری نظر سامنے والی دیوار پر لگے ہوئے بڑے آئینے میں اپنے چہرے کے عکس پر پڑی۔ یہ ایک مسرور چہرہ تھا، جسے دیکھ کر مجھے خیال ہوا کہ یہ کسی اور کا ہے — بلاشبہ میرے اندر بہت سے دوسرے افراد بھی بستے ہیں۔ کلرک نے زمین کی واپسی کے بارے میں جو کچھ کہا تھا اس کی پوری اہمیت کا مجھے اس وقت احساس نہ ہوا تھا، لیکن خود کو مسرور ظاہر کرنے کی کوشش میں میں اپنی کسالت سے باہر نکل آیا تھا اور ایک داخلی تسکین مجھ پر چھا گئی تھی۔ یہ یقیناً ایک اچھا شگون تھا۔ عمدہ سے اس کی زمینیں لے لی گئی تھیں اور اب ان کی واپسی اس سے زیادہ اس کی اولادوں کے لیے اہمیت رکھتی تھی۔ لیکن میں تو اپنی ملازمت، اپنی عزت اور اپنے بچوں کا مستقبل، سب کچھ گنوا بیٹھا تھا۔ جس دن میں کلاس میں بچوں کو اٹھ کر کھڑے ہونے اور بیٹھنے کا حکم دینے سے محروم ہوا تھا، اس دن سے میں کوئی سوکھا ہوا درخت یا معذور آدمی ہو کر رہ گیا تھا۔ عمدہ کے کلرک کے لفظوں نے مجھ میں ایک تازہ تسکین پیدا کر دی۔ اگر عمدہ کی زمینیں واپس مل سکتی ہیں تو یقیناً میری عزت اور حیثیت بھی ایک نہ ایک دن میرے پاس لوٹ آئے گی۔ مجھے صرف اس سازگار وقت کا انتظار کرنا ہوگا۔ مبارکباد کے بعد ہم سب خاموش ہو گئے کیونکہ ہمارے پاس ایک دوسرے سے کہنے کو کوئی بات نہ بچی تھی۔ چائے آئی۔ میں نے اٹھ کر اسے پیالیوں میں انڈیلا اور ان دونوں کو پیش کیا۔ عمدہ نے اپنی جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ یہ برانڈ میرے لیے اجنبی تھا۔ میں لپک کر اپنے کمرے میں گیا اور اپنے سگریٹ اٹھا لایا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو اپنے اپنے سگریٹ پیش کیے اور قسم دے دے کر انھیں قبول کرنے کی

Scanned with CamScanner

استدعا کی۔ میں نے میزبان کے فرائض اور میزبانی کے اصولوں کا ذکر کیا، لیکن عمدہ نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ ہم دونوں ایک ہی خاندان کے افراد ہیں اس لیے وہ خود کو اس گھر میں مہمان نہیں سمجھتا۔ اس کے کہنے کے مطابق گھر والوں کے درمیان کوئی تکلف حائل نہیں ہونا چاہیے۔ چائے اور سگریٹ کے زیر اثر میں خود میں پہلے کی سی توانائی محسوس کرنے لگا۔ میں نے اصل موضوع پر آنے کا فیصلہ کیا اور پوچھا:

''سب خیریت تو ہے؟''

کلرک نے جواب دیا، ''انشاءاللہ سب خیریت ہے۔''

عمدہ نے کھنکھار کر اپنا گلا صاف کیا، عطر میں بسے ہوئے رومال میں تھوکا اور ادھر اُدھر نظر دوڑائی۔ میں نے اٹھ کر دیوان خانے کے اندر اور باہر کی طرف کھلنے والے دونوں دروازے بند کر دیے۔ واپس آ کر میں نے عمدہ کے بالکل مقابل کی کرسی سنبھال لی۔ میں نے اس کی پوری بات خاموشی سے سنی، جبکہ کلرک اپنے وجود کا احساس دلانے کے لیے بیچ بیچ میں لقمے دیتا اور عمدہ کی کہی ہوئی کسی بات کی تصحیح اور کسی کی تشریح کرتا رہا۔ صورت حال بالکل واضح تھی۔ یہ ایک دشوار کام تھا۔ میں سوچنے لگا کہ میری عام تدبیروں میں سے کوئی کارگر ثابت ہو سکے گی یا نہیں۔ عمدہ کا مسئلہ مختصراً یہ تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو لازمی فوجی خدمت کے لیے نہیں بھیجنا چاہتا تھا۔ اگر وہ اس کے اسباب کی تفصیل میں جانے سے گریز کر رہا تھا تو اس کی مرضی۔ لوگوں کے اپنے اپنے راز ہوتے ہیں، اور ان کا پتا وہ اپنے بھائیوں کو بھی نہیں چلنے دیتے۔ انسان دراصل رازوں کی گٹھری کے سوا ہوتا بھی کیا ہے۔ میرے پاس چند عام تدبیریں تھیں۔ میں نے بتایا کہ ایسی صورت حال میں کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دے سکتا ہے تاکہ اس کا بیٹا اپنی ماں کے تنہا سہارے کے طور پر لام بندی سے استثنیٰ پا سکے۔ مجھے سخت تعجب ہوا جب عمدہ نے ایسی کسی تجویز کی شدید مخالفت کی۔ حالانکہ اس کی سب سے چھوٹی بیوی سے اس کا یہی اکلوتا بیٹا تھا، جس کے باعث یہ بہترین حل تھا۔ لیکن عمدہ نے ہاتھ اٹھا کر قطعی لہجے میں کہا:

''یہ ناممکن ہے۔''

میں نے اس حل کے حق میں دلیل دینے کی کوشش کی لیکن اس نے میری بات کاٹ دی۔ اس نے کہا کہ مجھے اس بات پر وقت ضائع کرنے کے بجائے جسے وہ ہرگز نہیں مان سکتا، کوئی اور تدبیر ڈھونڈنی ہو گی۔ میں دوسری طرف دیکھنے لگا۔ یہ شخص ایک گاؤں کا عمدہ تھا اور عام روایتی تدبیریں، یعنی لڑکے کی

Scanned with CamScanner

ایک انگلی کاٹ ڈالنا یا اس کی ایک آنکھ میں تیزاب ڈال دینا، یہاں کارگر نہیں ہو سکتی تھیں۔ میں سخت الجھن میں تھا۔ سارے دروازے بند نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کیا کسی ایک دروازے کو ذرا سا کھلا چھوڑا جا سکتا ہے؟ میں نے کہا کہ مجھے غور کرنے کے لیے کچھ مہلت درکار ہے، لیکن وہ اپنی مشکل کا کوئی حل تلاش کرنے کی بے صبری میں تھا اور اس وقت تک وہاں سے سرکنے کا ارادہ نہ رکھتا تھا جب تک میں کوئی راستہ نہ نکال لوں۔ میں نے کہا کہ مجھے کچھ اور لوگوں سے مشورہ کرنا ہوگا۔ اس نے جواب دیا کہ مجھے خرچ کی کوئی فکر نہیں کرنی چاہیے، کیونکہ اس کے پاس بہت دولت ہے۔ مالدار لوگ شروع میں ایسی ہی باتیں بناتے ہیں، لیکن جب سچ مچ ادائیگی کرنے کا وقت آتا ہے تو بالکل یوں معلوم ہوتا ہے جیسے دوپہر کے وقت تارے نکل آئے ہوں۔ میں نے اسے بتایا کہ یہ کام آسان نہیں ہے اور اس میں بہت دشواریاں پیش آئیں گی۔ جس پر اس نے کہا کہ اسے یقین ہے میرے لیے یہ معمولی سا کام ہے۔ میرے گھر سے رخصت ہوتے ہوئے وہ میرے بالکل پاس آ کھڑا ہوا اور گھبراہٹ میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا کہ مجھے بے حد احتیاط کرنی ہوگی۔ آج کل کچھ بھی ہو سکتا ہے، اور تمام تر ہوشیاری کے باوجود کوئی تدبیر غلط ہو سکتی ہے۔ مجھے جان لینا چاہیے کہ یہ ایک نہایت نازک کام ہے اور ذرا سی بھول معاملے کو بگاڑ سکتی ہے۔ اس کے جانے کے بعد میرے ذہن میں وہ سب کچھ گھومنے لگا جو میرے ساتھ پیش آیا تھا۔ میرا خیال ہے عمدہ نے آپ کو پہلے ہی بتا دیا ہے کہ کس طرح مجھے اپنی اسکول کی ملازمت سے ہاتھ دھونے پڑے۔ میں اس کا شکر گذار ہوں کہ اس نے مجھے ان واقعات کی تکرار کرنے سے بچا لیا۔ یہ ایک یاس انگیز کہانی ہے اور اس کا بوجھ میرے سینے پر پہاڑوں کی طرح دھرا ہوا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کس طرح کہوں۔ مجھے کسی کام سے خوشی اور تسکین نہیں ملتی۔ میں سرزمین مصر کے دوسرے ہزاروں افراد کی طرح پرائمری اسکول کا استاد تھا، لیکن اب یہ حال ہے کہ میرے سابق شاگرد راستے میں مجھے دیکھتے ہی نظریں پھیر لیتے ہیں۔ واقعی مجھے اب یاد بھی نہیں رہا کہ یہ سب کہاں سے شروع ہوا تھا۔ میری ایک بہن ہے جس کا شوہر اس وقت فوت ہو گیا تھا جب وہ بہت کم عمر تھی اور اس کا ایک بیٹا تھا۔ وہ بیوہ ہو گئی، جسے ہمارے علاقے میں 'ہجالہ' کہتے ہیں، اور اس کا میرے سوا کوئی نہ تھا۔ اس کے شوہر نے اس کے لیے چند فدان زمین چھوڑی تھی، لیکن اس سے اس کے دوسری شادی کے امکانات بہت پیچیدہ ہو گئے، کیونکہ ہمیں اس کے ہر خواستگار پر شبہ ہونے لگتا کہ وہ محض زمین

Scanned with CamScanner

حاصل کرنے کے لالچ میں اس سے شادی کرنا چاہ رہا ہے۔ چنانچہ اس کی دوسری شادی نہ ہوسکی۔ وقت بے حد سرعت سے گزر گیا اور اس کا بیٹا لازمی فوجی خدمت کی عمر کو پہنچ گیا۔ اپنی بیوہ ماں کے تنہا سہارے کے طور پر اسے قانونی استثنیٰ حاصل تھا، اور ضلعی انتظامیہ کے افسروں نے کہا کہ ہمیں اسکندریہ کے بھرتی دفتر سے استثنیٰ نامہ حاصل کرنا ہوگا۔ آپ اس پر جتنا چاہیں ہنسیں، لیکن میں حسرت سے سوچتا ہوں کہ کاش ہم اس دن اسکندریہ نہ گئے ہوتے۔ وہ میری زندگی کا نحس ترین دن تھا۔ مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے: دسمبر کا مہینہ تھا اور گاؤں میں اتنی سخت سردی تھی کہ انگلیاں ٹھٹھری جاتی تھیں، لیکن اسکندریہ میں موسم خوشگوار اور قدرے گرم تھا۔ میں ایک ایسے حق کا مطالبہ کرنے جا رہا تھا جو دوپہر کے سورج کی طرح واضح تھا، لیکن میں ایک ایسے گڑھے میں گر پڑا جس کی کوئی تھاہ نہ تھی؛ اسے سرکاری افسر شاہی کہا جاتا ہے، جو ایک ایسا جال ہے جو دن رات شکار کا منتظر رہتا ہے۔ ہم ایک افسر سے ملے جو ہمارے جوار کا رہنے والا تھا۔ اس کے کندھے پر عقاب کی شکل کا بلاّ تھا اور اس نے بتایا کہ وہ رضاکار کے طور پر فوج میں بھرتی ہوا تھا اور ترقی پاتے پاتے میجر کے عہدے پر جا پہنچا ہے۔ ایک دہقان دوسرے دہقان کو اس کی بو سے پہچان لیتا ہے، خواہ یہاں سے چین تک چلے جائیں، اور جب اس افسر نے مجھے دروازے کے باہر بات کرتے سنا تو باہر نکل کر پوچھا کہ میں کون سے گاؤں کا رہنے والا ہوں۔ اس نے کہا کہ اسے میری بولی اور لہجے سے رہٹ اور کھیتوں اور غلہ چھڑنے کے آلات کا خیال آتا ہے۔ کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد ہم اس کے گھر چلے گئے جہاں اس نے مجھے یقین دلایا کہ مجھے اپنے کام کے سلسلے میں کوئی دقت نہیں ہوگی اور مجھ سے پانچ پاؤنڈ طلب کیے۔ اس نے بتایا کہ یہ رقم فوجی کیمپ کے لوگوں میں بانٹنے کے لیے ہے، اور اگر اس میں سے ایک پائی بھی وہ اپنے پاس رکھے تو اس کی بیوی پر طلاق وارد ہو جائے۔ میں نے اس کی مانگی ہوئی رقم اسے دے دی اور میں دو راتیں اس کے گھر گزار کر اپنے بھانجے کے ساتھ واپس گاؤں آ گیا۔ اس کے پاس تمام ضروری کاغذات تھے۔ افسر نے مجھ سے کہا تھا کہ جب کبھی میرے گاؤں یا جوار کے کسی اور گاؤں کے کسی شخص کو کوئی ضرورت پڑے تو میں بلا تکلف اس کے گھر یا دفتر چلا آؤں اور وہ میری مدد کرے گا۔ وہ بڑی عمر کا تھا اور چند ماہ میں ریٹائر ہونے والا تھا، اور میرا خیال ہے اسی وجہ سے وہ خطرے مول لینے کو تیار تھا۔ جلد ہی گاؤں کے سب لوگوں کو یہ قصہ معلوم ہو گیا۔ سب کہنے لگے کہ میں اپنے بھانجے کو لے کر

Scanned with CamScanner

اسکندریہ گیا اور چند روز کے اندر اندر استثنیٰ نامہ حاصل کر کے گاؤں لوٹ بھی آیا۔ یہ لام بندی کا معاملہ ہر گھر میں اٹھتا ہے، اور ہر شخص اس سے بچنے کا کوئی نہ کوئی طریقہ ڈھونڈ رہا ہوتا ہے۔ بہت سے گاؤں والے میرے پاس پہنچنے لگے اور میں خود کو ہر تیسری سہ پہر اسکندریہ جانے والی ٹرین پر سوار پانے لگا، یہاں تک کہ میری یہ مصروفیت اتنی بڑھ گئی کہ میں نے وہاں ایک فلیٹ کرائے پر لے لیا اور وہاں شادی بھی کر لی۔ میری دوسری بیوی گوری رنگت والی ایسی شہری عورت تھی جس کی پرورش خوشحالی کے دنوں میں ہوئی تھی۔ کام اچھا چل رہا تھا۔ افسر روز اپنا معجزہ دکھا دیتا۔ بے شک میں جانتا تھا کہ زیادہ تر کام بہت معمولی نوعیت کے ہوتے تھے جنھیں نمٹانے میں افسر کو اپنی انگلی تک نہ ہلانی پڑتی، لیکن وہ بہر حال یہی قصے سنایا کرتا کہ اس کی گزر بسر کتنی مشکلوں سے ہوتی ہے اور ہر چیز کس قدر مہنگی ہو گئی ہے، وغیرہ۔ وہ کہتا کہ اب لوگوں سے کام نکلوانا نہایت دشوار ہو گیا ہے۔ رفتہ رفتہ ہمارا کاروبار اتنا بڑھ گیا کہ ضلعی انتظامیہ کے بہت سے اہلکار بھی اس میں شامل ہو گئے۔ لوگوں کو میری سرگرمیوں کے بارے میں پتا چل گیا۔ حکام کے پاس شکایتیں پہنچنے لگیں اور میری گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو گئے۔ میرے اسکندریہ کے فلیٹ پر چھاپہ پڑا اور مجھے یہ بتاتے ہوئے شرم آتی ہے کہ مجھے پاجامہ پہنے پہنے وہاں سے بھاگ کر گاؤں آنا پڑا۔ تحقیقات شروع ہوئی۔ تفتیش، کاغذوں کی پڑتال، پوچھ گچھ۔ ایک تفتیش کار مقرر کیا گیا، تحقیقاتی ادارہ اور سراغ رساں بھی معاملے میں شامل ہو گئے۔ میں گرفتار ہوا، پھر ضمانت پر رہا تو ہو گیا لیکن ملازمت سے معطل کر دیا گیا۔ میرے پاس کوئی ذریعۂ معاش نہ رہا۔ میں نے ان لوگوں سے مدد مانگی جن پر میرے احسان تھے۔ یہ درست ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میں نے بہت پیسہ کمایا تھا لیکن بچا کر کچھ نہ رکھا۔ میں خود سے کہا کرتا کہ اللہ نے دیا تھا، اُسی نے واپس لے لیا۔ میں نے ایک مشہور وکیل کیا لیکن میری اسکندریہ والی بیوی نے میرے خلاف گواہی دی۔ اس نے کہا کہ وہ میری سرگرمیوں سے ناخوش تھی۔ میں نے اسے طلاق دینے کا ارادہ کیا لیکن لوگوں نے مجھے بتایا کہ اس سے کچھ فائدہ نہ ہو گا؛ وہ مجھے عدالتوں سے گھسیٹتی پھرے گی اور مجھے عدالتی اخراجات کے علاوہ مجھے اس کا مہر اور نان نفقہ بھی ادا کرنا ہو گا۔ میری مشکلیں پہلے ہی بہت تھیں، میں نے ان میں اضافہ کرنے کے بجائے اس معاملے کو شادی اور طلاق کے درمیان ہی لٹکا رہنے دیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ میرا ہر جگہ پیچھا کرے گی، لیکن کئی ماہ تک مجھے اس کی کوئی خبر نہ ملی۔ جب میں نے چھان بین کی تو

Scanned with CamScanner

معلوم ہوا کہ اس نے مجھ سے شادی ختم کیے بغیر کسی دوسرے شخص سے شادی کر لی ہے۔ یہ اچھی خبر تھی کیونکہ اب میں نے سوچا کہ میں اسے جیل خانے پہنچوا سکوں گا، لیکن جب میں اس کی تلاش میں نکلا تو وہ مجھے نہ ملی۔ لگتا تھا اسے زمین نگل گئی ہے۔ ہر جگہ کی خاک چھاننے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ جس شخص سے اس نے شادی کی ہے وہ لیبیا میں کام کرتا ہے اور وہ اس کے پاس وہیں چلی گئی ہے۔ میں یہ بتانا بھول گیا کہ میرے جوار سے تعلق رکھنے والا افسر ایک چھانٹی میں ملازمت سے نکال دیا گیا تھا اور اِدھر مجھے بھی جبری طور پر ریٹائر کر دیا گیا تھا۔ لیکن میرے کاغذات میرے خلاف استعمال کیے جانے کے لیے قبضے میں نہیں لیے گئے تھے۔ نہ میں نے اقبالِ جرم کیا تھا اور نہ استغاثے کی طرف سے کوئی گواہ سامنے آیا تھا، سوائے میری بیوی کے جو اَب یہاں موجود نہ تھی۔ ہر ایک نے مجھے یقین دلایا کہ میں چھوٹ جاؤں گا، لیکن عدالت میں کہا گیا کہ مقدمے کا سیاسی پہلو بھی ہے کیونکہ یہ معاملہ وطن کے دفاع سے تعلق رکھتا ہے۔ نئی نسل یعنی مستقبل کے مصری شہریوں کی تعلیم وتربیت کا کام ایسے شخص کے سپرد کیونکر کیا جا سکتا ہے جو اسکول کے بعد کا وقت لوگوں کو اپنے ملک کے دفاع کے فرض سے پہلوتہی کے راستے بجھانے میں گزارتا ہو؟ میرے وکیل نے کہا، ''تمھیں اس لیے ملازمت سے فارغ کیا گیا ہے کہ قاعدہ قانون سب کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ اللہ سرزمینِ مصر پر رحم کرے! اگر قانون میں طاقت ہوتی تو تم بری ہو چکے ہوتے۔'' ان دنوں مجھے ذرا بھی اندازہ نہ تھا کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں اس کا تعلق سیاست یا انقلاب دشمنوں سے قوم کا دفاع کرنے کے معاملے سے بھی ہو سکتا ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں تو محض غریب اور مسکین لوگوں کی مشکلوں کا بوجھ کسی قدر کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو الف کے نام لٹھ تک نہیں جانتے۔ ہمارے گاؤں کے تین چوتھائی سے زیادہ لوگ ناخواندہ ہیں، اور میں ان کی پسماندگی کو کچھ کم کرنے کی کوشش میں تھا۔ میں ایمانداری سے سمجھتا تھا کہ میں حب الوطنی کا کام کر رہا ہوں، بالکل تعلقاتِ عامہ کے ان اداروں کی طرح کا کام جو یوروپ اور امریکہ میں قائم ہیں۔ لوگ مجھے متعہد یا دلال کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ میں نہیں جانتا مجھے یہ نام کس نے دیا، لیکن میں اسے اپنی توہین بھی نہیں سمجھتا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میری کوششوں کے نتیجے میں لوگوں کو خوشی حاصل ہوتی ہے یا تکلیف۔ اہم بات یہ ہے کہ میرا اصل نام گم ہو گیا؛ گھل کر غائب ہو گیا اور اس کی جگہ اگر کچھ باقی رہ گیا تو صرف 'آفندی' اور 'استاذ' کے القاب۔ بعض لوگ مجھے ''استاذ متعہد'' کہتے ہیں اور بعض 'متعہد

آفندی"۔اس سے میں اپنے بارے میں سوچ میں پڑ جاتا ہوں — جو ایک سابق مدرس اور اس باب کے راوی کی حیثیت سے میرا حق ہے۔ لفظ 'معتمد' کی اصل جو مادّہ ہے اس کے معنی ہوتے ہیں کسی شے کو تحویل میں لینا یا کسی کام کا بیڑا اٹھانا۔ اور میں نے جو کام اپنے ذمے لیا وہ ان لوگوں کی فلاح و بہبود کا تھا جو نہیں جانتے تھے کہ اس سلسلے میں عملی قدم کیونکر اٹھائیں، یا سرکاری دفتروں کی بھول بھلیوں میں راستہ کیسے تلاش کریں۔ میں وہ دلال ہوں جو بندھی ہوئی گرہیں کھولتا ہے، اور جب میں ان مشکلوں کو حل کر لیتا ہوں جنھوں نے بے بس لوگوں کو الجھن یا حزن یا خوف میں ڈال رکھا تھا تو خود کو ایسا ہی عظیم خیال کرتا ہوں جیسے ہمارے لوک سورما، مثلاً زناتی خلیفہ یا اُدہم شرقاوی۔ اُدہم شرقاوی سے میری مناسبت یوں بھی ہے کہ وہ میرے دادا کا قرابت دار تھا۔ ان سورماؤں میں اور مجھ میں فرق محض اتنا ہے کہ وہ تلوار اور بندوق استعمال کرتے تھے اور میں عقل، حاضر دماغی اور غور وفکر سے کام لے کر مشکل ترین گرہیں کھولتا ہوں۔ میری پوری کہانی بیان کرنے کے لیے دفتر لکھے جانے چاہیے تھے اور مغنیوں کو رباب کی دھن پر میرے بارے میں اُن سہانی چاندنی راتوں میں نغمے گانے چاہیے تھے جو اب سرزمین مصر سے کبھی نہ لوٹنے کے لیے ناپید ہو گئی ہیں۔ میں نے بہت کچھ حاصل کیا ہے اور زندگی میں میری سب سے بڑی طمانیت یہ رہی ہے کہ میں لوگوں کے لیے کچھ کرنے کے قابل ہوں۔ مجھے اب احساس ہوتا ہے کہ اگر میں نے لوگوں کی یہ خدمت نہ کی ہوتی تو میرے زندہ رہنے کا کوئی جواز نہ ہوتا۔ میں نے جو کچھ کیا ہے وہ آپ کو صاف صاف بتا رہا ہوں، کچھ بھی چھپائے بغیر۔ میں ایسے لوگوں کے شناختی کاغذات مہیا کر سکتا ہوں جو کبھی پیدا نہیں ہوے، ایسے مردوں عورتوں کی آپس شادیاں کرا سکتا ہوں جنھوں نے کبھی ایک دوسرے کا ذکر تک نہ سنا ہو، ایسی زمینیں فروخت کر سکتا ہوں جو دوسری دنیا کے سوا کہیں وجود نہیں رکھتیں، کھیتوں کی حدیں تبدیل کر سکتا ہوں اور لوگوں سے ایسی دستاویزات پر دستخط کرا سکتا ہوں جن کی بابت انھیں گمان تک نہ ہو کہ ان میں کیا تحریر ہے۔ میں بہت سے کام کرتا ہوں، لیکن جو کام مجھے سب سے زیادہ پسند ہے اس کا تعلق فوجی خدمت اور اس سے وابستہ قریب اور بعید کے معاملات سے ہے۔ جب کبھی میں کوئی کام مکمل کرتا ہوں، میرا ارادہ یہی ہوتا ہے کہ یہ آخری کام ہوگا، لیکن اس کے پورا ہوتے ہی میں کسی اور کام میں الجھ جاتا ہوں۔ اگرچہ ان کاموں میں درپیش خطروں کو دیکھتے ہوے میرے لیے یہ کہنا مشکل ہوتا ہے کہ یہ اگلا کام پورا ہو سکے گا یا نہیں۔ لیکن میں

Scanned with CamScanner

آپ سے یہ سب کیوں کہہ رہا ہوں؟ میرا خیال ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ میں رونا چاہتا ہوں۔ مجھے اپنے آپ پر افسوس ہو رہا ہے اور میں آپ کو اس افسوس میں شریک کرنا چاہتا ہوں۔ بہر حال، اب یہ مصیبت ختم ہو چکی ہے۔ چند مہینے پہلے میرے جوار کے گاؤں کا رہنے والا افسر، جس سے اس سلسلے کا آغاز ہوا تھا، مجھ سے ملنے آیا۔ وہ اب اپنے رشتے داروں کے ساتھ رہتا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ مجھے ایک نئے قانون کے نفاذ پر مبارک باد دینے آیا ہے جس کے تحت ہر ایسے شخص کو جسے تادیبی کارروائی کے تقاضے پورے کیے بغیر نوکری سے نکال دیا گیا ہو، بحال کر دیا جائے گا۔ اس نے تجویز پیش کی کہ ہمیں ایک مشترکہ درخواست دائر کرنی چاہیے، کیونکہ ہم دونوں پچھلی حکومت کے مظالم کا نشانہ بنے تھے۔ میں نے اسے صبر کرنے کو کہا اور بزرگوں کی کہی ہوئی بات یاد دلائی: عجلت میں بوؤ، فرصت میں پچھتاؤ۔ کیوں نہ ذرا انتظار کر کے دیکھا جائے کہ اس قسم کے معاملات پر کس طرح کے فیصلے ہو رہے ہیں، اور پھر اپیل دائر کی جائے۔ اس طرح ہمیں نتیجے کے بارے میں اطمینان ہو گا۔ حالات بہتر ہو گئے۔ ہمارا کام بھی پہلے کی نسبت بڑھ گیا، کیونکہ ہر شخص بے خوف ہو کر اپنی مرضی کے موافق کام کرنے لگا۔ اسکندریہ میں ایک مددگار دوست نے مشورہ دیا کہ ہمیں اپنے کام کے دائرے کو پھیلا لینا چاہیے کیونکہ ایسا موقع ہمیں شاید پھر نہ ملے۔ وادیِ نیل کی تاریخ میں پہلا موقع ہے جب مصریوں کو حقیقی آزادی ملی ہے۔ ہر مصری آزاد ہے کہ جو جی چاہے کرے۔ سفر کرنا چاہے تو سفر کرے، فرار ہونا چاہے تو فرار ہو جائے۔ ابوزید کے سامنے سب راستے کھلے ہیں اور ہر راستہ تمھیں تمھاری منزل تک پہنچا سکتا ہے، بشرطیکہ تمھاری جیب میں کافی رقم موجود ہو۔ اگر تمھاری جیب میں ایک پیسہ ہے تو تمھیں ایک پیسے کی مالیت کی چیز ہی ہاتھ آ سکتی ہے۔ میں جانتا ہوں آپ یہ تحریر یہ جاننے کے لیے پڑھ رہے ہیں کہ عمدہ کے معاملے کا کیا ہوا۔ میں معذرت چاہتا ہوں کہ اس کا ذکر چھوڑ کر آپ کو ایسے امور کے بارے میں بتانے لگا جن سے آپ کو غالباً کوئی دلچسپی نہیں ہو گی۔ لیکن میں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا تھا۔ مجھ پر دن رات ایسی فکریں مسلط رہتی ہیں جن کا بوجھ پہاڑ بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ چلیے اب عمدہ کے بیٹے کے معاملے پر واپس لوٹتے ہیں۔ عمدہ کے رخصت ہونے کے بعد میں بیٹھ کر اس کی کہی ہوئی بات پر غور کرنے لگا۔ اس نے بتایا تھا کہ اس کی زمینیں اسے لوٹائی جانے والی ہیں۔ اس خبر نے مجھے مسرور کر دیا تھا اور مجھے امید پیدا ہو گئی تھی کہ اب مجھے میری ملازمت بھی واپس مل جائے گی۔ میں نے

Scanned with CamScanner

طے کیا کہ جیسے ہی میں اپنی ملازمت پر بحال ہوا، یہ سب مشتبہ سرگرمیاں فوراً ترک کر دوں گا۔ میں نے یہ بھی عہد کیا کہ عمدہ کے بیٹے کا معاملہ دلال کے طور پر میرا آخری، اور سب سے زیادہ قابلِ فخر کارنامہ ہوگا۔

میں سیدھا ضلعی انتظامیہ کے دفتر پہنچا۔ بعض مشکلات کا حل پہلے ہی لمحے سے واضح ہوتا ہے، جبکہ بعض مسائل اتنے الجھے ہوئے ہوتے ہیں کہ ان کا سرا پانا دشوار ہوتا ہے۔ یہ معاملہ میرے لیے مانوس تھا۔ راستے میں بہت سے لوگوں سے میرا آمنا سامنا ہوا۔ اس وقت میری بابت لوگوں کے احساسات مبہم قسم کے تھے؛ اب ان کے انداز میں ویسی اتراہٹ نہیں جھلکتی تھی جیسی اس وقت جب مجھے ملازمت سے برطرف کیا گیا تھا، لیکن ان کی مشکلیں حل کرنے کے باوجود میں ان کی نظر میں کوئی ہیرو نہیں بنا تھا۔ کچھ کا کہنا تھا کہ میں ہیڈ ماسٹر کے عہدے تک پہنچ سکتا ہوں۔ انتظامیہ کے دفتر پہنچ کر میں سیدھا بھرتی افسر کے پاس گیا اور اس کے سامنے کھڑے ہو کر اسے آنکھ سے اشارہ کیا۔ پھر باہر نکل کر انتظار کرنے لگا۔ لیکن وہ باہر نہیں آیا۔ میں نے خیال کیا کہ شاید اس نے مجھے ٹھیک سے دیکھا نہیں ہے۔ میں دوبارہ اس کے کمرے میں گیا، اس بار اس نے مجھے دیکھ لیا اور میرے پیچھے پیچھے کمرے سے باہر نکل آیا۔ ہم دفتر کی عمارت کے پیچھے جا کر سفیدے کے ایک پیڑ کے نیچے بیٹھ گئے جو ان عمارتوں سے کہیں زیادہ پرانا تھا اور ایک چھوٹی سی نہر کے کنارے اگا ہوا تھا جو پاس کے کھیتوں کو سیراب کرتی تھی۔ افسر نے مجھ سے کہا کہ مجھے دیکھ کر اسے بے حد خوشی ہوئی ہے۔ ''خوش آمدید، استاذ!'' وہ بولا۔ اپنے لیے 'استاذ' کا لفظ سن کر میں خوش ہو گیا کیونکہ یہ ایک اور اچھا شگون تھا۔ ہم ایک دوسرے کے روبرو بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور مجھ سے سیدھے معاملے پر آنے کو کہا۔ جب تک میں اسے عمدہ کے بیٹے کے بارے میں بتاتا رہا وہ اوپر آسمان کو تکتا رہا لیکن منھ سے کچھ نہ بولا۔ آخرکار اٹھ کھڑا ہوا اور ماچس کی تیلی، جس سے وہ اپنے دانت کریدتا رہا تھا، زمین پر پھینک دی۔ وہ مسکرایا، پھر اس کی مسکراہٹ باقاعدہ ہنسی میں بدل گئی، اور پھر ہمیشہ کی طرح کہنے لگا کہ یہ بڑا مشکل کام ہے اور یہ کہ اس میں ہم دونوں پکڑے بھی جا سکتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ میں اس کی بات سنتا رہا اور پھر میں نے وہی کچھ کہا جو وہ سننا چاہتا تھا، یعنی یہ کہ وہ اتنا ہوشیار ہے کہ اس کے لیے کسی بھی مشکل سے نمٹنا نہایت آسان ہے۔ میں جانتا تھا کہ یہ ذہنوں کی لڑائی ہے اور یہ کہ وہ زیادہ سے زیادہ

Scanned with CamScanner

رقم اینٹھنے کے لیے فضا تیار کر رہا ہے۔ میں نے اس کے لالچ پر داؤ لگانے کا فیصلہ کیا اور ترغیب دینے کے لیے کہا، ''ایسا سودا زندگی میں ایک آدھ بار ہی آتا ہے۔'' ہم دونوں اپنے اپنے مورچے میں ڈٹے ہوئے تھے۔ پھر اس کا چہرہ ڈھیلا پڑ گیا اور لمحہ بھر کی ہچکچاہٹ کے بعد وہ زمین پر بیٹھ گیا۔ اب چوہے اور بلی کا کھیل شروع ہوا۔ وہ اپنے دل کی بات — یعنی مطلوبہ رقم — ظاہر کیے بغیر معاملے پر ادھر اُدھر کے رخ سے بات کرتا رہا۔ ''تو پھر معاملے کی بات ہو جائے،'' میں نے کہا۔ وہ کہنے لگا کہ اسے ڈر ہے کہ اس قصے میں بہت سے لوگ شامل ہو جائیں گے اور یہ بہت پھیل جائے گا۔ اسے اسکندریہ یا قاہرہ کو شامل کیے بغیر ضلعے کی سطح پر ہی نمٹا لیا جانا چاہیے۔ جہاں تک عملی اقدامات کا تعلق ہے، ان میں سے آدھے ضلعی انتظامیہ کے کرنے کے ہیں اور آدھے خود عمدہ کے کرنے کے۔ یہ حیرت انگیز بات تھی۔ میں نے اس پر کچھ کہنے کو منہ کھولا، لیکن میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس نے مجھے روک دیا۔ ''سرکاری اہلکار صرف میں ہوں،'' وہ بولا۔ اس نے بتایا کہ بھرتی افسر کے طور پر وہ بالکل فائرنگ کی زد میں ہے اور اس کا عہدہ ایسا ہے کہ کسی بھی شک شبہے کی صورت میں وہی سب سے پہلے نشانہ بنے گا۔ اگر کشتی ڈوبی تو اسے چھوڑ کر اور سب لوگ ہاتھ پیر مار کر کنارے پر جا پہنچیں گے، اس لیے کشتی تیار کرنے کا کام وہ خود اپنے ہاتھ میں رکھے گا۔ اس نے زور دے کر کہا کہ مجھے ہر کام اس کے توسط سے کرنا ہوگا۔ یہ تو درست تھا کہ مجھے معاملے کے مرکز سے باہر رہ کر کام کرنا تھا، لیکن خود کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دینے کی کوئی تک نہ تھی۔ جہاں تک رقم کا سوال ہے، اس نے کہا، ابھی اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ میں اس سے یقین دہانی چاہتا تھا کہ کام بن جائے گا، باقی معاملات بعد میں طے کیے جا سکتے تھے۔ وہ اتنے قریب آ گیا کہ مجھے اس کا سانس اپنے چہرے سے ٹکراتا محسوس ہوا۔ بولا، ''شرائط پہلے ہی سے طے کر لینا بہتر ہوتا ہے، اس لیے معاملے کی بات ہو جائے۔'' پھر وہ ان چوروں کے بارے میں بات کرنے لگا جو لوٹ کے مال کی تقسیم پر جھگڑتے ہوئے پکڑے گئے تھے۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا کہوں۔ مجھے یہ سب کچھ بہت پیچیدہ معلوم ہو رہا تھا اور شروع ہی سے میرے دل میں شکوک جنم لینے لگے تھے۔ پھر میں نے اس کی آواز سنی، ''میں تمھیں اڑتالیس گھنٹے میں جواب دوں گا۔'' میں یہ بات سن کر خوش ہوا اور اس سے دو دن بعد دوبارہ ملنے کا وعدہ کر لیا۔ پھر میں وہاں سے روانہ ہو کر اپنے راستے پر چلنے لگا اور چلتے چلتے اس وقت کے دن سپنے دیکھنے لگا جب مجھے اللہ کے کرم سے

Scanned with CamScanner

ملازمت پر بحال کر دیا جائے گا اور وہ مجھے میرے اس قابل نفرت کام کے لیے معاف کر دے گا۔
جب مَیں کوئی کام اپنے ہاتھ میں لیتا ہوں تو میری تمام زندگی ایک دوڑ بن کر رہ جاتی ہے، جس میں خوف اور قانون کا بھاری ہاتھ میرا تعاقب کر رہا ہوتا ہے۔ لیکن جونہی کام تکمیل کو پہنچتا ہے، نہ جانے کہاں سے ہزاروں لوگ نکل کر سامنے آ جاتے ہیں اور دعوے کرنے لگتے ہیں کہ انھوں نے اس کام میں میری مدد کی تھی اور اپنا حصہ طلب کرنے لگتے ہیں۔ اور پھر وہ لوگ ہیں جو بلیک میل کرتے ہیں۔ کہتے ہیں، ہمارا قومی مفاد خطرے میں ہے، اور حب الوطنی کا تقاضا ہے کہ اس امر کی اطلاع حکام بالا کو پہنچائی جائے۔ میں جواب میں کہتا ہوں، ٹھیک ہے، تمھیں بھی خاموش رہنے کا معاوضہ مل جائے گا۔ ہوتے ہوتے میرے ہاتھ میں محض چند سکے رہ جاتے ہیں، اور رقم ملتی بھی ہے تو لمبے لمبے وقفوں سے، اور جب ملتی ہے تو ان قرضوں کی ادائیگی تک کے لیے ناکافی ہوتی ہے جو میں نے لے رکھے ہیں۔ روزانہ کا خوف، اپنے کیے ہوئے کو چھپائے رکھنے کی کوشش، جیل کا خطرہ، اور ذلت کا اندیشہ اس سب کے علاوہ ہے۔ اپنی حد تک تو میں یہ سب کچھ برداشت کر بھی لوں، مگر میرے بچوں نے کیا خطا کی ہے؟

اگر میں آپ سے کہوں کہ مجھے اپنے مجرم ہونے کا احساس ہوتا رہتا ہے تو آپ ہنسیں گے اور کہیں گے کہ میں آپ کے دل میں اپنے لیے ترس پیدا کرنے کی کوشش میں ہوں۔ لیکن میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر میں آج کل اس قدر محتاج نہ ہوتا تو ہرگز اس قسم کا کام ہاتھ میں نہ لیتا۔ علاوہ اس کے، میرے کام کا آدھا حصہ تو غریب، بے کس لوگوں کے حق کے لیے کوشش کرنے پر مشتمل ہے۔ یہ درست ہے کہ عمدہ کا بیٹا کسی ناانصافی کا شکار نہیں ہوا تھا، اور مجھے اس کام کے بارے میں سوچ کر کوئی خوشی محسوس نہیں ہوتی، لیکن مجھے رقم کی سخت ضرورت تھی۔ عمدہ کے بیٹے کا فرض ہے کہ اپنی لازمی فوجی خدمت انجام دے۔ اگر میرے اپنے بیٹے کا معاملہ ہوتا تو میں اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے بھرتی کے دفتر خود لے کر جاتا، اور اسے وہاں چھوڑ کر اس فخر کے احساس کے ساتھ گھر لوٹتا کہ وہ اپنے وطن کی خدمت کر رہا ہے۔

عمدہ میرے پاس برے وقت میں آیا، جب ہمارے پاس کھانے تک کو کچھ نہ تھا۔ آپ میں سے کسی کو بھی اس کہاوت کے اصل معنی کا احساس نہیں ہو سکتا کہ الجوع کافر (بھوک ایمان کو زائل کر دیتی ہے) — خاص طور پر اگر آپ کسی جدید فلیٹ میں آرام کرسی پر دراز یہ تحریر پڑھ رہے ہیں، آپ کا پیٹ بھرا ہوا ہے، اور پُرخوری کا نشہ آپ کی آنکھوں پر چھایا ہوا ہے۔ اچھے، پُرتعیش کھانے سے

Scanned with CamScanner

ویسا ہی نشہ ہوتا ہے جیسا شراب سے، اس لیے جب میں یہ کہاوت دہراؤں گا تو آپ مجھ پر یقین نہیں کریں گے کہ بھوک آدمی کے ایمان کو زائل کر دیتی ہے۔ لیکن جب آپ میری آواز کے دائرے سے باہر ہوں گے، تب میں یہ بات خود سے دوبارہ کہوں گا۔ اور میں ایک بات اَور واضح کر دوں: مجھے اپنی پنشن سے بھی محروم ہونا پڑا کیونکہ مجھے ملازمت سے برطرف کیا گیا تھا۔

خیر، عمدہ کے بیٹے کے قصے کو آگے بڑھاتے ہیں۔ جب میں بھرتی افسر سے ضلعی انتظامیہ کے دفتر کے عقب میں مقررہ وقت پر دوبارہ ملا تو وہ مجھے بہتر ذہنی کیفیت میں دکھائی دیا۔ اس نے مجھے سگریٹ پیش کیا اور ہنس کر بولا کہ پچھلے دو دن وہ عمدہ کے بیٹے ہی کے بارے میں سوچتا رہا ہے۔ یہ آسان کام نہیں ہے، لیکن میری خاطر اور ان غریبوں کی خاطر جو مصیبت پڑنے پر ہمارا گھیراؤ کر لیتے ہیں، وہ جو کچھ ضروری ہوگا کرنے کو تیار ہے۔ عمدہ کے بیٹے کو اپنی فوجی خدمت انجام نہیں دینی پڑے گی، لیکن اس کے لیے ہمیں سول رجسٹری کے دفتر کے کسی شخص کا تعاون درکار ہوگا، اور محکمۂ صحت کے متعلقہ افسر کا، اور اس محکمے کے بعض لوگوں کا جن کی رسائی سرکاری مُہر تک ہوتی ہے— وہاں کے دو اہلکاروں اور ان کے افسرِ بالا کو ملانا پڑے گا۔ مجھے یہ سب سن کر فکر ہونے لگی کہ اگر اتنے سارے لوگ معاملے میں ملوث ہوں گے تو میرے لیے چند سکے بھی مشکل سے بچیں گے۔ میں نے اس سے کہا کہ کیوں نہ ہم براہِ راست معاملے کی بات کر لیں۔ اس نے احتیاط سے اپنے اردگرد دیکھا اور تجویز پیش کی کہ ہمیں دفتر کی عمارت سے کچھ دور چلے جانا چاہیے۔ میرا ہاتھ پکڑ کر وہ مجھے دیوار سے دور لے گیا۔ بولا، ''دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔'' ہم دونوں ایک حوض کے کنارے جا بیٹھے جہاں ہمارے اردگرد سبز پتوں کی مہک تھی۔ پھر بھرتی افسر نے بات شروع کی۔ بولا، کسی بھی دو نقطوں کا مختصر ترین فاصلہ ایک خطِ مستقیم ہوتا ہے۔ عمدہ کے بیٹے کے مسئلے کا بھی ایک نہایت سادہ حل ہے، اور کسی عمدہ کے لیے اس کا انتظام کرنا بالکل مشکل نہیں ہونا چاہیے۔

''کیا حل ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''تعجیل کارِ شیطان ہے،'' وہ سکون سے بولا۔

بات واقعی نہایت سادہ تھی۔ عزت مآب بھرتی افسر اپنے تجویز کردہ حل کی وضاحت کرنے لگا جس کی سب سے اہم خصوصیت یہ تھی کہ یہ بالکل بے عیب تھا۔ ہم دونوں اٹھ کر میرے گھر کی طرف

Scanned with CamScanner

چل پڑے۔ وہاں پہنچ کر اس نے کاغذ قلم مانگا اور پھر الف سے یے تک منصوبے کا پورا خاکہ کھینچا۔ منصوبے کے مختلف اجزا کے اس نے الگ الگ عنوان قائم کیے: اول، عمل درآمد کے مراحل؛ دوم، منصوبے کے شرکا؛ سوم، اخراجات۔ یہ سب ایک مختصر عمومی خاکہ تھا۔ بھرتی افسر کے جانے کے بعد میں اس کے بنائے ہوئے خاکے کو ہاتھ میں لیے بیٹھا رہا اور انجانے ہی میں — فراغت لوگوں سے عجیب عجیب کام کراتی ہے — میں نے قلم اٹھا کر لکھنا شروع کر دیا۔ یہ پورا منصوبہ مجھے بالکل سیدھا سادہ معلوم ہو رہا تھا اور میں نے اپنے کاہل ذہن کو برسوں بعد استعمال ہوتا ہوا پایا۔ میں اس کام میں بالکل غرق ہو گیا۔ چند گھنٹوں میں میرے سامنے کاغذوں کا ایک پلندا جمع ہو گیا جس میں تمام کاموں کی تفصیل لکھی ہوئی موجود تھی، اور وہ بھی نہایت اچھے خط میں۔ ان کاغذوں میں پورا تفصیلی منصوبہ موجود تھا، اور اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں اسے جوں کا توں یہاں پیش کر دوں تاکہ آپ بھی گواہی دے سکیں کہ مصر کے ایک فرزند میں کس قدر صلاحیتیں پائی جاتی ہیں، اور یہ میری خطا نہیں کہ ان صلاحیتوں سے یہ ملک فائدہ نہیں اٹھاتا۔

•

ا۔ عمل درآمد کے مراحل:

عمل درآمد کا ہر مرحلہ کئی اقدامات پر مشتمل ایک مکمل اکائی ہوتا ہے، اور یہ تمام اقدامات ایسی خاص ترتیب میں کیے جانے ہوتے ہیں کہ ایک اقدام کی کامیاب تکمیل اگلے اقدام کی راہ ہموار کرتی ہے، بالکل اسی طرح جیسے ایک انکشاف دوسری دریافتوں کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ ایک مرحلے اور دوسرے مرحلے کے درمیان نامیاتی ربط ہوتا ہے، اور ہر اگلا مرحلہ پچھلے مرحلے کو تکمیل کی طرف لے جاتا ہے۔ ایک مرحلہ ایک سے زیادہ اقدامات پر مشتمل ہو سکتا ہے اور پورے منصوبے کی بحفاظت تکمیل اس کے اجزا کی کامیاب انجام دہی پر منحصر ہوتی ہے۔

مرحلۂ اول، بعنوان ''عیوضی'': جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے، اس مرحلے کا تعلق اس شخص سے ہے جسے عمدہ کے بیٹے کی جگہ فوج میں بھرتی ہونا ہے۔ اس مرحلے کی ابتدا ان خصوصیات سے ہوتی ہے جن کا اس شخص میں ہونا ضروری ہے، اور اختتام اس نقطے پر ہوتا ہے جب عیوضی اپنا طے کردہ کردار ادا کرنے کے لیے پوری طرح تیار ہو چکا ہو۔ عیوضی کے لیے مندرجہ ذیل شرائط پوری کرنا لازمی ہے:

Scanned with CamScanner

۱۔ وہ عمدہ کے بیٹے کے طور پر فوج میں بھرتی ہونے پر آمادہ ہو، نہ کہ محض اس کے متبادل کے طور پر۔

۲۔ وہ اسی گاؤں میں ٹھیک اُسی دن پیدا ہوا ہو جس گاؤں میں اور جس دن عمدہ کا بیٹا پیدا ہوا تھا۔

۳۔ اسے فوجی بھرتی سے استثنیٰ حاصل ہو، تاکہ اس کے اپنے نام سے فوجی خدمت انجام دینے کی نوبت نہ آئے جس سے تمام راز فاش ہو جانے کا خطرہ ہے۔

۴۔ وہ ایسے تمام کاغذات اور دستاویزات ہمارے حوالے کرنے پر آمادہ ہو جن سے اس کے وجود کی شہادت ملتی ہو۔ مثلاً اس کا شناختی کارڈ، لام بندی کا کارڈ، انتخابی رائے دہندگی کا کارڈ اور ذاتی اور آمد و رفت کے اجازت نامے۔ یہ تمام کاغذات احتیاط سے کسی تجوری میں ہمارے یا عمدہ کے پاس رکھے رہنے چاہئیں۔

۵۔ عیوضی کے لیے مناسب یہ ہے کہ وہ نہ تو بہت سے افراد والے خاندان سے تعلق رکھتا ہو اور نہ کسی ایسے خاندان سے وابستہ کسی چھوٹے خاندان سے۔ عمدہ یا اس کے کسی متعلقہ شخص کے ساتھ اس کا کوئی مشترکہ مفاد وابستہ نہ ہو۔ ہمیں اس بات کا پورا اطمینان کرنا ہوگا کہ اس شخص کا ضلع بھر میں عمدہ کے کسی دشمن سے کسی طرح کا تعلق نہ ہو۔

۶۔ ہمیں عیوضی کے نام پر جاری کردہ موت کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنا ہوگا جس میں بتایا گیا ہو کہ اس کی موت فطری اسباب سے واقع ہوئی، ترجیحاً کسی ایسی بیماری سے جو اسے سچ مچ لاحق رہی ہو اور جس کا علم پورے گاؤں کو ہو۔ علاوہ ازیں، چونکہ ضلعی انتظامیہ کے محکمۂ صحت میں کسی اہلکار کا تعاون ہمیں واجبی معاوضے پر حاصل ہو جائے گا، اس لیے ہمیں محض ایک سیدھے سادے موت کے سرٹیفکیٹ پر اکتفا کرنے کی ضرورت نہیں؛ محکمۂ صحت کا اہلکار اپنی سرکاری حیثیت میں اس شخص کی موت کے حالات بھی بیان کرے گا۔ اس بیان میں اس مفہوم کے الفاظ شامل ہوں گے کہ عیوضی اچانک بیمار پڑ گیا، اور چونکہ گاؤں میں کوئی ڈاکٹر موجود نہیں تھا اس لیے اسے ضلعی اسپتال لے جایا گیا، جہاں اس کی موت ہو گئی۔ متعدی مرض کا شبہ ہونے کے باعث لاش کا پوسٹ مارٹم کیا گیا، جس کے بعد، مستقبل میں دوبارہ معائنہ ہونے کی صورت میں سادہ لوح گاؤں والوں کے جذبات کو پہنچنے والے صدمے کے اندیشے سے، اسے اسپتال کے نزدیک ہی دفنا دیا گیا۔ اس کے خاندان کو اس کی موت سے باخبر رکھا جانا ضروری سمجھا گیا تاکہ بلاوجہ افواہیں جنم نہ لیں جو ہمارے پیارے مصر کے لیے، جو دشمنوں میں

گھرا ہوا ہے، نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہیں۔

۷۔ عیوضی کے باپ کو طلب کر کے اس سے اس رقم کی رسید حاصل کی جائے گی جو ہم اسے ادا کریں گے، اس کے علاوہ اس سے پرامیسری نوٹ پر بھی دستخط کرائے جائیں گے۔ ہمیں اس کے نام جاری کردہ بھاری رقموں کے جعلی چیک بھی تیار کرانے ہوں گے جنھیں مستقبل میں اس کے خلاف استعمال کیا جا سکے۔ اس طرح اس کے بیٹے کے فوجی خدمت مکمل کرنے تک اس کی خاموشی یقینی ہو جائے گی اور اس بات کی ضمانت حاصل ہو گی کہ راز فاش ہو جانے کی صورت میں وہ ہمارے حق میں گواہی دے۔

۸۔ ہمیں عیوضی کو اس بات سے آگاہ کرنا ہو گا کہ اب وہ عمدہ کا بیٹا ہے اور یہ کہ ہر قسم کے شبہات سے دور رہنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس کے مطابق برتاؤ کرے۔ اس کے لیے ہمیں اس کو عمدہ کے خاندان کی تاریخ، اس کی املاک کی تفصیل اور اس کے مددگاروں کے ناموں سے واقف کرانا ہو گا، اور اسے ان خاندانی رازوں میں بھی شریک کرنا ہو گا جو صرف عمدہ کو معلوم ہیں۔

مرحلۂ دوم، بعنوان "اصل"۔ اس مرحلے کے تمام اقدامات اور عملی طریقوں کا تعلق عمدہ کے بیٹے سے ہے۔ اسے گاؤں چھوڑ دینا ہو گا اور کسی بھی قسم کے تعلیمی ادارے سے اپنا تعلق منقطع کرنا ہو گا، کیونکہ ضلعے یا صوبے کے کسی بھی مقام پر اس کا ظاہر ہونا منصوبے کا راز کھلنے کا سبب بن سکتا ہے۔ عیوضی کے بھرتی ہونے کے وقت سے سرکاری طور پر اصل شخص فوج میں شامل ہو چکا ہو گا، اور عام طور پر بھی لوگ اسی بات پر یقین کریں گے۔ اس کے لیے پلاسٹک سرجری کی مدد سے اپنے خدوخال تبدیل کرا لینا بہتر ہو گا، تاکہ کسی اتفاقیہ ملاقات میں اسے پہچان نہ لیا جائے۔ سب سے محفوظ راستہ یہ ہو گا کہ وہ کوئی فرضی نام اختیار کر کے ملک سے باہر چلا جائے، لیکن اگر عمدہ یہ بات ماننے سے انکار کر دے تو اسے مصر ہی میں کسی مقام پر چھپا دینا ضروری ہو گا۔

مرحلۂ سوم: اس مرحلے کا کوئی عنوان نہیں ہے، کیونکہ یہ دراصل پہلے اور دوسرے مرحلے کے باہمی تعامل پر مبنی ہے۔ دراصل اس مرحلے کا تعلق پورے کام کو عملی روپ دینے سے ہے، اور اس مرحلے کے آنے کا مطلب یہ ہو گا کہ معاملے کے دونوں فریق اپنے اپنے کردار اور ضروری احتیاطی تدابیر کو اچھی طرح جان چکے ہیں تاکہ صرف مجموعی منصوبے پر احتیاط سے عمل کرنے کا کام باقی رہ

Scanned with CamScanner

جائے۔ اس موقعے پر ایک شناختی کارڈ جاری کیا جائے گا جس پر عمدہ کے بیٹے کا پورا نام لکھا ہوگا اور عیوضی کی تصویر لگی ہوگی۔ عیوضی اس شناختی کارڈ کو ضلعی انتظامیہ کے پاس لے جا کر اپنے طلبی کے کاغذات اور سفر کا فارم حاصل کرے گا، اور پھر اسکندریہ کے بھرتی دفتر میں خود کو عمدہ کے بیٹے کی حیثیت سے پیش کر دے گا۔

ایک شخص کے نام اور دوسرے شخص کی تصویر اور انگلیوں کے نشانات والا یہ مرکب شناختی کارڈ ضلعی انتظامیہ کے سول رجسٹری دفتر کا سربراہ جاری کرے گا، اور منصوبے کی کامیابی بڑی حد تک اسی کارڈ کے اجرا پر منحصر ہوگی۔ اس کے بعد متعلقہ سفری انتظامات کی نگرانی کا کام باقی رہ جائے گا۔ عیوضی ضلع اسکندریہ میں جائے گا جہاں ہمیں پہلے چند روز اس پر کڑی نگاہ رکھنی ہوگی؛ ہمیں اس بات کا یقین کرنا لازمی ہوگا کہ اس کا طرزِ عمل اپنی ہر تفصیل میں پوری طرح موزوں ہے، کیونکہ کوئی بھی غلطی پورے منصوبے کو افشا کر دے گی۔ دریں اثنا عمدہ کے بیٹے کو جس قدر ممکن ہو دور بھیجنا ہوگا، اور اس بات کا یقین کرنا ہوگا کہ وہ کسی برادری کا رکن نہ بنے، کسی تعلیمی ادارے میں داخل نہ ہو اور کسی تجارتی سودے میں شرکت نہ کرے۔ یہ صورت حال اس وقت تک برقرار رکھنی ہوگی جب تک کہ فوجی خدمت کا عرصہ حفاظت سے پورا نہیں ہو جاتا۔

مرحلۂ چہارم: فی الحال چوتھا مرحلہ صرف امکانات پر مشتمل ہے — اصل طریق کار اس وقت تک واضح نہیں ہو سکتا جب تک کھیل اپنے نقطۂ عروج تک نہ پہنچ جائے۔ اس فیصلہ کن، خطرناک لمحے میں جب ریفری سیٹی بجا کر کھیل کے پورا ہونے کا اعلان کرے گا، ہم ایک نئے مرحلے میں داخل ہو چکے ہوں گے — جسے، کھیل کے قواعد کے مطابق، مخالفت کی ازسرِنو تنظیم کا نام دیا جاتا ہے۔ اس موقعے پر عمدہ کے بیٹے کو ایک ایسے باعزت شہری کے طور پر گاؤں میں واپس آنا ہوگا جو اپنی فوجی خدمت انجام دے چکا ہے: اس کے پاس ایک سند کا ہونا ضروری ہوگا جس میں اس کے ایک اچھے مصری ہونے کا اعلان ہو جو اپنے پیارے وطن کے لیے اپنا فرض پورا کر چکا ہے: اور اس کے گلے میں درجنوں تمغے اور اعزاز ہونے چاہئیں جو اس نے اپنی فوجی خدمت کے عرصے میں حاصل کیے ہوں۔

جہاں تک عیوضی کا تعلق ہے، اسے وہ تمام دستاویزات واپس مل جائیں گی جو ہماری اس دنیا میں اس کے وجود کا ثبوت ہیں (جو فوجی خدمت کے پورے عرصے میں ہماری تحویل میں رہی تھیں)۔

Scanned with CamScanner

اس کے بعد اس کے سامنے تین راستے ہوں گے۔ پہلا یہ کہ ایک ایسے شخص کی حیثیت سے گاؤں میں لوٹ آئے جو ٹھیک اسی عرصے میں رضا کارانہ طور پر فوج میں بھرتی ہوا تھا جب اصل شخص نے اپنی لازمی فوجی خدمت شروع کی۔ لیکن فوج کی زندگی کی دشواریاں دیکھ کر اس نے اپنی پوری زندگی وردی میں نہ گزارنے کا فیصلہ کیا اور نئی میعاد کے معاہدے پر دستخط نہ کیے۔ افسر بننے کے امکان پر شخصی آزادی کو مقدم جانتے ہوئے، اس نے مصری دیہات کی پکار کا جواب دیا جہاں امن، سکون اور انسانی حرارت موجود ہے۔

اس کے سامنے دوسرا راستہ یہ ہوگا کہ ملک سے باہر چلا جائے، جس صورت میں ہم اسے تمام سہولتیں مہیا کریں گے۔

تیسرا راستہ یہ ہوگا کہ فوجی خدمت سے فارغ ہونے والے کسی بھی شخص کی طرح کوئی روزگار تلاش کر لے۔ اسے صرف یہ کرنا ہوگا کہ اپنے فوجی یونٹ کو اپنی سکونت کا غلط پتا فراہم کرے اور یوں کسی دوسرے قصبے میں تعیناتی کروالے۔ لیکن اس میں ایک ذرا سا مسئلہ درپیش ہوگا — اس کی تقرری عمدہ کے بیٹے کے نام سے ہوگی۔ عیوضی یہ ملازمت کیونکر شروع کر سکے گا جبکہ وہ اپنی سابقہ شناخت کو دوبارہ اختیار کرنے والا ہوگا؟ درحقیقت اس کا حل بہت سادہ ہے۔ یا تو عمدہ کا بیٹا ایک ایسے شخص کے حق میں ملازمت سے استعفیٰ دے دے گا جس کو اس کی زیادہ ضرورت ہے اور جو متواتر اس کے پیچھے لگا ہوا ہے — اس طرح ملازمت سرکاری طور پر عیوضی کے پاس آ جائے گی — یا پھر ہم اس کا بندوبست کرلیں گے کہ تقرری عیوضی کے اپنے نام سے ہو۔ اس طرح دونوں فریق خیریت سے اپنے گھر لوٹ آئیں گے اور یوں پورا معاملہ خوشگوار طور پر انجام کو پہنچے گا۔

(ب) منصوبے کے شرکا:

۱۔ دلال۔

۲۔ بھرتی افسر۔

۳۔ بھرتی افسر کا نائب۔

۴۔ ضلعی انتظامیہ کے سول رجسٹری دفتر کا سربراہ۔

Scanned with CamScanner

۵۔ سول رجسٹری دفتر کا متعلقہ اہلکار جو شناختی کارڈ کے اجرا کا ذمے دار ہے۔

۶۔ وہ پولیس افسر جو شناختی کارڈ کے درخواست گذاروں کی انگلیوں کے نشانات لینے کا ذمے دار ہے۔

۷۔ محکمہ صحت کا اہلکار جو درخواست گذاروں کے خون کا گروپ معلوم کرنے کا ذمے دار ہے۔

۸۔ ضلعی دفتر صحت کا اہلکار جو موت کا تصدیق نامہ اور تدفین کا اجازت نامہ جاری کرتا ہے۔

۹۔ فوج کا اردلی جو بھرتی ہونے والوں کو ضلعی صدر مقام سے اسکندریہ کے بھرتی زون لے جانے اور وہاں حکام کے سپرد کرنے کا ذمے دار ہے۔

۱۰۔ ایک رابطہ افسر جو بھرتی کے بعد کے ابتدائی دنوں میں عیوضی کی نگرانی کرے گا۔ یہ شخص عیوضی کے روزانہ رابطے میں رہے گا اور اس سے تفصیلی معلومات حاصل کرے گا کہ معاملات کیسے چل رہے ہیں اور اسے ہر موقعے پر اختیار کیے جانے والے طرز عمل کے بارے میں ہدایات فراہم کرے گا۔ بھرتی زون میں آنے جانے کی سہولت کے لحاظ سے، بہتر یہ ہوگا کہ خود بھرتی افسر یہ اہم ذمے داری سنبھال لے۔

۱۱۔ ایک نگران جو عمدہ کے بیٹے پر نگاہ رکھے گا اور اس بات کا یقین کرے گا کہ جس وقت عیوضی فوجی خدمت انجام دے رہا ہو، وہ اپنے کردار کے بارے میں تمام ہدایات پر عمل کرتا رہے۔

(ج) منصوبے کے اخراجات:

۱۔ ۱۰۰ (ایک سو) پاؤنڈ اس شناختی کارڈ کے اجرا کے لیے جس پر عیوضی کی تصویر اور عمدہ کے بیٹے کا نام ہوگا۔

۲۔ ۱۵۰ (ایک سو پچاس) پاؤنڈ عیوضی کے نام کا موت کا تصدیق نامہ حاصل کرنے کے لیے جس پر فوجی خدمت کے لیے بھرتی ہونے سے پہلے کی تاریخ پڑی ہو اور موت کے تفصیلی حالات بھی درج ہوں۔

۳۔ ۲۰ (بیس) پاؤنڈ اس اہلکار کو ادا کرنے کے لیے جو شناختی کارڈ اور لام بندی کارڈ کے لیے عیوضی کی انگلیوں کے نشان حاصل کرے گا۔

Scanned with CamScanner

۴۔ ۴۵ (پینتالیس) پاؤنڈ اس اردلی کے لیے جو اسکندریہ تک کے سفر میں بھرتی ہونے والوں کو اپنی تحویل میں رکھتا ہے۔ یہ کام انتہائی اہم ہے کیونکہ یہی اردلی وہ پہلا شخص ہوگا جو عمدہ کے بیٹے کے طور پر عیوضی سے معاملہ کرے گا۔

۵۔ ۶۰ (ساٹھ) پاؤنڈ ایک دوست کے لیے جو اسکندریہ کے بھرتی زون میں ملازم ہے۔ یہ شخص بھرتی کے بعد کے ابتدائی دنوں میں عیوضی کی نگرانی میں مدد دے گا۔ وہ عیوضی کو اخلاقی مدد اور مناسب طرزِ عمل کے بارے میں ہدایات فراہم کرے گا، اور اگر ایسی کوئی بات پیش آئے جس سے منصوبے کے افشا کا خطرہ ہو تو ہمیں خبردار بھی کرے گا۔ وہ عیوضی سے رابطے کے لیے ہمارا براہ راست ذریعہ ہوگا۔

۶۔ ۳۰۰ (تین سو) پاؤنڈ بھرتی افسر کے لیے، کیونکہ وہ خطرے کا براہِ راست سامنا کرے گا۔

۷۔ ۳۰۰ (تین سو) پاؤنڈ دلال کے لیے، جو پورے منصوبے کا ہدایت کار ہے اور عمدہ سے براہِ راست رابطے میں ہے۔

تبصرے:

۱۔ عیوضی اور اس کے خاندان کو ادا کی جانے والی کوئی رقم مندرجہ بالا اخراجات میں شامل نہیں ہے کیونکہ ایسی کسی رقم کا موجودہ معاہدے سے کوئی تعلق نہیں۔ عمدہ پر یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ اس نوجوان کو تلاش کرنا اس کی ذمے داری ہے جسے عیوضی کے طور پر منتخب کیا جانا ہے۔

۲۔ عمدہ کا بیٹا، عیوضی کے فوجی خدمت کے زمانے کے دوران احتیاط کے پیشِ نظر جو وقت گاؤں سے دور گزارے گا اس کے دوران ہونے والے اس کے تمام اخراجات عمدہ کے ذمے ہوں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس بات کی کوئی ضمانت نہیں کہ لازمی فوجی خدمت کا قانون کتنے برس نافذ رہے گا۔

۴۔ مندرجہ بالا اخراجات میں وہ اخراجات شامل نہیں ہیں جو منصوبے کے دوران سفر اور قیام سے متعلق ہوں گے۔

(یہاں یادداشت مکمل ہوئی۔)

Scanned with CamScanner

بھرتی افسر نے مجھے شروع ہی میں بتا دیا تھا کہ یہ خاصا تفصیلی عمل ہوگا۔ پہلے مجھے خیال ہوا کہ وہ یہ بات مجھے جھانسا دینے کی غرض سے کہہ رہا ہے، لیکن اب مجھے معاملے کے تمام پہلوؤں کا علم ہو گیا۔ بھرتی افسر نے اپنی طرف سے سارے انتظامات کر لیے تھے اور اب شعلوں کی آنچ چربی تک پہنچنے لگی تھی۔ باقی معاملے کا انحصار عمدہ اور مجھ پر تھا۔

اگلے روز میں اپنے طور پر عمدہ سے ملنے گیا۔ میں اس کی سکونت گاہ جانتا تھا اور جھیل کے پاس گاڑی سے اتر کر اس کے مکان کی طرف چل پڑا۔ راستے میں جان پہچان کے لوگ مجھ سے سلام دعا کرتے رہے۔ گاؤں کے کئی نوجوانوں سے میرا آمنا سامنا ہوا اور میں بڑی خاص احتیاط سے ان کے چہروں کا جائزہ لیتا اور یہ سوچتا رہا کہ عیوضی کے طور پر ان میں سے کون چنا جائے گا اور کس کو ضلعی انتظامیہ میں حاضر ہونا ہوگا کہ اسے عمدہ کے بیٹے کی حیثیت سے فوجی خدمت انجام دینے کے لیے بھیج دیا جائے۔

عمدہ نے مجھے اپنے دوار میں بلوایا جہاں وہ بیٹھا اپنے لوگوں کے مختلف قضیوں اور معاملوں کا فیصلہ کرنے میں مصروف تھا۔ مجھے اس کے ڈھیلے مصافحے اور نیم دلانہ خیر مقدمی کلمات پر تعجب ہوا، لیکن جلد ہی اس نے ایک چوکیدار کو اشارہ کیا کہ مجھے اندر مکان میں لے جائے، اور اپنے ساتھ اس آدمی کے مودبانہ سلوک سے مجھے اندازہ ہوگیا کہ عمدہ کے مکان میں داخل ہونا ایک غیر معمولی اعزاز ہے۔ جب عمدہ اندر میرے پاس آیا تو وہ ایک مختلف شخص تھا۔ اس نے مجھ سے معانقہ کیا، رخساروں پر بوسہ دیا اور دوار میں اپنے سرد مہری کے برتاؤ کے لیے معذرت کی۔ اسے مجبوراً ایسا طرز عمل اختیار کرنا پڑا، اس نے مجھے بتایا، تاکہ ان سب لوگوں کے سامنے توجہ کا مرکز نہ بن جائے۔

ہم کافی دیر باتیں کرتے رہے اور جب میں نے اپنے تیار کیے ہوئے منصوبے کے طور پر اس کی تفصیلات بتانی شروع کیں تو وہ غور سے سنتا رہا۔ اس کا ردعمل خالص حیرت کا تھا، اور وہ دیر تک کمرے کی دیوار میں چھت کے قریب بنی ہوئی چھوٹی سی کھڑکی سے دکھائی دیتے آسمان پر نگاہ جمائے خیالوں میں کھویا رہا۔ آخرکار اس نے کہا کہ کیسی مضحکہ خیز بات ہے کہ میں آج کل بے روزگار ہوں، اور پھر اپنی پُرگوشت انگلی میری طرف اٹھا کر بولا کہ اگر بیشتر باصلاحیت مصریوں کو ملک کو ترقی دینے سے روکا جاتا رہا تو یہ ملک اسی طرح غیر ترقی یافتہ رہے گا۔ اصل بات یہ ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار ہے وہ عقلمند افراد اور اچھے خاندانوں کے فرزندوں سے خوف زدہ ہیں۔ مجھے بے روزگار رکھنے کی

Scanned with CamScanner

سازش کسی بھی طرح مصر کو نفع نہیں پہنچا سکتی۔

اس نے کہا کہ وہ اس منصوبے سے مجموعی طور پر خوش ہے اگر چہ اس کے کچھ تحفظات بھی ہیں۔ پہلا یہ کہ عیوضی کے باپ کو تحریری ضمانت کا پابند کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ اس کی طرف سے ہم سے غداری کا کوئی خطرہ نہیں، اور بہر کیف وہ اس منصوبے کے لیے اپنے بیٹے کی خدمات مفت میں تو پیش نہیں کرے گا۔ علاوہ ازیں، وہ بہت سے اہم اور دیرپا مفادات میں ایک دوسرے سے بندھے ہوئے ہیں۔ دوسرا اس کے بیٹے کے بیرون ملک جانے کا سوال تھا؛ وہ اس تجویز کے خلاف تھا اور بڑی دیر اس نکتے پر بحث کرتا رہا۔ اس نے کہا کہ وہ صاف گوئی سے کام لے گا۔ وہ لڑکے کو اکیلے کہیں دور نہیں بھیج سکتا کیونکہ اس کی ماں ایک لمحے کے لیے بھی اسے اپنی نظروں سے دور کرنے کی روادار نہیں۔ وہ اپنی ماں کا اکلوتا بچہ ہے، اور نجی خاندانی اسباب سے، جن کی تفصیل میں وہ نہیں جا سکتا، اکلوتا ہی رہے گا۔ اگر لڑکے کو اتنی دور جانا پڑا تو اس کی ماں بھی اس کے ساتھ جانے پر اصرار کرے گی جس کا مطلب ہوگا کہ اسے ایک اجنبی مقام پر گھر بسانا ہوگا — اور بہت سی وجوہ ہیں، نفسیاتی، مادی اور اخلاقی، جن کی بنا پر وہ ایسا کرنے میں دشواری محسوس کرتا ہے۔ ہم بہت دیر تک اس موضوع پر بات کرتے رہے اور اپنی اپنی بات پر اڑے رہے: میرے دلائل منصوبے کی کامیابی کے امکان پر اور اس کے دلائل جذبات پر بنیاد رکھتے تھے۔ آخر کار میں نے اسے اپنی تجویز پر قائل کر لیا اور وہ لڑکے کو اس کی ماں کے ساتھ کہیں دور بھیجنے پر رضامند ہو گیا۔ طے ہوا کہ اگلے روز، یا زیادہ سے زیادہ دو دن میں، وہ عیوضی کو اس کے باپ کے ساتھ میرے پاس بھیجے گا اور پھر منصوبے پر عمل درآمد کی کارروائی شروع ہو جائے گی۔

آخر میں ہماری گفتگو سب سے اہم نکتے، یعنی پیسے کے معاملے پر پہنچی۔ یہ بات مناسب ہوگی، عمدہ نے کہا، کہ میں سب کام اپنے ہاتھ میں لے لوں اور وہ منصوبے کی تکمیل پر مجھے یک مشت ادائیگی کر دے۔ بلاشبہ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ کسی قسم کی ضمانت چاہتا ہے۔ یہ سب لوگ یہی رخ اختیار کرتے ہیں۔ ''ہم کیسے یقین کر لیں کہ منصوبہ کامیاب ہوگا؟'' وہ سوال کرتے ہیں۔ ''تم مجھ سے ابھی کے ابھی ساری رقم ادا کرنے کی کیسے توقع رکھتے ہو؟ کام شروع کرو، اور جب پورا ہو جائے گا تو میں پوری رقم بلکہ اس سے بھی زیادہ تمھیں ادا کر دوں گا۔''

دیگر معاملات میں، خاص طور پر جب کام چھوٹا ہو، اس قسم کی بات خاصی معقول معلوم ہو سکتی

Scanned with CamScanner

تھی، لیکن یہ معاملہ ایسا تھا کہ اس میں قدم قدم پر رقم خرچ کرنے کی ضرورت پڑتی تھی؛ بہت سارے لوگ منصوبے میں شریک تھے اور ان میں کوئی اس وقت تک انگلی ہلانے کو تیار نہ ہوتا جب تک اس کی مٹھی گرم نہ کر دی جاتی۔ میں نے عمدہ کو یہ سب باتیں تفصیل سے سمجھائیں، لیکن مجھے صاف دکھ ئی دے رہا تھا کہ وہ اب بھی متذبذب ہے، چنانچہ میں نے اس سے صاف کہہ دیا کہ جب تک کم سے کم ابتدائی مراحل کے لیے درکار رقم ہاتھ میں نہ ہوگی، کام شروع نہیں ہو سکے گا۔

اس نے شکایت کی کہ منصوبہ بہت مہنگا ہے، خاص طور پر اس لحاظ سے کہ کچھ اہم کام ایسے ہیں جو خود اسے انجام دینے ہوں گے، مثلاً عیوضی کی تلاش۔ ''تم لوگوں میں سے کسی کو اندازہ نہیں ہے کہ اس پر میرا کتنا پیسہ خرچ ہوگا،'' اس نے گلہ کیا۔ اور پھر اسے اپنے بیٹے کے لیے کسی دور دراز جگہ پر گھر کا بندوبست بھی کرنا ہوگا۔

بات چیت کسی نتیجے پر پہنچے بغیر ختم ہوگئی اور اس نے مجھ سے کام شروع ہونے سے پہلے دو دن کی مہلت مانگی تاکہ اچھی طرح سوچ بچار کر سکے۔ ایسی صورت میں، میں نے مضبوط لہجے میں کہا، عیوضی کو فی الحال میرے پاس بھیجنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ پیسے کے بغیر کوئی کام شروع نہیں ہوگا۔

میں اس قدر طیش کے عالم میں تھا کہ میرا جی چاہتا تھا اپنے سامنے بیٹھے ہوئے اس ناقابلِ فہم شخص کو قتل کر دوں، لیکن جب خادم دوپہر کے کھانے کی سینی لے کر کمرے میں داخل ہوا تو عمدہ کا پورا برتاؤ ہی بدل گیا اور اس نے بہترین میزبان کا انداز اختیار کر لیا: کشادہ دل، متواضع اور خلیق۔ لوگ، خصوصاً دیہی مصر کے لوگ، بے پناہ غیر معمولی ہو سکتے ہیں۔ ''ہم ایک ہی گھر کے فرد ہیں،'' کھانا کھاتے ہوئے اس نے کہا، ''میں بہت عرصے سے محسوس کر رہا ہوں کہ ہمارے درمیان ایک خاص قسم کی یگانگت موجود ہے۔''

اس نے مجھ سے منصوبے پر عمل کرنے والوں کے بجائے اس کا طرفدار رہنے کی درخواست کی؛ اگر میں اخراجات میں کمی کر سکوں، وہ بولا، تو وہ بچائے ہوئے ہر پاؤنڈ پر مجھے کمیشن ادا کرے گا۔ میں نے ہامی بھر لی، میں اس خیال سے خوش تھا کہ منصوبہ اب شروع ہو چکا ہے اور یہ جانتے ہوئے رخصت ہوا کہ دو چار دن میں ہم پھر ملیں گے۔

Scanned with CamScanner

— ۳ —
چوکیدار

ہمارے گاؤں میں ایک کہاوت ہے: ''سر پر دو چار ہاتھ پڑ جائیں تو ایسا درد اٹھتا ہے کہ آدمی داہنے اور بائیں میں فرق کرنا بھول جاتا ہے۔'' یہ بات اچھے دنوں میں کہی جاتی تھی؛ اب تو آدھا ہاتھ ہی پڑ جائے، یا ہلکی سی چپت ہی، تو آدمی اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل نہیں رہتا۔ اب یہی دیکھ لیں کہ آج میرے ساتھ کیا ہوا۔

پہلے میں بتادوں کہ میں ہوں کون۔ سوچتا ہوں اب میرے حصے کی کہانی سنانے کا وقت آ گیا ہے جو میرے دل میں دفن ہے اور میرے ساتھ قبر میں جائے گی — ویسے میں یہ بھی اچھی طرح جانتا ہوں کہ ہم غریبوں کو کیسی تنگ قبریں نصیب ہوتی ہیں۔

اگر مجھے ٹھیک سے یاد ہے تو یہ قصہ دروازے پر ہونے والی ایک دستک سے شروع ہوا تھا — بالکل ایسی معمولی دستک جیسی رات میں ہزار بار سنائی دیتی ہے۔ غریب لوگ سورج ڈوبتے ہی کھوجتی آنکھوں سے حفاظت کے خیال سے اپنے دروازوں کی چٹخنیاں لگا لیتے ہیں، کیونکہ ان کے پاس ملنے یا کسی کام سے آنے والا تو کوئی ہوتا نہیں۔ جب دستک ہوئی تو اس وقت رات کا پہلا پہر تھا اور میں عمدہ کے دوار اور توشہ خانے کی چوکیداری کا کام چھوڑ کر کھانا کھانے ابھی ابھی گھر لوٹا تھا۔ لوگ اس وقت جاگ ہی رہے ہوتے ہیں، اس لیے اچھا خاصا شور ہوتا ہے، اور دکانوں اور گھروں کی روشنیوں سے آدمی کو ڈھارس کا احساس ہوتا ہے، اور رات کو نکلنے والے بھی دور رہتے ہیں۔

ابھی میں نے پہلا ہی نوالہ منہ میں رکھا تھا لیکن وہ اتنا سوکھا تھا کہ میرے گلے میں اٹک گیا اور میں اسے نگل نہ سکا۔ میں نے اشارے سے کھانے کی تپائی سامنے سے ہٹا لے جانے اور چائے

بنانے کو کہا، اور میری بیوی نے مجھے ایسی ساکت، طویل نگاہ سے دیکھا جیسے کسی گندے نالے کا ٹھہرا ہوا پانی جس میں برسوں سے کوئی ہلچل نہ ہوئی ہو۔ میں اس نگاہ کا مطلب جان گیا — گھر میں شکر ختم ہو چکی ہے۔ پھر وہ اٹھی اور پڑوس سے شکر ادھار لینے چلی گئی تا کہ اگلے مہینے کا راشن ملنے تک گزر ہو سکے۔ مجھے بہت غصہ آیا۔

دروازے پر ہونے والی دستک نے مجھے وہ ساری چوٹیں یاد دلا دیں جو میں نے پچھلے کچھ دنوں میں کھائی تھیں۔ میں پہلی چوٹ کے ذکر سے بات شروع کروں گا، جسے میں نے دانستہ وار سمجھا، حالانکہ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ ہونے والا ہے: مجھے نوکری سے فارغ کر دیا گیا۔ میں ریٹائر ہونے کی عمر تک باقاعدہ چوکیدار رہا تھا، اور تب مجھے ضلعی انتظامیہ کی طرف سے ایک چھوٹی سی چٹھی موصول ہوئی — بلکہ دو نقلیں — بالکل ہتھیلی کے برابر۔ ڈاک خانے کے منشی نے اپنی ربڑ کی مہر کو روشنائی میں بھگویا، ایک نقل ٹھپا لگا کر اپنے پاس رکھی اور دوسری مجھے تھما دی، جس میں لکھا تھا کہ پہلی تاریخ سے میں پنشن یافتہ ہو گیا ہوں۔ جو کچھ چل رہا تھا اس کا مجھے اچھی طرح پتا تھا کیونکہ پچھلے کچھ سالوں میں میرے کئی دوستوں کے ساتھ یہی ہوا تھا۔ اس طرح رات کے وقت باہر نکلنے اور پولیس تھانے کے باہر پہرہ دینے کا سلسلہ ختم ہو گیا؛ اور روز اپنی پیاری مانوس رائفل، دس گولیوں سمیت، حاصل کرنے کا، اور برف جیسی ٹھنڈی یا تنور جیسی دہکتی ہوئی راتوں میں اسے اپنے کندھے پر ٹانگ کر گلیوں اور کوچوں میں گشت کرنے کا، اور مکانوں کی چار دیواری کے باہر بنی پتھریلی بنچوں پر لیٹنے اور رات کی خاموشی اور تنہائی میں ''کون ہے!'' کی للکار لگانے کا سلسلہ بھی۔ میں سوچنے لگا کہ کیا کبھی کوئی مجھے ''شیخ الخفر'' یا چوکیداروں کا داروغہ کہہ کر پکارے گا!

میں رات اور دن زمین پر پڑی ہوئی مٹی سے مخاطب ہو کر اپنے کام کے سخت ہونے کی شکایتیں کیا کرتا تھا، لیکن اب جب انھوں نے مجھے فارغ کر دیا ہے تو اس کی یاد ستاتی ہے، اور میری آمدنی بھی اچانک گھٹ گئی ہے۔ مجھے جو سوا نو پاؤنڈ ملتے تھے وہ اب کم ہو کر پونے چار پاؤنڈ رہ گئے ہیں، اور اس سے سب کچھ بدل کر رہ گیا ہے: میرا معیارِ زندگی، میں کیا خرید سکتا ہوں اور کیا نہیں، اور لوگ میرے ساتھ کیسا سلوک کرتے ہیں — دکاندار نے اب مجھے ادھار سودا دینا بند کر دیا ہے۔ لیکن میرا صرف یہی نقصان نہیں ہوا۔ چوکیداروں کے موجودہ داروغہ کے فارغ یا برطرف ہونے یا چل

بسنے کی صورت میں میں، سب سے زیادہ عمر کا چوکیدار ہونے کی وجہ سے، داروغہ کے عہدے پر پہنچ سکتا تھا۔ اب خود کو بالکل مفلس اور بے مصرف محسوس کرتے ہوئے میں اپنا پورا دن اپنے کھیت پر گزارنے لگا، چاہے وہاں کوئی کام ہو یا نہ ہو۔ میں تو رات کو بھی وہیں سو جاتا، لیکن گھر اور کھیت کے لیے الگ الگ کھانا پکانا بہت مہنگا پڑتا تھا، اور پھر چائے اور ناشتہ بھی دوہرا تیار کرنا پڑتا۔ اس لیے چاہے مجھے کتنی بھی دیر ہو جاتی، کھانا میں گھر آ کر ہی کھاتا تھا۔

سردیوں کے ایک دن میں عمدہ کے دوار کے پاس سے گزر رہا تھا تو وہ خود باہر جاڑے کی دھوپ میں بیٹھا دکھائی دیا؛ سورج اس وقت ایسا شاندار لگ رہا تھا جیسے کوئی بے موسم کا انتہائی مہنگا پھل ہو۔ اس نے مجھے پاس بلا کر میرا حال پوچھا، بچوں کی خیریت پوچھی اور گھر کی حالت دریافت کی۔ اس پر جب میں نے حالات کی خرابی کی شکایت کی تو اس نے مجھے اپنے دوار، مویشیوں، توشہ خانے اور باغ کی چوکیداری پر رکھ لیا۔

"مگر یہ کام تو ٹیلیفون والے منشی کے ذمے ہے،" میں نے اعتراض کیا۔

"میں جانتا ہوں یہ کام ہمیشہ سے اسی کے ذمے ہے،" وہ بولا، "میرے پردادا کے دنوں سے اسی کے ذمے رہا ہے، لیکن اب وقت بدل گیا ہے۔ یہ سب کچھ اب عمدہ کی ذاتی ملکیت بنا دیا گیا ہے، اس لیے مجھے خود اپنے خرچ پر چوکیدار رکھنا ہوگا۔"

اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے ایک نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی —— وہ ان منافق مصاحبوں میں سے ایک تھا جن کا کام اس کی کہی ہوئی ہر بات کی تائید طوطے کی طرح کرنے اور گاؤں میں پیش آنے والی ہر کارروائی میں اس کی طرف سے حصہ لینے کے سوا کچھ نہ تھا۔ "عمدہ صاحب تمھاری مدد کرنا چاہ رہے ہیں،" وہ بولا۔ "اور ان کی شرافت اور وضع داری ہے کہ وہ تمھیں خیرات دے کر تمھاری تذلیل نہیں کرنا چاہتے۔ ان کی جائیداد گاؤں کی حدود میں پڑتی ہے، اور قانون کے مطابق اس کی رکھوالی پولیس تھانے کے چوکیدار کی خاص ذمے داری ہے۔ عمدہ صاحب حکومت کے نمائندے ہیں اس لیے ان کے مفاد کی حفاظت حکومت کے مفاد کی حفاظت ہے۔" مصاحب کا خیال تھا کہ اپنی طرف مدد کے لیے اٹھے ہوئے ہاتھ کو چومنا میرا فرض ہے۔

—… اگلے دن سے میں نے اپنا نیا کام سنبھال لیا۔ پہلے بھی میں عمدہ کے گھر کے لیے اجنبی نہ تھا،

Scanned with CamScanner

لیکن اب میری حیثیت اس کی ذاتی جائیداد کی رکھوالی کرنے والے چوکیدار کی تھی۔ اجرت کے سلسلے میں ہمارے درمیان کوئی بات چیت نہیں ہوئی تھی ـــــ بس میں نے عمدہ کے حکم پر کام شروع کر دیا تھا ـــــ لیکن اس کی سب سے چھوٹی بیوی نے جو مہربانی اور دریادلی دکھائی اس سے اس کی تلافی ہوگئی۔ وہ مجھے ناشتے اور کھانے کی سینی بھجواتی، اور چائے اور کبھی کبھی تمباکو بھی۔ ہم جس کڑے وقت سے گزر رہے تھے اس میں اتنا بھی تسلی کے لیے بہت تھا۔

اُس رات عمدہ کی بیوی نے مجھے کھانا نہیں بھجوایا، اور جب میں نے اس کے بارے میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ بیمار ہے۔ میں نے اس کی شفایابی کے لیے دعا کی، اور کھانا کھانے کے لیے گھر پہنچ کر مجھے خیال آیا کہ شاید دراصل وہ بیمار نہیں بلکہ کسی بات پر فکرمند ہے۔ پچھلے کچھ دنوں میں اس کی رنگت اتنی پیلی پڑ گئی تھی کہ وہ ہم غریب لوگوں جیسی دکھائی دینے لگی تھی۔ اس کی نظریں اِدھر اُدھر بھٹکا کرتیں اور اس کی کھانسی بند نہ ہوتی تھی۔ وہ دن بدن، جیسا کہ کہاوت ہے، گھلتی جارہی تھی، حالانکہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ معاملہ کیا ہے اور اس کے یوں گھلتے چلے جانے کی کیا وجہ ہے۔ ہمارے گاؤں کا قاعدہ ہے کہ ہم غریب لوگ اپنی دیواروں کے پیچھے چھپے رہتے ہیں اور امیروں کے رازوں سے کچھ مطلب نہیں رکھتے۔

دروازے پر ہونے والی دستک نے مجھے ان تمام دستکوں کی یاد دلادی جو میں نے پچھلے کچھ دنوں میں سنی تھیں۔ ان میں سے کچھ تو سر پر پڑنے والے ہتھوڑوں کی طرح تھیں ـــــ ان سے مجھے یوں لگا تھا جیسے میری زندگی کے دن پورے ہوگئے ہوں اور دل میں خواہش پیدا ہوئی تھی کہ موت آئے اور مجھے اس سے رہا کردے۔

میں نے عمدہ کے دوار سے آتی ہوئی جشن میں چلائی جانے والی گولیوں کی آوازیں سنی تھیں، اور ان سے مجھے خوشی محسوس ہوئی تھی، کیونکہ ہم گاؤں والے سمجھتے ہیں کہ ایک شخص کی خوشی سب کی خوشی ہے۔ مجھے گمان تک نہ ہوا تھا کہ مصیبت کے دن آنے کو ہیں اور یہ کہ ایک شخص کی خوشی دوسروں کے غم اور کرب کا سامان کرے گی۔ گولیاں چلنے کی آوازیں ایک مالدار آدمی کے گھر سے بلند ہوئی تھیں ـــــ جو تعجب کی بات نہ تھی، کیونکہ ان لوگوں کے لیے زندگی ایک متواتر جشن کی طرح ہے۔ لیکن اس رات جب میرا بیٹا گھر پہنچا تو اس کے چہرے پر ایسی تشویش تھی جو میں نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔

لیکن اس بات پر آنے سے پہلے میں اپنے بیٹے کا آپ سے تعارف کرادوں۔ اس کا نام

مصری ہے اور وہ میرا اکلوتا بیٹا ہے، پانچ بہنوں کا اکیلا بھائی۔ وہ پڑھا لکھا ہے — گاؤں کے اسکول سے اس نے امتحان پاس کر رکھا ہے۔ اس سے آگے میں اسے نہیں پڑھا سکا کیونکہ اس کا مطلب قصبے میں رہنے کی جگہ اور کھانے پینے، کپڑے لتے اور کتابوں وغیرہ کا بندوبست ہوتا جو میرے بس سے باہر ہے۔ پھر کھیت کے کام میں میرا ہاتھ بٹانے والا بھی کوئی چاہیے، اور گھر میں بھی کسی مرد کا ہونا ضروری ہے۔ میں بوڑھا ہو رہا ہوں اور اب اس گھر میں میری جگہ لینے والا کوئی ہونا چاہیے۔

مصری اپنی پڑھائی جاری رکھنے کا عزم رکھتا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے اسکول میں اول آتا اور امیر گھروں کے بچے اس کے ساتھ پڑھنے کے لیے ہمارے چھوٹے سے گھر آیا کرتے۔ اس معاملے پر میری اور اس کی تکرار ہوئی اور وہ گھر چھوڑ جانے پر آمادہ تھا لیکن پھر ہم دونوں میں ایک سمجھوتا ہو گیا۔ طے ہوا کہ وہ گھر ہی پر رہے گا لیکن ضلعی صدر مقام جا کر ثانوی اسکول میں پڑھنے والے لڑکوں سے روز سبق لیا کرے گا۔ اپنی مجبوری کے باوجود مصری ہر امتحان پاس کرتا رہا اور ایک بار پھر اول رہا۔

اب وہ گھر میں داخل ہوا تو اس کے چہرے سے پریشانی اور سراسیمگی عیاں تھی۔ میں نے اس سے جشن، مسرت بھری چیخوں اور رائفل کی آوازوں کے بارے میں دریافت کیا۔ اس نے کہا، ''یہ ہماری زندگی کا سیاہ ترین دن ہے۔'' میں حیرت میں پڑ گیا۔ ''آج ایک عدالتی حکم جاری ہوا ہے جس کے مطابق وہ زمین جو زرعی اصلاحات کے تحت عمدہ سے لے کر کسانوں میں بانٹ دی گئی تھی، عمدہ کو واپس مل جائے گی۔ پولیس کسانوں سے زمین لے کر اپنے قبضے میں کرے گی اور پھر عمدہ کے حوالے کر دے گی۔'' پہلے مجھے خیال ہوا کہ یہ محض ملکیت کی تبدیلی کی بات ہے، یعنی اب زرعی اصلاحات کے محکمے کے بجائے زمین عمدہ کی تحویل میں رہے گی، لیکن مصری نے میرے اس گمان کو دور کر دیا۔ اس نے بتایا کہ عمدہ نے مبارکباد دینے کے لیے آنے والے ہر شخص سے زور زور سے ہنستے ہوئے یہ بات کہی کہ جب تک زمین کے کسی چپے پر ایک بھی کرایہ دار کسان موجود ہے، وہ اس زمین کو ہاتھ تک نہیں لگائے گا۔ اسے کرایہ دار کسان نہیں چاہئیں، تاکہ وہ زمین کو اپنی مرضی سے استعمال میں لا سکے — اس میں کھیتی کرے یا تعمیر، اسے ٹھیکے پر دے یا بٹائی پر۔ میں نے اپنے کھیت پر نظریں دوڑائیں: زمین کا مربع قطعہ، جس کا رقبہ فقط تین فدان تھا اور جو پتا نہیں کتنے برسوں سے میرا رہا تھا۔ میری نظر مویشیوں کے باڑے اور آبپاشی کی نالیوں پر رک گئی جنھیں میں نے اپنے پڑوسیوں کے ساتھ مل کر بنوایا تھا، پھر

Scanned with CamScanner

میں نے کھیت کی حد پر لگے کافور کے پیڑ اور جازورین کی باڑھ کی طرف دیکھا۔ ہم دونوں خود کو کمزور اور بے بس محسوس کررہے تھے، مجھ سے زیادہ مصری، جو ہمیشہ مجھ سے زیادہ قوی رہا تھا۔ میری کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کروں، لیکن مصری کے سامنے بے خوف اور عمل پر قادر دکھائی دینا چاہتا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ یہ محض بے کار گپ بازلوگوں کی اڑائی ہوئی افواہ ہے، ہم سے ہماری زمین کوئی نہیں لے سکتا۔ آخر مصری بھی مان گیا کہ پورے مصر میں کوئی ایسی طاقت نہیں جو ہمیں زمین سے محروم کر سکے۔ وہ مجھ سے الگ ہو کر کھیت کے کنارے پر گیا اور تالاب میں پیر ڈال کر بیٹھ گیا، پھر مٹی کے ڈلے اٹھا اٹھا کر پانی میں پھینکنے اور اس سے اٹھنے والی لہروں کو دیکھنے لگا جو بڑے ہوتے ہوئے دائروں میں پھیل کر کناروں سے ٹکراتی اور ٹوٹ جاتی تھیں۔

بہت کام کرنے کو پڑا تھا۔ ربیع کا آخر تھا اور ہوا میں گرمیوں کی آمد کا اشارہ سا تھا اور فصل کٹائی کے لیے تیار تھی۔ یہ سال کا بہترین حصہ ہے — کرنے کو کام اتنا زیادہ ہے کہ صبح جب میں کام شروع کرتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ دن میں گھنٹے اتنے کم ہیں کہ کام پورا نہیں ہو سکتا۔ لیکن اب مصری اور کھیت کی طرف دیکھتے ہوئے مجھے لگتا ہے کہ میں کام سے اپنی رغبت کھو بیٹھا ہوں۔ میں نے اپنی کھرپی اور درانتی اٹھائی اور پیڑ کے نیچے چھپا دی، پھر تالاب کے پاس جا کر کھڑے پانی سے منھ اور ہاتھ پیر دھوئے، اور چہرے کو جھٹ پٹے کی ہوا میں سوکھنے دیا۔ میں نے دن بھر نماز نہیں پڑھی تھی اور اب چاہتا تھا کہ نماز پڑھوں، لیکن میرا ذہن سخت پریشان اور پراگندہ تھا۔ باڑے میں بند مویشی — بھینس، گائے، گدھا اور بھیڑیں — یتیم و بیسہارا معلوم ہو رہے تھے۔

میں اور مصری گھر کی طرف چل دیے۔ ہم اتنی جلدی گھر واپس نہیں جاتے تھے۔ مجھے عجیب سا احساس ہو رہا تھا کیونکہ میں کھیت سے کبھی اندھیرا ہونے سے پہلے نہیں لوٹتا تھا، اور مجھے لگ رہا تھا کہ پیڑ اور آبپاشی کی نالیاں اور زمین کے بھورے خالی قطعے اتنی جلد انھیں چھوڑ کر چل دینے پر مجھے ملامت کر رہے ہیں۔

عمدہ کے گھر کے باہر اتنی بھیڑ جمع تھی کہ وہاں سے گزرنا مشکل تھا۔ اس کے چوکیداروں میں سے ایک نے ہمیں روکا اور شربت پینے پر اصرار کیا — لال شربت تھا جس میں سے کیکر کے پھولوں کی خوشبو آ رہی تھی — لیکن مصری نے اسے ہاتھ سے ایک طرف کر دیا۔ ان میں تکرار سی ہونے لگی لیکن

Scanned with CamScanner

چوکیدار کے مزاج پر جشن کا غلبہ تھااور اس نے عمدہ کی مہمان نوازی قبول کرنے سے ہمارے انکار پر ہنس کر ہمیں اپنی راہ پر جانے دیا۔ گھر پہنچ کر ہمیں پورے معاملے کا اندازہ ہوا جب کسانوں کی ایک ٹولی آ پہنچی۔ وہ بھی زرعی اصلاحات کے محکمے کے کرایہ دار کسان تھے، اور انھیں ہمارے خلاف صادر کیے جانے والے فیصلے کی اطلاع مل گئی تھی۔ یہ یک طرفہ فیصلہ تھا کیونکہ ہم میں سے کسی کو عدالت میں طلب نہیں کیا گیا تھا۔ عمدہ کا مقدمہ حکومت کے خلاف تھا، تو اس میں ہمارا دخل بھی کیا تھا؟ چنانچہ ہمیں معاملے کا فریق نہیں سمجھا گیا۔ کچھ لوگوں کو یقین تھا کہ ہمیں اس فیصلے کے خلاف اپیل کرنے کا حق حاصل ہے، لیکن ایک اور شخص نے مشورہ دیا کہ ہمیں عجلت میں کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہیے۔ اس وقت تک انتظار کرنا بہتر ہے جب عمدہ کو فیصلے کی نقل مل جائے اور وہ اس پر عمل درآمد شروع کرے؛ جیسے ہی یہ نوبت آئی ہم اجتماعی طور پر حرکت میں آ جائیں گے۔ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی، اس نے کہا، اور ہمیں ایک دوسرے کا ساتھ دینا چاہیے۔ لیکن ایک بیوہ کسان عورت، جس کے کئی بچے تھے، بولی، ''پانی نیچے سے اوپر کی طرف نہیں چڑھتا۔ ہم کچھ بھی کر لیں، عمدہ زمینیں لے لے گا۔'' اس پر مصری کو غصہ آ گیا۔ بولا، ''زمین اسے کبھی نہیں ملے گی۔ اگر ضرورت پڑی تو ہم اپنی جانیں دے کر بھی زمین کی حفاظت کریں گے۔''

اگلے دن یہ بات گاؤں میں ہر ایک کی زبان پر تھی کہ عمدہ کو اس کی زمینیں واپس ملنے والی ہیں۔ ایسے ماحول میں افواہیں گرم تھیں، اور سب سے کم و بیش ایک ہی نتیجہ نکلتا تھا— کہ عمدہ اپنی زمینیں واپس لینے پر تلا بیٹھا ہے۔

دروازے پر ہونے والی دستک نے مجھے سچ مچ ڈرا دیا۔ اب تک ہم خوف اور کچھ ہونے کے اندیشے میں تین دن گزار چکے تھے۔ لوگ مسلسل یہی کہہ رہے تھے کہ حکومت کو اپنے فیصلوں پر عمل درآمد میں برسوں لگ جاتے ہیں اور یہ کہ عمدہ کو فیصلے کی نقل ملتے ملتے ہی تین سال نکل جائیں گے۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ جس دن فیصلے کا اعلان ہوا اسی دن عمدہ نے گاڑی منگوائی اور ٹیلیفون والے منشی کو ساتھ لے کر ضلعی صدر مقام روانہ ہو گیا۔ ہر شخص کہنے لگا کہ اب وہ ذرا دیر میں فیصلے کی نقل کے ساتھ لوٹے گا اور اگلے ہی دن سے اس پر عمل درآمد شروع کر دے گا۔

Scanned with CamScanner

میرے پڑوسی نے بتایا کہ وہ عمدہ کے لوٹنے پر اس سے ملا تھا اور اس کے پاس فیصلے کی نقل نہیں تھی۔ بلکہ درحقیقت وہ پریشان اور حواس باختہ دکھائی دے رہا تھا، جیسے اسے دنیا بھر کی فکروں نے گھیر رکھا ہو۔

تیسرے دن ایک پولیس افسر تین آدمیوں کے ساتھ آیا جو سب کے سب پولیس کے سفید گھوڑوں پر بیٹھے تھے۔ پولیس والوں کی اس طرح آمد پر ہم گاؤں کے لوگ ہمیشہ ڈر جاتے ہیں۔ پولیس افسر نے ان تمام کسانوں کو طلب کیا جو ان زمینوں پر کھیتی کرتے تھے جو عمدہ کو لوٹائی جانے والی تھیں، اور جب ہم سب جمع ہو گئے تو ہمیں عمدہ کے دوار میں اس بڑے کمرے میں لے جایا گیا جہاں ہتھیار رکھے جاتے ہیں۔ افسر نے ہمیں بتایا کہ عدالت کا حکم ہے کہ جس زمین پر ہم کھیتی کرتے ہیں وہ عمدہ کو لوٹا دی جائے۔ درحقیقت یہ اسی کی زمین ہے، کیونکہ چھینے جانے اور کسانوں کو کرائے پر دیے جانے سے پہلے یہ اسی کی ملکیت تھی؛ چنانچہ یہ زمین اسے کرایہ دار کسانوں سے خالی کرا کے لوٹائی جائے گی۔ جس کسی کے پاس زمین کے کرائے کا ایسا معاہدہ ہو جو اس نے زمین لیے جانے سے پہلے عمدہ سے کر رکھا ہو، وہ زمین پر کھیتی کرتا رہے، لیکن کرائے کے وہ تمام معاہدے جو زرعی اصلاحات کے محکمے کے ساتھ کیے گئے تھے منسوخ ہو چکے ہیں، اور زمین عمدہ کو فوراً لوٹائی جانی ہے۔ افسر نے کہا کہ پولیس والے کے طور پر وہ اپنے مصری اور ہمارا ہم قبیلہ ہونے کے بارے میں بہت حساس ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ یہ حکم ہم تک ایک دوستانہ، قبائلی اجلاس میں پہنچا رہا ہے۔ اگر ہم نے اس حکم پر خوشی خوشی عمل کیا تو بہت اچھی بات ہے، دوسری صورت میں اسے اس حکم کو بزور نافذ کرنا پڑے گا۔ افسر کی بات واضح اور صریح تھی اور اس میں کسی حیل و حجت کی گنجائش نہ تھی۔ اس نے صاف لفظوں میں کہا کہ عمدہ کی زمین کا اسے لوٹایا جانا ناگزیر ہے، لیکن پھر یہ بھی کہا کہ وہ ہماری طرف سے عمدہ سے درخواست کرے گا کہ وہ رحم سے کام لے۔ وہ ہمیں اس حال میں نہیں دیکھنا چاہتا کہ ہمارے پاس کھیتی کرنے کو زمین ہی نہ ہو، کیونکہ ہم اس کے اپنے لوگ ہیں اور ہمیں اپنی زندگی محبت اور بھائی چارے کے جذبے سے نہ کہ نفرت اور عداوت سے گزارنی چاہیے۔

ہم میں سے ایک شخص نے کھڑے ہو کر پوچھا، ''ہمارا اور ہمارے بال بچوں کا کیا ہو گا؟''

افسر نے جواب دیا، ''اللہ حفاظت کرنے والا ہے، اور اللہ کے بعد عمدہ ہے۔ وہ تمہاری حالت سے متعلقہ حکام کو مطلع کرے گا تاکہ وہ اس سلسلے میں کوئی قدم اٹھائیں۔ مصر کبھی اپنے بیٹوں کو بغیر

Scanned with CamScanner

زمین یا روزگار کے نہیں چھوڑے گا۔ مصر نے ہمیشہ باہر سے آنے والوں تک سے مہربانی کا سلوک کیا ہے، چنانچہ وہ اپنے بیٹوں سے اس سے بھی بہتر سلوک کرے گا۔''

ایک کسان نے کہا، ''یہ ظلم ہے!''

پولیس افسر نے جواب دیا، ''یہ عدالتی حکم ہے اور اس کا نافذ کیا جانا لازمی ہے۔ رہا یہ سوال کہ یہ حکم عدل ہے یا ظلم، اس کا فیصلہ بڑی عدالت کر سکتی ہے اور — الحمدللہ — مصر میں قانون کی حکمرانی ہے۔ قانون کی آواز سے اونچی کسی کی آواز نہیں۔ ہمارا کام قانونی احکام پر عمل کرنا ہے۔ ساری شکایات حکم پر عمل ہونے کے بعد طے شدہ قانونی طریقے سے بڑی عدالت تک پہنچائی جا سکتی ہیں۔ اگر شکایت پر فیصلہ تمھارے حق میں ہوا تو زمین تمھیں فوراً واپس مل جائے گی۔ میں تمھیں قول دیتا ہوں کہ اُس حکم پر بھی فوراً عمل ہوگا۔''

اللہ کا شکر ہے کہ مصری وہاں موجود نہ تھا۔ اگر وہ ہوتا تو معلوم نہیں پولیس افسر کے ساتھ کیا کرتا۔ اجلاس بے قابو ہونے لگا، لوگ تکرار اور احتجاج کرنے لگے۔ افسر نے اعلان کیا کہ اس کا کام فیصلے کو نافذ کرانا ہے اور بہتر ہوگا کہ زمین پُرامن طریقے سے حوالے کر دی جائے۔ اس نے کہا کہ وہ ہمیں دو دن کی مہلت دے گا۔ اگر ہم لوگوں نے کسی گڑبڑ کے بغیر زمین کا قبضہ دے دیا تو ٹھیک، اور اگر کسی نے انکار کیا تو پھر اسے قانون کو نافذ کرنا ہوگا اور زمین زبردستی لے لی جائے گی۔ یہ سن کر لوگ چلّانے لگے، لیکن افسر اپنی کرسی پر تنا ہوا بیٹھا رہا۔ پھر ٹوپی پہنی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ساتھ آئے ہوئے سپاہیوں نے اسے سلوٹ کیا اور ساتھ ہی اسلحہ خانے کے باہر کھڑے عمدہ کے چوکیداروں نے بھی۔ پھر افسر عمدہ سے ملنے چلا گیا اور ہم رنج سے مٹھیاں بھینچے باہر نکل آئے۔ ہم آپس میں کسی بات پر متفق نہ ہو پا رہے تھے، اور لگتا تھا کہ افسر نے ہمیں مہلت اسی لیے دی ہے کہ ہم میں پھوٹ پڑ جائے۔

کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ اگر یہی مصری انصاف ہے تو وہ ترکِ وطن کر جائیں گے۔ حکام غریبوں سے، جن کے پاس کچھ نہیں ہے، زمین چھین کر ان لوگوں کو دے رہے ہیں جن کے پاس وہ سب کچھ ہے جن کی ہم لوگ آرزو کر سکتے ہیں۔ بعض دوسروں کا خیال تھا کہ زیادہ باعزت طریقہ یہ ہے کہ زمین اور مویشی بیچ کر ہتھیار خرید لیے جائیں، خواہ ہمیں حکومت ہی کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ اگر بالائی مصر میں ایسا ہوا ہوتا تو پولیس افسر یہاں سے زندہ بچ کر نہ نکل

پاتا، خواہ اس کے ساتھ پوری فوج ہی کیوں نہ ہوتی۔ اس سب بحث مباحثے کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

دوپہر ہو رہی تھی لیکن میں کھیت میں مصری کے پاس نہ گیا۔ جب وہ مغرب کے وقت مویشیوں کو لیے لوٹا تب تک میں پریشان، فکروں میں غرق بیٹھا رہا۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کروں۔ خود کو سمجھایا کہ جو کچھ دوسروں پر بیتے گی وہی مجھ پر بھی بیتے گی۔ جبکہ میں عمدہ کا ملازم تھا، روز اس کے گھر جاتا تھا، جس کا مطلب ہے کہ میرا اس سے قریبی تعلق تھا۔ میں نے طے کیا کہ اس وقت تک کام پر واپس نہ جاؤں گا جب تک یہ معلوم نہ ہو جائے کہ وہ ہم سب کے ساتھ کیا سلوک کرنے والا ہے۔ جب میری بیوی نے میرا فکرمند چہرہ دیکھا تو بولی کہ عمدہ شاید ہماری زمین ہمارے پاس رہنے دے گا کیونکہ میں اس کا ذاتی محافظ ہوں اور وہ مجھے پسند کرتا ہے۔ میں اس پر چلّا پڑا اور اس کی بات سننے سے انکار کر دیا؛ کچھ بھی ہو جائے، میں سب کا ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔

ٹھیک وہی وقت تھا جب دروازے پر دستک سنائی دی۔ کتا جو دروازے سے لگا ہوا سو رہا تھا، چونک کر جاگ اٹھا، زور سے بھونکا اور دروازے کی لکڑی میں اپنے دانت گڑونے لگا۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ باہر ٹیلیفون کے کمرے کا چوکیدار کھڑا تھا جس نے کہا کہ عمدہ نے اسی وقت مجھے بلایا ہے۔

میں سوچنے کے لیے ذرا بھی نہ رکا۔ فوراً چپل پہنے اور باہر نکلنے ہی کو تھا کہ میری بیوی نے کہا کہ چائے تیار ہے۔ چوکیدار میرے ساتھ بیٹھ کر چائے پینے لگا۔ میں نے سوچا کہ شاید عمدہ کو مجھ سے اپنے کسی کھیت میں کوئی کام کرانا ہوگا، اور وہ آج رات سونے سے پہلے مجھے اس کے بارے میں آگاہ کرنا چاہتا ہے۔

جب میں دوار پہنچا تو مجھے ٹیلیفون کا منشی باہر کھڑا دکھائی دیا۔ وہ میرا ہی انتظار کر رہا تھا۔ چوکیدار نے اسے بتایا کہ وہ مجھے عمدہ سے ملانے کے لیے لایا ہے۔ مجھے حیرت ہوئی جب منشی نے مجھ سے بیٹھنے کو کہا اور چوکیدار کو چائے لانے کے لیے عمدہ کے گھر میں بھیج دیا۔ اس نے اونچی مسند پر جہاں وہ بیٹھا تھا، سرک کر میرے لیے جگہ بنائی، اور جب میں ہچکچایا تو مجھے ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور اپنے پاس بٹھا لیا۔ اس نے گول مول طریقے سے بات شروع کی۔ اس نے کہا کہ عمدہ بہت اچھا آدمی ہے اور اس نے گاؤں کے لوگوں کے لیے بہت سی خدمات انجام دی ہیں۔ گاؤں کا کوئی بھی گھر ایسا نہ ہوگا جس پر عمدہ کا احسان نہ ہو۔ لیکن مجھ پر اس کی خاص نظرِ عنایت ہے۔ پھر کہنے لگا، ''مصر کی قدیم کہاوت ہے کہ

Scanned with CamScanner

حاسدوں کی نظر ہمیشہ اپنے سے اوپر کی طرف اٹھتی ہے۔ لیکن عمدہ کا کہنا ہے کہ تم دوسرے گاؤں والوں کی طرح نہیں ہو، اسی لیے اس نے تمھیں آج رات یہاں بلوایا ہے۔ اسے تم سے ایک چھوٹا سا کام ہے۔ اسے پورا یقین ہے کہ تم اس کا یہ کام کر دو گے، کیونکہ یہ تمھارے بس کی بات ہے۔''

ان باتوں سے مجھے گھبراہٹ ہونے لگی۔ وہ ایسی گول مول باتیں کیوں کر رہا ہے؟ جب سے ہمیں یاد ہے، گاؤں میں ایک عمدہ موجود رہا ہے، جو اپنے سے پہلے والے عمدہ کا بیٹا تھا، اور اس سے بھی پہلے اس کے اجداد گاؤں کے عمدہ رہے تھے۔ جہاں تک ہمارا سوال ہے ہماری تقدیر میں درانتی پر جھکے رہنا لکھا تھا اور ہمیں اسی حالت میں مرنا تھا، ہمارے پیر مٹی میں سنے ہوئے ہوں اور پیٹھ میں متواتر جھکے رہنے سے خم پڑ گیا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم زندگی بھر جھکنے کے سوا کچھ نہیں کرتے۔ عمدہ ہمیشہ فوری حکم دیا کرتا ہے — وہ ہاتھ سے اشارہ کرتا ہے اور ہم اس کا حکم بجا لانے کے لیے دوڑ پڑتے ہیں۔ اب مجھے خوف اپنی پیٹھ پر اسی طرح رینگتا محسوس ہو رہا تھا جیسے کھیت میں سوتے ہوئے بدن پر چیونٹیاں رینگتی ہیں۔ میں منشی کو یہ بات بتانا چاہتا تھا لیکن وہ متواتر بولتا جا رہا تھا اور مجھے بولنے کا موقع ہی نہیں دے رہا تھا۔

جب عمدہ آیا تو میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور تب میں نے اس کے ہاتھ کو مصافحے کے لیے اپنی طرف بڑھا ہوا دیکھا۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ ضرور کوئی غیر معمولی بات ہے۔ میں نے سوچا کہ شاید حکومت نے زمین لوٹانے کا حکم منسوخ کر دیا ہو۔ مجھے خوشی کی لہر سی محسوس ہوئی؛ مجھ میں اپنی زمین کے لیے ہڑک سی اٹھی اور تصور میں خود کو اگلی صبح اپنے مویشیوں کے ساتھ وہاں جاتے ہوئے دیکھنے لگا۔

جب میں نے عمدہ کا چکنا، پھولا ہوا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا — جو کھردرے اور سوکھی زمین کی طرح تڑخے ہوئے تھے — تو مجھے اپنی ہتھیلی پر اس کی انگلیوں میں پہنی انگوٹھیوں کے نگوں کی چبھن محسوس ہوئی۔ میں نے جھک کر اس کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ اس کا ہاتھ بھاری اور فربہ، گرم اور پُر گوشت تھا اور جب میرے ہونٹ گوشت کی ان تہوں میں دفن ہو رہے تھے تو مجھے اچانک خیال آیا کہ میں نے پچھلی عید کے بعد سے گوشت نہیں چکھا ہے۔ میں نے دل ہی دل میں حساب جوڑنے کی کوشش کی کہ اس کو کتنے مہینے ہو چکے ہوں گے، لیکن دنوں اور مہینوں کا حساب کرنا میرے تھکے ہوئے دماغ کے بس کی بات نہ تھی۔ عمدہ نے اپنا ہاتھ وہیں رہنے دیا اور میں اسے بوسے دیتا رہا — وہ سمجھتا ہے کہ جب وہ اپنے ہاتھ کو یونہی ہمارے ہاتھ میں رہنے دیتا ہے تاکہ ہم اسے دیر تک بوسے دے سکیں تو اس سے ہمیں بہت

خوشی ہوتی ہے۔ میں نے عمدہ کے ہاتھ کو بوسے دینا جاری رکھا اور اس نے کہا، ''اللہ میری مغفرت کرے، میرے بیٹے!''

اس نے اپنے دوسرے ہاتھ سے میری پیٹھ تھپتھپائی اور پھر اسے وہیں چھوڑ دیا۔ اس کے وزن سے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ یہ وہ ہاتھ ہے جس کی پرورش پرانے سہانے دنوں کی پُرتعیش زندگی پر ہوئی ہے۔ میرے ہاتھ پر ذرا بھی گوشت نہیں، اور نہ مجھ جیسے ہزاروں دوسروں کے ہاتھوں پر؛ لیکن مجھے ڈر تھا کہ کہیں میری ریڑھ کی ہڈی کی ابھری ہوئی کیلوں جیسی نوکوں سے اس کا ہاتھ زخمی نہ ہو جائے۔

آخرکار عمدہ نے اپنے دونوں ہاتھ سمیٹ لیے اور جا کر مسند پر بیٹھ گیا۔ پھر وہ اپنی پھیلی ہوئی عبا کو سمیٹ کر —— جس میں اتنا کپڑا لگا تھا کہ اس سے میرے پورے کنبے کے بدن ڈھک سکتے تھے —— اور میں حیران رہ گیا جب اس نے مجھے اپنے برابر بیٹھنے کی دعوت دی! میں نے اپنے پھٹے پرانے جلابیے کا کنارہ اٹھایا اور چوڑی مسند کے پاس فرش پر بیٹھ گیا، لیکن اس نے اپنے مرحوم اجداد کی قسم کھا کر کہا کہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا، اور مجھے ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور زبردستی اپنے پاس بٹھا لیا۔ پھر اس نے منشی کے سوا سب کو وہاں سے ہٹ جانے کا اشارہ کیا۔ ہمارے سامنے ایک سینی میں چائے دانی اور سنہری پٹیوں والے تین بڑے پیالے رکھے تھے۔

اس وقت تک میں پوری طرح بوکھلا چکا تھا اور جو کچھ ہو رہا تھا مجھے اس سے ڈر لگ رہا تھا۔ میری خواہش تھی کہ یہ دونوں کچھ بولیں تاکہ وہ شبہات اور سوالات ختم جائیں جو بھڑوں کی طرح میرے دماغ میں بھنبھنا رہے تھے۔ وہ مجھے اتنی عزت بلاوجہ نہیں دے رہے ہیں —— وہ ضرور مجھ سے کچھ چاہتے ہیں۔ جب آخرکار تکلفات ختم ہوئے اور وہ دونوں معاملے کی بات پر آئے تو مجھے کچھ سکون محسوس ہوا۔

عمدہ مجھ سے جو کام کرنے کو کہہ رہا ہے، منشی نے کہا، وہ بیک وقت دشوار بھی ہے اور آسان بھی، پیچیدہ بھی ہے اور ساتھ ہی ساتھ بالکل سادہ بھی؛ لیکن اسے کرنا میرے بس کی بات ہے۔ کیا میں اسے کرنے پر آمادہ ہوں؟ میں نے جواب دیا کہ ہم سب عمدہ کے حکم کے بندے ہیں۔ اس پر ذرا دیر خاموش رہنے کے بعد منشی نے عمدہ سے کہا کہ اب وہ خود بات کرے۔ اس طرح یہ بات ظاہر ہو گئی کہ اسے مجھ سے کسی خدمت کی توقع ہے۔

Scanned with CamScanner

عمدہ نے کھنکھار کر گلا صاف کیا، پھر جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک رومال نکالا جو اتنا باریک تھا جیسے سگریٹ کا کاغذ۔ پورا کمرہ اس کی خوشبو سے بھر گیا۔ عمدہ نے اس میں تھوکا اور ایک بار پھر کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ مجھے خیال آیا کہ یہ آدمی ہمیشہ سے پیٹ بھر کر کھانے کا عادی ہے، اور کھا کھا کر اب اس کا حلق اتنا تنگ ہو چکا ہے کہ اس کی آواز نکلتی ہے تو اس میں سے گوشت اور مرغی، مکھن اور تلی ہوئی پیاز کی مہک آتی ہے۔ میری طرف جھک کر عمدہ نے مجھ سے پوچھا کہ زمین کی بابت میرا کیا ارادہ ہے۔ آخر کار مجھے محسوس ہوا کہ میں سکون کا سانس لے سکتا ہوں، کہ اب سب الٹ پھیر کی باتیں ختم ہوئیں اور معاملے کی بات آئی۔ میں نے اسے بتایا کہ ہم کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکے کہ کیا کیا جائے۔ ''ہم'' کے لفظ نے اسے چونکا دیا اور وہ بولا، ''یہ ہم کون ہے؟''

میں نے اسے بتایا کہ ہم وہ کسان ہیں جنھیں ان کی زمینوں سے بے دخل کیا جانے والا ہے۔ ہم نے اب تک فیصلہ نہیں کیا ہے کہ کیا عملی قدم اٹھایا جائے، لیکن زیادہ تر لوگ اسی خیال کے ہیں کہ افسر کی مزاحمت کی جائے اور ضروری ہو تو طاقت استعمال کی جائے۔ اسے یہ بات سن کر غصہ نہیں آیا۔ بلکہ وہ ہنسا اور کہنے لگا، ''دوسروں کی بات چھوڑو۔ تمھارا معاملہ خاص ہے۔''

''انسان وہی ہے جو اپنی زبان کا پکا ہو، اور مردوں کا قول عمر بھر کے لیے ہوتا ہے۔ میں اپنے برادر گاؤں والوں سے بات کر چکا ہوں اور ان کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا...''

اس نے میری بات کاٹ دی۔ ''میں تمھارے معاملے کو خاص معاملہ سمجھتا ہوں،'' وہ بولا۔ ''صرف تم پر مہربانی کرنے کے لیے نہیں، بلکہ مجھے تم سے ایک کام لینا ہے۔ میں تم سے جو طلب کر رہا ہوں وہ یہ ہے کہ مصری میرے سب سے چھوٹے بیٹے کی جگہ ایک سادہ سا کام کر دے۔ وہ میری سب سے چھوٹی بیوی کا بیٹا ہے، وہی جو تمھیں دوپہر اور رات کا کھانا اور چائے بھجوایا کرتی ہے اور جسے تم اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھتے ہو۔ وہ بھی تمھیں اپنے باپ کی جگہ مانتی ہے۔ اگر مصری یہ کام کر دے تو بہت فائدہ ہوگا۔''

اب منشی بھی بات چیت میں شامل ہو گیا۔ بولا کہ عمدہ مجھ سے چاہتا ہے کہ اپنا بیٹا اس کام کے لیے دے دوں، لیکن ظاہر ہے ہر چیز کی ایک قیمت ہوتی ہے۔ اور جب ہمارے درمیان سمجھوتا ہو جائے گا تو اور تفصیلات بھی طے ہو جائیں گی کہ مجھے اس کے عوض عمدہ سے کیا ملے گا۔

Scanned with CamScanner

وہ دھیرے دھیرے مجھے ساری تفصیل بتاتے رہے اور جب ان کی بات پوری ہوئی تو آدھی رات گزر چکی تھی۔ میں عمدہ کے دوار کے باہر بڑی سڑک پر روزمرہ کی آوازیں سن رہا تھا: بچے چیخ چلا رہے تھے اور کھیل رہے تھے، مرد شرطیں لگا رہے تھے، کوئی شخص اپنی مرغی یا بھیڑ کو ڈھونڈ رہا تھا جو کھیت سے لوٹتے ہوئے بھٹک کر گم ہو گئی تھی۔ ایک شخص کسی کسان کو تلاش کر رہا تھا جو اس کا قرضدار تھا، دوسرا کہہ رہا تھا کہ اس کی طرف کسی کی ایک پائی بھی نہیں نکلتی۔ اس تمام شوروغل کے درمیان میں نے ان دونوں کی کہی ہوئی ایک ایک بات کو سنا۔

''مصری سے ہم جو چاہتے ہیں،'' منشی بولا، ''وہ پلک جھپکتے میں ہو سکتا ہے۔ اسے عمدہ کے چھوٹے بیٹے کی جگہ ضلعی انتظامیہ کے دفتر جا کر کچھ اہم کاغذات حاصل کرنے ہوں گے اور لوٹ آنا ہو گا۔ عمدہ اس کے جانے آنے کا کرایہ ادا کرے گا۔''

پھر عمدہ نے ایک بات کہی جو منشی کہنا بھول گیا تھا۔ مصری کو انتظامیہ سے کاغذات حاصل کر کے — جو کوئی خاص اہم کاغذات نہیں ہیں — اسی دن اسکندریہ جانا ہو گا اور یہ کاغذات وہاں ایک شخص کے حوالے کرنے ہوں گے، اور بس مغرب کے وقت تک گاؤں لوٹ آنا ہو گا۔ ''مصری کے لیے تو یہ بچوں کا کھیل ہو گا،'' اس نے کہا۔

میں نے ایک بار پھر پوچھا کہ آخر اس کام کے لیے عمدہ کا بیٹا خود کیوں نہیں جا سکتا، اور اس کی جگہ مصری ہی کا جانا کیوں ضروری ہے۔ تب مجھ پر پہلا وار ہوا۔

منشی بولا، ''مصری عمدہ کا بیٹا بن کر جائے گا۔''

میں نے گھبرا کر پوچھا کہ وہ کس قسم کے کاغذات ہیں۔

''ارے کچھ نہیں، بس بھرتی کے کاغذات ہیں،'' عمدہ نے ہاتھ کے اشارے کے ساتھ کہا، جیسے اس بات کی ذرا سی بھی اہمیت نہ ہو۔

اس سے پہلے کہ میں یہ سب کچھ سمجھ سکتا، منشی نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں راضی ہوں، اور میں نے اپنے سر کی طرف اشارہ کر کے یہ بتانے کی کوشش کی کہ میرے دماغ میں کیسی ہلچل برپا ہے۔ پھر عمدہ نے منشی کو اشارہ کیا اور منشی نے، جیسا کہ کہاوت ہے، پتیلی کا ڈھکن اٹھا دیا۔ اور تب اصل معاملے کی بو مجھ تک پہنچی۔ اس نے پورا قصہ مجھے بتایا اور اتنے جوش میں آ گیا کہ اس کے ہونٹوں سے جھاگ

Scanned with CamScanner

کے چھینٹے اڑنے لگے: وہ پہلے اس کی زبان کے سرے اور باچھوں کے کونوں پر ٹھہرے رہے، لیکن پھر ان کا دائرہ وسیع ہوتا گیا اور وہ میرے چہرے اور کپڑوں پر پڑنے لگے۔ منشی کی بات سمجھنے کی کوشش میں میں بالکل بوکھلا گیا۔ کئی بار میں نے اس سے ذرا رکنے کی درخواست کی تاکہ اپنے دماغ میں چیزوں کو ترتیب دے سکوں، لیکن اس نے میری بات کاٹ دی اور میں ایک لفظ بھی نہ کہہ سکا۔ میرا اجبڑا لٹک گیا، بازو ڈھیلے پڑ گئے اور پسینے کا ایک موٹا سا قطرہ میرے حلق پر گر کر کپڑوں کے نیچے سینے کی طرف ڈھلکنے لگا۔ میں نے اسے اپنے سینے کے بالوں میں سے گزر کر پیٹ کی طرف سرکتا اور ٹھنڈا پڑتا محسوس کیا۔

منشی نے جو کچھ کہا وہ یہ تھا: ''دو دن پہلے عمدہ صاحب کے بیٹے کے نام، جو مصری کا ہم عمر ہے، فوجی خدمت کے لیے حاضری کا حکم نامہ موصول ہوا۔ اس کے اسباب اور حالات بیان کرنے میں بہت وقت لگ جائے گا (اور ان کو بیان کرنا تکلیف دہ بھی ہوگا)، لیکن عمدہ صاحب نہیں چاہتے کہ ان کا بیٹا فوجی خدمت انجام دے۔ ان حالات کا تمھیں کچھ نہ کچھ علم ضرور ہوگا کیونکہ عمدہ صاحب تمھیں اپنے گھر کا فرد سمجھتے ہیں۔ اسی لیے انھوں نے تمھیں اپنے ذاتی اثاثوں کی حفاظت پر مامور کیا ہے۔ انھوں نے کوئی متبادل راستہ ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی، لیکن سارے دروازے بند ہوتے گئے— اور تم تو جانتے ہی ہوگے کہ آدمی کے سامنے سارے دروازے بند ہو جائیں تو اسے کیسا محسوس ہوتا ہے۔ اگر ان کا بیٹا فوج میں چلا گیا تو ان کا خاندان بکھر کر رہ جائے گا، اور انھوں نے اتنی محنت سے جو کچھ جمع کیا ہے سب ان کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ آخر کار اس کا سب سے سادہ اور آسان حل ہماری سمجھ میں آ گیا: اس کی جگہ کسی اور کو بھیج دیا جائے۔ اور چونکہ عمدہ صاحب تمھیں اپنے بھائی سے بھی زیادہ قریب خیال کرتے ہیں، اور مصری کو اپنا ہی بیٹا سمجھتے ہیں، اس لیے مصری ان کے بیٹے کی جگہ فوج میں جائے گا۔ اگر تم اس پر راضی ہو تو عمدہ صاحب تم سے ساری تفصیلات طے کرنے کو تیار ہیں؛ تم جو مانگو تمھیں مل سکتا ہے، اور عمدہ صاحب ایسے انسان ہیں جو ناممکن کو بھی ممکن بنا سکتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ تم اس چھوٹی سی بات کے لیے راضی ہو جاؤ۔ تو پھر کیا خیال ہے؟ کیا کہتے ہو؟''

گہری خاموشی چھا گئی۔ میں نے کہا: ''میری سمجھ میں نہیں آیا آپ لوگ مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔''

وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ عمدہ کے چہرے پر غصے کے پہلے نشان ابھرے، اور منشی نے اس سے خود پر قابو رکھنے کی درخواست کی۔ وہ چھوٹی سی خدمت جو وہ مجھ سے—

Scanned with CamScanner

بلکہ مصری سے — لینا چاہ رہے تھے وہ رفتہ رفتہ مجھ پر واضح ہونے لگی: میرے اکلوتے بیٹے کو، جو اتنی ساری لڑکیوں کے بعد پیدا ہوا ہے، عمدہ کے ساتویں بیٹے کی جگہ فوج میں جانا ہوگا۔ وہ مجھ پر فوراً جواب دینے کے لیے زور ڈالتے رہے، لیکن میں نے ہاں یا نہ، کچھ نہ کہا۔ جب کوئی پیچیدہ مسئلہ سامنے ہوتو میں جلدی میں فیصلہ کبھی نہیں کرتا۔ اس لیے میں نے سوچنے کی مہلت مانگی۔ انھوں نے مہلت دینے سے انکار کر دیا۔

''اگر تم کسی سے مشورہ مانگنے کا سوچ رہے ہو،'' منشی نے کہا، ''تو اسے بھول جاؤ۔ یہ عمدہ صاحب کے لیے بہت خطرناک ہوگا۔ ہم تم سے ہاں یا نہ میں جواب مانگ رہے ہیں، اور دونوں صورتوں میں یہ بات راز میں رہے گی۔''

''اور جس شخص کی بات ہو رہی ہے اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''کون شخص؟''

''مصری خود۔''

''میں تمھاری بات نہیں سمجھا۔''

پھر منشی نے مجھے بتایا کہ مصری کو ساری بات ایک دم بتانے کی ضرورت نہیں، آہستہ آہستہ اسے پوری بات کا پتا چل جائے گا۔ ''کوئی نہیں جانتا کہ اچانک معلوم ہونے پر اس کا کیا ردِعمل ہو،'' وہ بولا، ''آج کل کے نوجوان سمندر کی طرح گہرے ہوتے ہیں۔''

''اگر مجھے کچھ دیر کے لیے اکیلا چھوڑ دیا جائے تو میں کچھ سوچ بچار کر لوں،'' میں نے کہا۔

انھوں نے مجھے دوار میں چھوڑنے کی تجویز دی، لیکن میں نے کہا کہ میں اگلے دن جواب دوں گا۔ ''سب ٹھیک ہو جائے گا،'' میں نے کہا۔ معلوم نہیں میں نے یہ بات کیوں کہی۔ مجھ میں یہ سب سے بڑی خرابی ہے: بعض اوقات لفظ خود بخود میری زبان سے پھسل پڑتے ہیں اور مجھے اندازہ نہیں ہوتا کہ ان کا کیا مطلب ہے۔ بہرحال میں خوش تھا کہ ان دونوں نے میری جان چھوڑی اور اب میں گھر جاؤں گا۔

جب میں جانے کے لیے اٹھا تو عمدہ نے میرا بازو تھام لیا۔ ''دنیا لین دین پر ہی چلتی ہے،'' وہ بولا، ''اور آدمی جو کام کرتا ہے اسے اس کا معاوضہ ملتا ہے۔ لیکن تم راضی ہو یا نہ ہو، اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا؛ میں دونوں صورتوں میں تمھیں معاوضہ دوں گا۔ اب یہ تمھارے ضمیر پر ہے کہ تم ہاں

کہتے ہو یا نہ، لیکن مجھے یقین ہے کہ تم مجھے مصیبت میں مبتلا نہیں چھوڑو گے۔ تمھیں زرعی اصلاحات کے محکمے سے کتنی زمین ملی تھی؟''

''تین فدان،'' میں نے جواب دیا۔

میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ میرے پاس محکمے کا جاری کردہ پٹا ہے جو زرعی کوآپریٹو سوسائٹی کے نام ہے۔ ''پچھلے پانچ سال سے ہم سے کہہ رہے ہیں کہ محکمہ زمین کی ملکیت ہمیں سونپ دے گا اور جتنا کرایہ ہم ادا کر چکے ہیں اسے زمین کی قیمت میں شامل سمجھا جائے گا۔ لیکن وقت گزرتا گیا اور ہمارا خواب پورا نہ ہوا۔ اور آج شام ہمیں یہ اندوہناک اطلاع ملی کہ زمین ہم سے واپس لی جانے والی ہے۔''

''تم دونوں اب ایک گھر کے فرد ہو،'' منشی نے کہا، اس کا مطلب مجھ سے اور عمدہ سے تھا۔ میں نے عمدہ کے لیے جو کچھ کیا ہے اس کے بعد میرے اور اس کے خاندان کا خون ایک ہو گیا ہے۔

اس خوشامدانہ جھوٹ پر میں اندر ہی اندر ہنس پڑا۔ ہمیں بچپن سے معلوم ہے کہ عمدہ کے خون کا رنگ نیلا ہے — جاڑوں کے بادلوں سے ڈھکے آسمان جیسا۔ اور اس میں سے خوشبو اٹھتی ہے۔ اس کا خون ہم جیسے لوگوں کے گاڑھے سرخ خون جیسا نہیں، جن کو بھرا پیٹ صرف خواب ہی میں نصیب ہوتا ہے۔ شاید میری طنزیہ ہنسی میرے چہرے پر جھلک اٹھی ہوگی — بہرحال منشی نے بھانپ لیا کہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔ اس نے پھر کہا کہ یہ بالکل سچ ہے کہ ہمارا خون ایک ہو گیا ہے، اور اگر مصری عمدہ کے بیٹے کی جگہ فوج میں بھرتی ہوا تو یہ ایک طرح کا خوں بہا ہوگا۔ اور یہ محبت کی سب سے بڑی دلیل ہوگی جو مصر کا ایک فرزند اپنے بھائی کے لیے پیش کر سکتا ہے۔ اس سے پہلے ایسی بات کبھی نہیں ہوئی ہوگی۔

''کچھ بھی ہو جائے،'' عمدہ نے دخل دیتے ہوئے کہا، ''تمھیں زمین سے کبھی بے دخل نہیں کیا جائے گا۔'' اس نے تین بار یہ بات دہرائی، پھر قرآن اٹھا لیا، جس کے اوراق کے درمیان وہ دس پاؤنڈ کے نوٹ رکھا کرتا تھا — اس کی جیبیں بھی ان چاقوؤں جیسے تیز دھار نوٹوں سے بھری ہوئی ہیں۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے قرآن پر قسم اٹھانے سے باز رکھا۔

جہاں تک میری زمین کا تعلق ہے، اس نے کہا، اسے زرعی اصلاحات کے محکمے کی لیز تو منسوخ کرنی ہوگی تاکہ لوگ باتیں نہ بنائیں، لیکن زمین پر قبضہ میرا ہی رہے گا اور میں اس پر بدستور بٹائی پر کھیتی کرتا رہوں گا۔ زمین عمدہ کی ہوگی اور اس پر سارا سال میں اور میرے گھر کے لوگ کام کریں گے، اور

Scanned with CamScanner

سال کے آخر میں فصل آدھی آدھی بانٹ لی جائے گی، بس اتنا ہوگا کہ عمدہ میرے حصے میں سے زمین کا کرایہ وضع کرلے گا۔ یہ کرایہ بھی مجھے اوروں کی طرح سال کے سال یکساں نہیں دینا ہوگا، بلکہ فصل کے حساب سے، یعنی کپاس کی فصل کے لیے زمین کا کرایہ الگ ہوگا اور پھلیوں کی فصل کے لیے الگ۔

'چلو حساب کرتے ہیں کہ تم کتنا کماؤ گے،'' عمدہ کہتا رہا۔''فرض کرو کوئی کسان پوری ایک فدان زمین پر کاشت کرتا ہے۔ فرض کرو وہ عام فصلوں کو بھول جاتا ہے، قومی معیشت اور ملک کے مفاد اور برآمدات میں اضافے کی باتیں بالکل نظرانداز کردیتا ہے اور فصلوں کو بدل بدل کر اگانے سے انکار کردیتا ہے۔ اگر وہ ایک فدان زمین پر پھلوں کے درخت لگائے تو ان سے ایک ہزار پاؤنڈ سالانہ کما سکتا ہے، اور اگر عام فصلیں اگائے تو چھ سو پاؤنڈ تو کہیں گئے ہی نہیں۔ لیکن چلو ہم محتاط اندازہ لگاتے ہیں کہ تمھیں چار سو پاؤنڈ کی آمدنی ہوگی۔ اب اس میں سے کیڑوں اور سوکھے اور بری نظر سے ہونے والا نقصان، اور معاملات کو آسان بنانے کے لیے دی جانے والی رشوتیں نکال دو۔ تب بھی فی فدان آمدنی دو سو پاؤنڈ ہوگی، اور تمھارے پاس تین فدان زمین ہے، اس طرح تمھارے پاس چھ سو پاؤنڈ آئیں گے۔ اس طرح مصری کی فوجی خدمت کے تین سالوں میں تمھیں اٹھارہ سو پاؤنڈ کی آمدنی ہوگی — یعنی تقریباً دو ہزار پاؤنڈ کی! اور میں مویشی اور ایندھن کی لکڑی اور تمھیں ملنے والا غلہ تو شمار کر ہی نہیں رہا ہوں، کیونکہ تم میرے ہی گھر کے ایک فرد ہو۔ اگر تم واقعی محنت سے کام کرو اور کامیابی حاصل کرو تو ہوسکتا ہے آگے چل کر میں تمھیں کھیتی کے لیے اور زمین بھی دے دوں۔ ہمیں اس معاہدے کی لکھا پڑھی کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ یہ ہم دونوں کے درمیان راز رہے گا۔''

اس نے کہا کہ وہ لوگوں کو بتائے گا کہ اس زمین پر کھیتی کرنے کے عوض وہ مجھے مزدوری دے رہا ہے۔ اس کے علاوہ دوار کی چوکیداری ایک مستقل کام ہے، جس کی اجرت ایک رات کے لیے تین پیاسٹر، گویا تین پاؤنڈ ماہانہ ہے۔ اور چونکہ دوار کی ہر چیز بالکل محفوظ ہے، کوئی شخص عمدہ کی ملکیت کو چھونے تک کی جرأت نہیں کرسکتا، اس لیے یہ تین پاؤنڈ مجھے گھر کے بجائے دوار میں سونے کے عوض مفت میں مل رہے ہیں۔ اس کے باوجود، اس خدمت کو دیکھتے ہوئے جو میں عمدہ کے لیے بجالانے والا ہوں، وہ میری اجرت دگنی کردے گا، یعنی ایک رات کے چھ پیاسٹر، یعنی چھ پاؤنڈ ماہانہ، جو اس پنشن کے برابر ہے جو مجھے سرکار سے ملتی ہے۔ اس کا سیدھا مطلب یہ ہوا کہ ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو، پنشن

سمیت، بارہ پاؤنڈ میرے ہاتھ میں آ جایا کریں گے، جو سرکاری اسکول کے مدرس، یا پوسٹ ماسٹر یا کوآپریٹو سوسائٹی کے زرعی منتظم کی تنخواہ سے بھی زیادہ ہیں، صرف مرکزی پولیس تھانے کے معزز افسر کی تنخواہ سے ذرا کم ہیں جو ہم وفادار شہریوں کا حاکم ہے۔

حساب کا خلاصہ کرتے ہوئے اس نے کہا — اور اس کی بات میں اس تنگ دلی کا شائبہ تک نہ تھا جو حاسد لوگوں کی باتوں سے جھلکتا ہے — کہ پنشن کو چھوڑ کر ہر سال بہتر پاؤنڈ میرے گھر میں پہنچ رہے ہوں گے، یعنی تین سال میں دو سو سولہ پاؤنڈ۔ اگر ہم اس میں کھیت کی آمدن بھی جوڑ لیں تو کل ہوئے دو ہزار سولہ پاؤنڈ۔ اب مصری جب تک فوج میں رہے گا اسے الگ تین پاؤنڈ ماہانہ وظیفہ ملے گا۔ اور ہم نے ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے اور جان پہچان کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے ملٹری انٹیلی جنس میں تعینات کروا دیا تو تعیناتی الاؤنس اور وردی الاؤنس اس کے علاوہ ہوگا۔ وہاں اس کی تنخواہ پندرہ پاؤنڈ ماہانہ ہوگی، کھانا پینا اور ٹرانسپورٹ سب مفت، اور وہاں رہ کر وہ اپنا اثر ورسوخ بھی بڑھا سکتا ہے جو اس کے اور اس کے گھر والوں کے کام آئے گا۔'' اس طرح،'' عمدہ نے کہا،'' ہم توقع کر سکتے ہیں کہ اس کی سالانہ آمدنی ایک سو اسی پاؤنڈ ہوگی، یعنی تین سال کے پانچ سو چالیس پاؤنڈ۔ اب پورا حساب خود جوڑ لو، تین سال میں تمھارے ہاتھ میں دو ہزار پانچ سو چھپن پاؤنڈ آ جائیں گے۔ اس وقت جون ۱۹۷۳ء ختم ہو رہا ہے، اور اگر مصری جولائی کے شروع میں فوج میں بھرتی ہو جائے تو جولائی ۱۹۷۶ء کے شروع میں وہاں سے فارغ بھی ہو چکا ہوگا۔ آدمی کی زندگی میں اس عرصے کی کیا اہمیت ہے! یہ عرصہ تو پلک جھپکتے میں گزر جائے گا، کسی کو اس کے جانے کا احساس تک نہ ہوگا۔

''فرض کرو وہ اس تاریخ کو فوج کی ملازمت نہیں چھوڑتا، اگر اس سے ملازمت جاری رکھنے کو کہا جاتا ہے، اور پہلی جولائی ۱۹۷۶ء سے اس کی تنخواہ بڑھا دی جاتی ہے، تو نئی تنخواہ بیس پاؤنڈ سے کم کیا ہوگی، اور کبھی کبھی تو یہ تنخواہ چالیس پاؤنڈ تک جا پہنچتی ہے اگر سوچ سمجھ کر معاہدہ کیا جائے یا اگر کمان دار افسروں سے بنا کر رکھی جائے، یا اچھے رنگروٹ کی طرح اپنا دماغ ٹھیک طرح استعمال کر کے وہ بہت سارے فیتے اور تمغے اور اعزازات اکٹھے کر لے۔ اور یہ تنخواہ اسے فوج سے فارغ ہونے تک ماہ بماہ ملتی رہے گی، اور جس وہ فوج سے فارغ ہوگا اس دن اس کا یونٹ کمانڈر اس کے سامنے کئی پیشکشیں رکھے گا جنھیں وہ چاہے تو قبول کرے، چاہے تو رد کر دے۔

''اس کے لیے پہلا راستہ تو یہ ہوگا کہ فوج میں باقاعدہ سپاہی کے طور پر ملازم ہو جائے، یہ لازمی بھرتی میں آنے والے سپاہی سے اونچا درجہ ہوتا ہے، جس میں پورے پچاس پاؤنڈ ماہانہ تنخواہ ملتی ہے اور پانچ سال میں وہ کمیشنڈ آفیسر بن جائے گا— سیکنڈ لیفٹیننٹ۔ مصری بہت کم عمر ہے، جس کا مطلب ہے وہ ریٹائر ہوتے ہوتے جنرل کے عہدے تک بھی پہنچ سکتا ہے، یعنی پولیس کے صوبائی سربراہ کے برابر۔ یہ تو تم نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا ہوگا۔

لیکن اگر وہ فوج کی باقاعدہ ملازمت نہ کرنا چاہے— جس کا اسے پورا اختیار ہوگا— تو اسے فوج کے سپریم کمانڈ آفس سے ایک خط ملے گا جو اس علاقے کے حکام کے نام ہوگا جہاں وہ کوئی سویلین ملازمت کرنا چاہے۔''

دراصل مصری سچا فرزندِ زمین ہے، اور میں جانتا ہوں شہر میں اسے جو بھی عہدہ پیش کیا جائے گا وہ اسے ٹھکرا دے گا؛ وہ کبھی شہری حاکم، یا سرکاری وکیل، یا ڈاکٹر یا انجینئر بننے پر راضی نہ ہوگا۔ وہ تو اس گاؤں کے ابتدائی اسکول میں مدرس بننے کو ترجیح دے گا تاکہ علم کی روشنی کو دیہات کے غریب، بے آسرا لوگوں تک پہنچا سکے۔ مصری بیچارہ خود اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکا، اور اس محرومی کی وجہ سے وہ لوگوں تک تعلیم پہنچانے کا زیادہ اچھا ذریعہ بن سکتا ہے۔

''حکومت میں کسی انتظامی افسر کی کیا تنخواہ ہوتی ہے؟'' عمدہ نے پوچھا۔

میں نے کچھ جواب نہ دیا۔ میرا منھ خشک ہو رہا تھا؛ دل اتنے زور سے دھڑ دھڑ کر رہا تھا کہ اس کے پسلیوں سے ٹکرانے کی آواز تک صاف سنائی دے رہی تھی۔

میرے بجائے منشی نے جواب دیا۔ بولا ''پچاس فدان زمین کی قیمت کے برابر ہوتی ہے۔''

''ایک فدان زمین کی قیمت دو ہزار پاؤنڈ ہے،'' عمدہ نے اپنی بات جاری رکھی، ''اور اس میں خریداری کی فیس شامل نہیں ہے جو خود آدھے فدان کے برابر ہوتی ہے۔ اس طرح اس عہدے کی مالیت ایک لاکھ پاؤنڈ کے برابر ہوئی۔''

تو اس طرح، اس نے مجھ سے سوال کیا، کون کس پر احسان کر رہا ہے؟ منشی نے اس پر اعتراض کیا۔ کہا کہ احسان کی بات سوچنا غیر ضروری ہے، دراصل اس میں سب کا فائدہ ہے، گاؤں کا بھی اور مادرِ وطن مصر کا بھی۔

Scanned with CamScanner

اس کے بعد اچانک خاموشی ہوگئی۔ پھر منشی میرے پاس سرک آیا اور پوچھا کہ کیا میں نے پچھلے رمضان میں لیلۃ القدر جاگ کر گزاری تھی۔ اگر ایسا ہے تو میری خوش قسمتی میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو میرے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ کسی معجزے سے کم نہیں۔ عمدہ نے ابھی جو کچھ بیان کیا اسے معجزہ کہا جا سکتا ہے، کیونکہ اس میں ایسی باتیں ہیں جو آدمی کے عجیب ترین خوابوں تک میں نہیں آ سکتیں، اور یہ نا قابل یقین معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ یوں پلک جھپکتے میں ہو جانے والا ہے۔

میں نے جواب دیا، ''میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ لیلۃ القدر کا ہم جیسے غریبوں کی زندگی سے بھی کچھ لینا دینا ہو سکتا ہے۔ ہمارے پرکھوں کے زمانے سے یہی دستور ہے کہ خوش قسمتی مال اور طاقت والوں کی دوست ہوتی ہے، اُن لوگوں کی جنھیں اس کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔ ہم نے تو کبھی اس کی صورت دیکھی نہیں۔''

منشی پھر میرے قریب آیا اور مجھ سے منھ کھول کر اوپری ہونٹ اٹھانے کو کہا۔ پھر بولا کہ میرے اوپر کے دانتوں میں خلا نہیں ہے جو بے پناہ اچھی قسمت کی نشانی ہوتا ہے۔ وہ الجھن میں گرفتار دکھائی دے رہا تھا، لیکن عمدہ نے میری جانگھ پر زور سے ہاتھ مار کر اسے الجھن سے نکال لیا — اتنی زور سے کہ مجھے چکر سا آ گیا۔ مصری کے دانت اس طرح کے ہیں، اس نے کہا۔ پھر مجھے یاد دلایا کہ جب مصری نے چلنا شروع کیا تھا تب ہی عمدہ نے مجھے بتا نہیں دیا تھا کہ یہ بچہ بڑا قسمت والا ہے؟ اس نے قسم کھائی کہ اس نے اسی وقت کہہ دیا تھا کہ پوری دنیا اس لڑکے کے قدموں میں ہوگی۔

''حضور نے کہا تھا کہ اس بچے کا قدم مبارک ہے،'' منشی نے اس کی تصحیح کی۔

''ہاں ہاں، بالکل!'' عمدہ بولا۔ ''میں نے یہی کہا تھا۔''

مجھے اس کا یہ کہنا بالکل یاد نہ آیا، لیکن یہ بات درست تھی کہ مصری کے اوپر کے دانتوں کے درمیان خلا ہے، اور بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ وہ اچھی قسمت لے کر پیدا ہوا ہے۔ میں اٹھ کھڑا ہوا اور بولا کہ مجھے جانا ہے، لیکن عمدہ نے کہا کہ میں اس کے گھر سے کھانا کھائے بغیر نہیں جا سکتا۔ اس نے تالی بجائی اور منشی اندر گیا تاکہ کھانا جلدی بھجوا سکے۔

اللہ کا شکر ہے کہ میں یہ ساری گفتگو بیان کر سکا۔ مجھے ڈر تھا کہ یہ اتنی پیچیدہ اور دشوار ہے اور اس میں ایسی بڑی بڑی اور اجنبی رقموں کا ذکر آتا ہے کہ میں اسے پوری طرح بیان نہیں کر سکوں گا۔ کیا

Scanned with CamScanner

میں نے سب کچھ ٹھیک ٹھیک بیان کر دیا ہے؟ شاید سب کچھ ٹھیک نہ ہو، لیکن اس بات چیت کا جتنا کچھ حصہ میری سمجھ میں آیا وہ یہی تھا، اور اسی پر اکتفا کرنا ہوگا۔

نوکر اپنے سر پر کھانے کی سینی رکھے اندر آیا، یہ پیتل کی ایک بڑی سی سینی تھی جو دستر خوان سے ڈھکی ہوئی تھی، جیسی مالدار لوگوں کے جنازوں پر دکھائی دیتی ہیں۔ جب عمدہ نے دستر خوان ہٹایا تو ساری قابوں اور پیالوں سے بھاپ اٹھ رہی تھی اور مجھے کسی بطخ یا مرغ کی بھوری ہڈی شوربے میں سے نکلی دکھائی دی۔ میرے منہ میں پانی بھر آیا اور آنتوں میں ہلچل ہونے لگی۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میرا پیٹ کھیت کے نالے جتنا چوڑا ہو گیا ہے اور جیسے میں نے برسوں سے کھانا نہیں کھایا ہے۔ جب میں نے سینی میں رکھے ہوئے کھانوں کو دیکھا تو مجھے اندازہ ہوا کہ یہ روزمرہ کا نہیں بلکہ دعوت کا کھانا ہے جس کا پہلے سے اہتمام کیا گیا تھا۔

میں عمدہ کے سامنے بیٹھ گیا اور منشی میرے برابر میں، جبکہ ایک چوکیدار، میرا پرانا ساتھی، پانی سے بھرا جگ، گلاس اور تولیہ تھامے ہمارے پاس کھڑا ہو گیا۔ میں ان تمام غیر متوقع نعمتوں کو دیکھ کر سرشار ہو گیا — میرے سامنے کسی نے کبھی ایسا کھانا نہیں رکھا تھا! البتہ کبھی کبھار ایسا ضرور ہوا تھا کہ عمدہ اور اس کے مہمانوں کے کھانا کھا چکنے کے بعد میں یہ سینی گھر کے اندر واپس لے جاتا، اور کسی دروازے یا دیوار کی اوٹ میں رک کر بچا کھچا کھانا جلدی جلدی کھا لیتا، یا بعد میں کھانے کے لیے کہیں چھپا کر رکھ دیتا۔

عمدہ نے بلند آواز میں الحمد پڑھی اور ہم سب نے کھانے کی طرف ہاتھ بڑھائے۔ سینی کے کونے میں ایک اوزار پڑا تھا جسے کانٹا کہتے تھے، جس کی شکل اس اوزار سے ملتی جلتی تھی جس سے ہم گیہوں سے بھوسا الگ کرتے ہیں، لیکن یہ بہت چھوٹا تھا اور لکڑی کے بجائے دھات کا بنا ہوا تھا۔ چھری اور چمچے سے میں پہلے سے واقف تھا۔ چھری میرے گھر میں اس وقت سے ہے جب میں مصری کی ماں کو بیاہ کر لایا تھا اور بڑھئی نے ہمیں الماری اور کھانے کی نیچی میز کے ساتھ ساتھ لکڑی کے چمچے بھی بنا کر دیے تھے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہاں میں اپنی انگلیوں سے کھانا کھا سکتا ہوں یا نہیں۔ عمدہ نے چھری اور کانٹا اٹھایا اور بطخ یا مرغ، جو کچھ بھی تھا، اس کی بوٹی میں سے ایک ٹکڑا کاٹا۔ مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ اگر میں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تو وہ برا مانے گا۔ مجھے خواہش ہوئی کہ کاش وہ میرے حصے کا کھانا دے دے جسے میں الگ بیٹھ کر کھا سکوں، ان تمام ڈراؤنے چھری کانٹوں کے بغیر جن کو میں

کھڑکی سے باہر پھینک دینا چاہتا تھا۔ میں نے اپنے چھری کانٹے کو ایک طرف رکھ دیا اور چمچے سے جو کچھ کھا سکتا تھا کھانے لگا: شوربہ، چاول، سبزی اور سلاد۔ عمدہ ہر قسم کے کھانوں کا برسوں سے عادی تھا، جبکہ مجھے ان کھانوں سے مانوسیت نہ تھی۔ جب اس نے کھانا شروع کیا اور اس کا منھ گوشت سے بھر گیا تو اس کے چہرے پر ایک سکون چھا گیا اور اسے دیکھ کر صاف معلوم ہوتا تھا کہ اسے دنیا کے اور کسی کام میں اتنا زیادہ لطف نہیں آتا ہوگا۔

کھانا کھانے کے بعد میں نے کہا کہ اب مجھے واقعی جانا ہے، اور عمدہ نے کہا کہ وہ مجھے سوچنے سمجھنے کے لیے دو دن کی مہلت دے رہا ہے۔ منشی نے پھر مجھے یاد دلایا کہ میں مصری کو ہر بات ایک ساتھ نہ بتاؤں بلکہ ذرا ذرا کر کے، اور میں نے وعدہ کیا کہ ایسا ہی کروں گا۔ پھر میں وہاں سے چلا، اس حالت میں کہ میری نظریں زمین پر گڑی ہوئی تھیں، کمر جھکی ہوئی تھی اور قدم اٹھانا دشوار معلوم ہو رہا تھا۔ میں سیدھا گھر نہیں گیا، بلکہ عمدہ کے توشہ خانے میں جا کر مصری سے متعلق اس پورے معاملے پر غور کرنے لگا۔ دنیا میں جو کچھ ہو رہا تھا اس کو میں اسی کے معاملات کے ذریعے سے سمجھتا تھا۔ جب وہ بچہ تھا تو مجھے سوکھی روٹی کے اس ٹکڑے سے آگے کچھ معلوم نہیں تھا جسے حاصل کرنے کی میں ہر روز اللہ سے دعا کرتا اور جب وہ مل جاتا تو اسے دونوں طرف چومنے کے بعد ہی کھانا شروع کرتا۔ رات کو، آہستہ آہستہ گزرتے ہوئے گھنٹوں کے دوران مجھے صرف نیند بھر سونے کی تمنا ہوتی، اور صبح کے وقت میں اپنی بندوق اسلحہ خانے میں جمع کرانے کے بعد گھر جاتے ہوئے چپکے چپکے دعا مانگا کرتا کہ کہیں عمدہ نہ دیکھ لے، کیونکہ اگر اس کی نظر مجھ پر پڑ جاتی تو وہ مجھے اپنے وسیع و عریض کھیتوں میں کام پر بھیج دیتا۔ میں ساری زندگی بھوکا رہا ہوں، نیند کی بھوک، روٹی کی بھوک، کپڑے کی بھوک، آرام کی بھوک—پوری زندگی پر محیط بھوک۔ میں نے اس خیال سے بچنے کی کوشش کی لیکن کسی طرح نہ بچ سکا۔ کیا میں مصری کو عمدہ کے بیٹے کی جگہ فوج میں بھرتی ہونے کے لیے بھیج دوں گا؟ ''کبھی نہیں،'' میں نے کہا۔

مجھے اپنی زبان سے نکلنے والے ان لفظوں کو سن کر حیرت ہوئی، لیکن اس سے مصری کے بارے میں میرا خوف کم نہ ہوا۔ میں عمدہ کے گھر سے باہر نکلنے کے وقت سے خوفزدہ تھا، اور اس سے فرار کی کوئی صورت نہ تھی۔ میں نے خود کو تھکانے کا فیصلہ کیا تاکہ بعد میں اپنا پرانا، سوراخوں سے چھلنی کمبل سر تک

Scanned with CamScanner

اوڑھ کر سو سکوں۔ جب میں سوتا تو میرے منہ سے وہی آوازیں نکلا کرتیں جو میں رات کے وقت، جب میں پہرے پر ہوتا، دوسروں کے منہ سے نکلتے سنا کرتا تھا۔

نیند میں ایسی بو ہوتی ہے جسے میں محسوس کر سکتا ہوں۔ یہ لوگوں کو دو گروہوں میں بانٹ دیتی ہے: ایک وہ جو اپنی مرضی سے جتنا چاہیں سو سکتے ہیں، اور دوسرے وہ جو ایسا نہیں کر سکتے۔ جب میں رات کو پہرہ دیتے ہوئے، خوشحال لوگوں کے مکانوں کے پاس سے گزرتا تو وہ ہمیشہ گہری نیند میں معلوم ہوتے، اور مجھے ڈر ہوتا کہ میرے قدموں کی چاپ سے ان کی آنکھ نہ کھل جائے۔ آخر میں ان کو شرپسندوں سے محفوظ رکھنے کے لیے پہرہ دیا کرتا تھا، نہ اس لیے کہ ان کی نیند خراب کروں۔

میری کام کی زندگی اسی طرح گزری، اور جب میں ملازمت سے فارغ ہوا تو میرا خیال تھا کہ اب لمبی تان کر ہمیشہ کے لیے سونے کا موقع ملے گا، لیکن چند دن بھی نہ گزرے تھے کہ میں نے خود کو ایک بار پھر چوکیداری کرتے ہوئے پایا، اس بار عمدہ کے لیے۔ پھر یہ مصری والی بات سامنے آ گئی، اور جو تھوڑی بہت نیند میرے پاس تھی وہ بھی مجھ سے چھن گئی؛ یہی وجہ ہے کہ میرے چہرے پر یہ گہری لکیریں پڑ گئی ہیں۔ کیا میں نے لفظ چہرہ استعمال کیا؟ آیئے اس چہرے سے آپ کا تعارف کرا دوں۔ اس پر صرف مسّے ہی نہیں ہیں۔ میری آنکھیں بھی ہمیشہ سرخ رہتی ہیں — ان کی سرخی کا اندازہ کرنے کے لیے آپ کو اس قدر نزدیک آنے کی ضرورت نہیں — میری پلکیں لمبی، بے خواب راتوں کے دوران جھڑ چکی ہیں، اور میری ناک مسلسل، کسی نل کی طرح بہتی رہتی ہے۔ بلکہ آپ کہہ سکتے ہیں کہ میرے نتھنے اس نل سے کہیں زیادہ رواں ہیں جو ہمارے گھر کے پاس لگا ہوا ہے، جس سے ہمیں آج تک پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں ملا۔

دروازے پر ہونے والی وہ دستک بربادی لے کر آئی۔ ''امید ہے اب ان لوگوں کو سکون ہو گیا ہوگا،'' میں نے تلخی سے سوچا۔ مصری کے بارے میں گاؤں میں باتیں ہوا کرتی تھیں۔ ''فقیر آدمی کا بیٹا اتنا ذہین کیسے نکل آیا؟''، ''اسے ایسا روشن دماغ کہاں سے ملا؟'' کچھ دن پہلے مصری کی ماں ایک پرانی کہاوت دہرا رہی تھی: یتیم کے ہاتھ میں کیک، کیسی عجیب بات ہے!

مصری کا معاملہ ہی عجیب تھا۔ اور جب اس نے ابتدائی اسکول پاس کیا تو میری سمجھ میں نہ آیا کہ اب کیا کروں۔ آخر تعلیم دنیا کی بہترین چیز ہے اور ہم جیسے لوگوں کی تمنا ہوتی ہے کہ ہمارا کوئی فرزند

Scanned with CamScanner

پڑھ لکھ کر، آفندی بن کر گھر لوٹے۔ مصری ہوشیار شاگرد تھا اور اس کی شہرت پورے گاؤں میں پھیلی ہوئی تھی۔ وہ ہمیشہ اول آتا، نہ صرف اپنی کلاس میں بلکہ پورے اسکول میں۔ یہ معمول شروع سے رہا، اور اس کی ذکاوت نے بہت سے بڑے بڑے لوگوں کو میرے دروازے پر بھیجا کہ مصری ان کے بچے کے ساتھ بیٹھ کر پڑھے تاکہ وہ بھی امتحان پاس کر لیں۔ لوگ اس کا سبب یہ بیان کرتے تھے کہ غریب عقلمند ہوتے ہیں اور امیر احمق، لیکن یہ بات میرے حلق سے کبھی نہ اتری۔ مالدار لوگ چیزیں حاصل کرنے کی آرزو کر سکتے ہیں اور جو چاہیں وہ حاصل بھی کر سکتے ہیں۔ وہ اگر چاہیں تو عقلمند بھی ہو سکتے ہیں، کیونکہ وہ اپنی دولت سے جتنی چاہیں عقل خرید سکتے ہیں۔

جس دن مصری کو ابتدائی اسکول کی سند ملی، اس دن ہم مشکل میں پڑ گئے۔ اس علاقے کا واحد ثانوی اسکول صرف ضلعی صدر مقام میں ہے، اور خصوصی اسکول، مثلاً تجارت، زراعت اور مدرّسوں کی تربیت کے ادارے بڑے شہر میں ہیں جہاں پولیس کا سربراہ اور گورنر بیٹھتے ہیں۔ مصری کی مجھ سے اس کے مستقبل کے بارے میں تکرار ہوتی رہی۔ وہ ثانوی اسکول میں آرٹس پڑھنا چاہتا تھا اور اس کے بعد کالج اور یونیورسٹی تک جانا چاہتا تھا، اور پھر اللہ کی مرضی ہو تو وہاں پڑھانا بھی چاہتا تھا۔ میری نظر میں دنیا کا بہترین کام ہمارے گاؤں کے اسکول میں مدرسی کرنا ہے، لیکن مصری نے اس کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اس نے اعلیٰ تعلیم اور اعلیٰ ثانوی تعلیم کی بات کی، اور کہا کہ وہ میری خواہش کے مطابق استاد بننے کو تیار ہے لیکن یونیورسٹی کے قانون یا آرٹس کے شعبے سے امتحان پاس کرنے کے بعد، اس کا کہنا تھا کہ وہ قانون پڑھنے کو ترجیح دے گا۔

یہ سب باتیں میرے سر کے اوپر سے گزر گئیں اور میں اسے تعجب سے دیکھنے لگا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ مصری نے یہ سب باتیں کہاں سے سیکھ لیں۔ میں چاہتا تھا کہ اسے زندگی میں اس کا مقصد حاصل ہو، لیکن بہت جلد مجھے احساس ہو گیا کہ گاؤں کے اسکول سے آگے پڑھنا اس کے لیے ممکن نہ ہو گا۔ اسے رہنے کی جگہ چاہیے ہو گی، اور اٹھنے بیٹھنے کی چیزیں اور بجلی اور پانی کی ضرورت ہو گی، اور ضلعی صدر مقام کے اسکول میں جانے کے لیے مہنگے کپڑے چاہیے ہوں گے۔ پھر اسے کھانے پینے اور ہر ہفتے گاؤں آنے جانے کے کرائے، اور اسکول کی کتابیں کاپیاں اور قلم دوات خریدنے کے لیے پیسوں کی ضرورت ہو گی۔ میں غریب آدمی جس کا گھر کا خرچ ہی مشکل سے چلتا ہے۔ یہ درست ہے

Scanned with CamScanner

کہ میں تین فدان زمین پر کھیتی کرتا ہوں، چوکیدار کی تنخواہ پاتا ہوں اور دو مویشیوں میں میرا حصہ ہے، لیکن مجھے اپنے علاوہ گھر کے نو افراد کا پیٹ بھی پالنا ہوتا ہے: مصری، اس کی پانچ بہنیں، ان کی ماں، میری ماں اور میری ساس۔ یہ سب بیٹھے مسلسل روٹی اور کپڑے کا تقاضا کیا کرتے ہیں۔ میرے پاس اسے اتنے مہنگے قصبے میں پڑھانے کے لیے پیسے کہاں سے آئیں گے جہاں کے لوگ آنکھوں سے کاجل چرا لیتے ہیں اور پانی اور ہوا تک کے دام دھروا لینے کی فکر میں رہتے ہیں؟ جتنا میرے بس میں تھا میں پہلے ہی کر رہا تھا۔

گاؤں والوں کو مصری کے مستقبل کی فکر تھی۔ کئی لوگوں نے آ کر مجھ پر زور دیا کہ میں مصری کو قصبے کے اسکول میں پڑھنے کے لیے جانے دوں۔ میں نے جواب میں وہ مشہور عربی کہاوت دہرائی: العین بصیرة و الید قصیرة، کہ آنکھ تو بہت کچھ دیکھتی ہے، لیکن ہاتھ ہر نظر آنے والی شے تک نہیں پہنچ سکتا۔ میں کیا کر سکتا ہوں؟ لوگ مجھ پر ناراض ہوئے اور بولے کہ اللہ ہر شے پر قادر ہے، لیکن اس کی حکمتیں سمجھ سے بالا ہیں، ایسے لوگوں کو آویزے مل جاتے ہیں جو کان ہی نہیں رکھتے۔ اس دنیا کے راز وہی جاننے والا ہے۔

ایک دن کھیت میں کام کرنے کے دوران میں نے مصری کو بلایا۔ ''تم پانچ بہنوں کے اکلوتے بھائی ہو،'' میں نے اس سے کہا، ''اور قصبے میں تمھارا خرچ اٹھانا میرے بس کی بات نہیں۔ ایک فدان زمین ایک پکی نوکری کے برابر ہوتی ہے، اور ہمارے پاس تین فدان زمین ہے جو ایک دن ہماری ہو جائے گی — ٹھیک ہے، ابھی کرائے کی ہے، میں جانتا ہوں، لیکن ایک نہ ایک دن تو اس کی ملکیت ہمیں مل ہی جائے گی۔ ہم نے بیس سال سے زیادہ انتظار کیا ہے، اب وہ دن زیادہ دور نہیں ہو سکتا۔ اور یہ تمھارے حصے میں آئے گی، مصری، کیونکہ تمھاری بہنوں کی منزل تو شادی ہے۔ زمین تمھاری ہو جائے گی، اور یہ پڑھائی پوری نہ ہونے کا اچھا معاوضہ ہو گا۔ ہم تمھارے لیے ایک حلال لڑکی ڈھونڈ لیں گے تاکہ تمھارا دین مکمل ہو جائے۔ پھر تم اپنا آشیانہ بنا لو گے، غریبوں والا آشیانہ ہی سہی۔''

مصری نے میری بات کا جواب دینے سے پہلے مجھے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ میرے بولتے بولتے اس کی عمر میں دس سال کا اضافہ ہو گیا ہو۔ وہ سخت غصے میں تھا، اس کی آنکھیں آنسوؤں سے جل رہی تھیں اور میں اس کے زور زور سے سانس لینے اور دانت

Scanned with CamScanner

پیپنے کی آوازیں سن سکتا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ اپنی پڑھائی جس طرح بھی ہو جاری رکھے گا، وہ لفظ ناممکن کو نہیں جانتا، اور وہ کسی اور کی زمین پر کھیتی کرنے کے لیے پیدا نہیں ہوا ہے۔ اس نے کہا کہ وہ گھر پر رہ کر پڑھنا جاری رکھے گا۔

''گھر پر؟'' میں چلا اٹھا۔

اس کے جواب نے مجھے احساس دلایا کہ اس کے اور میرے درمیان کتنی وسیع خلیج حائل ہے۔ اس نے وضاحت کی کہ قصبے کے اسکول میں داخلہ لے کر بھی یہ ممکن ہے کہ آدمی اپنے گھر پر پڑھائی کرتا رہے۔ وہ سارا سال تیاری کر کے سال کے آخر میں امتحان میں بیٹھ جائے گا۔ اسے یقین تھا کہ وہ تین سال تک ایسا کر سکتا ہے۔

یہ دوسری دفعہ ہے کہ میں کھیت میں مصری سے ہونے والی بات چیت دہرا رہا ہوں، یہاں عمدہ کی جائیداد کے پہرے پر کھڑے ہوے، اس کی خریدی ہوئی بندوق کندھے پر لٹکائے (لائسنس کی فیس بھی اسی نے بھری تھی)، اور نہیں جانتا کہ یہ سب کیوں دہرا رہا ہوں۔ میں مصری کے موضوع سے دھیان ہٹانے کی بار بار کوشش کرتا ہوں، لیکن اس کو اپنے ذہن سے نہیں نکال پاتا۔

کل میں نے سنا تھا کہ بعض جگہوں پر زمینیں ان کے پرانے مالکوں کو لوٹائی جا چکی ہیں، اور عمدہ کو بھی اس کی زمین واپس ملے گی، خواہ وہ چاہے یا نہ چاہے۔ میں بھوکا تھا، اور عمدہ کی تجویز میرا، اور میرا ہی نہیں میرے گھر والوں کا بھی پیٹ بھر سکتی تھی۔ اس لیے میں ہچکچا رہا تھا، حالانکہ مجھے خود اپنی ہچکچاہٹ پر حیرت ہو رہی تھی۔ جب عمدہ نے مجھ سے پہلی بار یہ بات کہی تھی تو میں اسے ماننے کو تیار نہیں تھا، لیکن بعد میں اس پر بہت سوچ بچار کرنے کے بعد — حقیقت یہ ہے کہ میں دبدھا میں پڑ گیا تھا۔ جب رات آئی تو میری ہچکچاہٹ اور بڑھ گئی، اور اس کے بعد آنے والی راتوں میں نیند میری آنکھوں سے دور رہی۔ یہ سب کسی خواب کی طرح لگتا تھا۔ مجھ پر ایسی بے خوابی چھا گئی جسے میں نے اس سے پہلے کبھی نہ جانا تھا، اور لمبی راتیں بے انت ہوتی گئیں۔ جب فجر کا مٹیالا، وحشت انگیز دھندلکا قریب آتا تو مجھے اپنے فیصلے کی گھڑی بھی قریب آتی معلوم ہوتی، مگر صبح ہوتے ہی مجھ پر ایک عجیب سکون سا چھا جاتا۔ میں مسجد میں جا کر وضو کرتا، نماز پڑھتا، سوچ سوچ کر خود کو تھکا ڈالتا اور کسی سے مشورہ لینے کا فیصلہ کرتا، لیکن بے عزتی اور لوگوں کے باتیں بنانے کے خوف نے میرا منھ بند رکھا۔

Scanned with CamScanner

آخری صبح میں عمدہ کا دوار اور توشہ خانہ اگلے چوکیدار کو سونپنے گیا، اور نہ جانے کیوں اس صبح اس کام میں معمول سے زیادہ دیر لگی۔ پھر میں گھر چلا آیا۔

اور اب میں کہانی کے بڑے نازک موڑ پر پہنچ رہا ہوں — کہ اس دہشت ناک صبح جب میں گھر پہنچا تو میرے اور مصری کے درمیان کیا پیش آیا۔ لیکن مجھے معاف کر دیجیے، میں جانتا ہوں کہ یہ بہت اہم بات ہے جو آپ مجھ سے سننا چاہتے ہیں، لیکن دنیا کی کوئی شے مجھے اس بات چیت کو دہرانے پر مجبور نہیں کر سکتی۔ میں اسے سہار ہی نہیں سکتا۔ اس کا اشارتاً ذکر کرنا تک میرے لیے دشوار ہے، اس کی تفصیلات بتا کر میں مصری سے کس طرح دغا کر سکتا ہوں؟ میں جانتا ہوں آپ مجھ پر خفا ہوں گے، کہیں گے کہ میں اب تک آپ کو صرف بہلاتا رہا؛ کہ میں نے آپ کو صرف اتنا بتایا جتنا میں بتانا چاہتا تھا، اور جب کہانی کا اصل حصہ آیا تو بھاگ نکلا۔ خیر اس بدنصیب صبح کو میرے اور مصری کے درمیان جو کچھ پیش آیا وہ کوئی راز تو ہے نہیں۔ کسی نہ کسی سے آپ کو معلوم ہو ہی جائے گا، لیکن میری زبان سے آپ یہ سب نہیں سن سکیں گے۔

میں کوشش کر کے آپ کو اپنے وہ خیالات بتا سکتا ہوں جو مصری کی کہانی ختم کرنے کے بعد میرے ذہن میں آئے۔ جب کبھی میں مسجد میں جاتا ہوں تو پیش امام کو کہتے سنتا ہوں: لو أطلعتم علی الغیب لأخترتم الواقع (اگر تمھیں آنے والے زمانے کا علم ہوتا تو تم اس پر موجودہ زمانے کو ترجیح دیتے)۔ اور جب کبھی گاؤں میں کوئی بات پیش آتی ہے تو لوگ کہتے ہیں، ''اے پروردگار، ہم تجھ سے قضا منسوخ کرنے کو نہیں کہتے، لیکن ہم پر رحم کر اور اپنی قضا کو ذرا نرم کر دے۔'' جب کوئی مصیبت آتی ہے، جب لوگ مرتے ہیں، یا مکانوں میں آگ لگ جاتی ہے، یا فصلیں سیلاب کی زد میں آجاتی ہیں، تو وہ آسمان کی طرف دیکھ کر یہ کہتے ہیں: قضاء أخف من قضاء (کچھ قضائیں دوسری قضاؤں کی بہ نسبت زیادہ نرم ہوتی ہیں)۔

ایک وقت تھا جب میں ان سب باتوں کو درست مانتا تھا۔ لیکن اب، اپنی مصیبت سے گزرنے کے بعد میرے دل سے یہی بات نکلتی ہے کہ ''اگر مجھے اس نامعلوم مستقبل کا علم ہوتا تو میں کبھی وہ فیصلہ نہ کرتا جو میں نے کیا۔''

— ۴ —

دوست

۲:۳۰ سہ پہر، سوموار، ۲۲؍اکتوبر ۱۹۷۳ء؛ ۱۲؍بابہ ۱۶۹۰ق؛ ۲۶؍رمضان ۱۳۹۳ھ۔

کاش میرے پاس ان تمام قصہ گویوں کے فن کے برابر قصہ گوئی کا ہنر ہوتا جنھوں نے اس فن کی ابتدا سے آج تک کہانیاں سنائی ہیں! اسی صورت میں میں اس دشوار کام سے انصاف کر سکتا تھا: یعنی اس عجیب اور غمناک کہانی میں اپنے ادا کیے ہوے کردار کی کہانی سنانا۔ پھر بھی اگر میں واقعات کو اپنے رخ سے سیدھا سیدھا بیان کر دوں تو اس کہانی کا خاصا حصہ آپ تک پہنچ جائے گا۔

میں ایک نازک لمحے میں آپ سے مخاطب ہوں، سوموار، ۲۲؍اکتوبر کی سہ پہر۔ اس تاریخ ہی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اسے زیادہ وقت نہیں ملا۔ وہ محض چوبیس سال کا تھا — اگر بالکل ٹھیک ٹھیک بیان کیا جائے تو چوبیس سال، چار مہینے اور نو دن۔ کیا اتنا وقت کافی ہے؟ میرے خیال میں تو نہیں۔

میں اپنی بات ان پہیلیوں اور بجھارتوں سے کیوں شروع کر رہا ہوں؟ میں جانتا ہوں کہ میری باتیں زیادہ واضح نہیں ہیں، لیکن میرے پاس اس پراسرار، گول مول انداز میں بات کرنے کا جواز موجود ہے: مجھے ڈر ہے کہ اگر میں نے اصل بات فوراً ہی کہہ ڈالی، اگر آپ نے بھانپ لیا کہ میں آپ کو کیا بتانے والا ہوں، تو آپ میرے حصے کی کہانی آگے نہیں پڑھنا چاہیں گے، کیونکہ جو کچھ مجھے بیان کرنا ہے وہ ایک غمناک، دلدوز منظر ہے، جبکہ آپ، سرزمینِ مصر کے رہنے والے لوگ، فتح، مسرور قہقہوں اور بے کنار خوشی کے زمانے میں جی رہے ہیں۔ آپ مسرور لوگ ہیں، اتنے مسرور جتنے ہمارے آباواجداد کبھی نہ تھے، اتنے مسرور جتنی ہماری آنے والی پیڑھیاں کبھی نہ ہوں گی۔ کیا آپ وہ کچھ سننا پسند کریں گے جو میں آپ سے بیان کرنے والا ہوں؟

آیئے میں منظر کو ترتیب دے لوں۔ میں ایک تابوت گاڑی کے پچھلے حصے میں بیٹھا ہوا ہوں ۔۔۔اس کا رنگ سیاہ ہے لیکن پینٹ پر پڑتی ہوئی سورج کی کرنوں کے باعث مٹیالا دکھائی دے رہا ہے۔ اس کے باہر لگی ہوئی تختیوں کا رنگ صحرا کی ریت جیسا ہے، جن پر نیچے کی طرف ''الجیش'' (فوج) کا لفظ کھدا ہوا ہے۔گاڑی کے فرش پر میرے سامنے ایک چوبی تابوت رکھا ہے، جس میں مصری کی لاش ہے۔سامنے کی سیٹ پر ایک فوجی ڈرائیور اور ایک طبی معاون کے درمیان ایک زخمی سپاہی بیٹھا ہے جو ہمیں راستے میں پڑا ملا تھا۔سوئز کا شہر ہم پیچھے چھوڑ آئے ہیں اور اب قاہرہ کی طرف جا رہے ہیں۔ ہمارا کام مصری کی لاش حوالے کر کے طبی خدمات کے شعبے سے دواؤں کا ایک ذخیرہ لے کر واپس پلٹنا ہے۔

میں تابوت پر سے نظر نہیں ہٹا پاتا، اور گاڑی کے دائیں بائیں گھومنے پر اسے فرش پر ادھر اُدھر سرکنے سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میرے سامنے ایک چھوٹی سی کھڑکی ہے اس لیے میں جان سکتا ہوں کہ ہم کس سمت میں اور کس رفتار سے جا رہے ہیں۔گاڑی میں ایک ریڈیو بھی ہے، جس میں زیادہ تر صرف کھڑ کھڑاہٹ کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔ کبھی کبھی پروگرام صاف سنائی دینے لگتا ہے، لیکن پھر گاڑی کوئی موڑ کاٹتی ہے اور آواز پھر غائب ہو جاتی ہے۔

مصری کل جنگ کے دوران زخمی ہوا تھا اور آج صبح چل بسا، لیکن مجھے اب بھی یوں لگتا ہے جیسے وہ گہری نیند میں ہو، جیسے وہ ابھی زندہ ہو اور اس کے جسم میں گرمی باقی ہو جو تابوت کی درزوں میں سے ہو کر مجھ تک پہنچ رہی ہو۔ جب ہم نے اسے تابوت میں لٹایا تو اس کا جسم ابھی اکڑا نہیں تھا۔ وہ ابھی تک لچکدار تھا اور لگتا تھا کہ رگوں میں خون ابھی تک گردش کر رہا ہے اور دل دھڑک رہا ہے۔ میں نے خود سے کہا کہ اسے جو کچھ بھگتنا پڑا ہے اس کے باعث وہ بے ہوش ہو گیا ہے، اور کچھ نہیں؛ جلد ہی ہوش میں آ کر چلنے پھرنے لگے گا۔ اس کی لاش یہاں میرے سامنے رکھی ہے، لیکن مجھے اب تک یقین نہیں آیا (اور شاید کبھی نہیں آئے گا) کہ مصری محاذ پر مارا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ محاذِ جنگ کی موت کی ایک خاص بو ہوتی ہے جو میں نے پچھلے چند دنوں میں ہزاروں بار سونگھی ہو گی۔ مصری کے جسم سے وہ بو نہیں آ رہی، اور میرا خیال ہے کبھی آئے گی بھی نہیں، خواہ میں اسی طرح مہینوں اس کے سرہانے بیٹھا رہوں۔

وقت سست رفتاری اور تھکن کے ساتھ گزر رہا ہے۔ میں مصری سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا وہ

Scanned with CamScanner

واقعی لڑائی میں مارا گیا، لیکن تابوت سختی سے بند ہے۔ میں اس پر جھک کر ایک درز میں سے اندر جھانکنے کی کوشش کرتا ہوں، لیکن اندر کوئی جنبش دکھائی نہیں دیتی۔ اچانک ریڈیو کا خیال آنے پر میں اس پر لگی ہوئی گھنڈیاں گھما کر کوئی پروگرام تلاش کرنے لگتا ہوں۔ گاڑی ایک موڑ لیتی ہے اور نیوز ریڈر کی سنجیدہ، گمبھیر آواز صاف سنائی دینے لگتی ہے۔

''صدرِ جمہوریہ نے قوم کے نام اپنے خطاب میں اعلان کیا ہے،'' وہ کہتا ہے، ''کہ مصر نے جنگ بندی کی وہ تجویز قبول کر لی ہے جو کل صبح سلامتی کاؤنسل نے پیش کی تھی۔ کل شام ہونے والے اجلاس میں سلامتی کاؤنسل نے مشرقِ وسطیٰ کی صورت حال پر غور جاری رکھا اور سوویت یونین اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی فوری درخواست پر اپنی منظوری دے دی۔''

گاڑی ایک اور موڑ کاٹتی ہے اور نیوز ریڈر کی آواز انجن کے شور میں ڈوب جاتی ہے۔ میں لکڑی کے تابوت کی طرف دیکھتا ہوں، جو اِس بار گاڑی کے جھکولا لینے پر بھی نہیں سرکتا۔ شاید، مجھے خیال آتا ہے، مصری بھی کان لگائے سننے اور سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ درحقیقت اسے سمجھنا کچھ ایسا مشکل نہیں، لیکن ہر شخص کو اسے اپنے انداز میں لینے کا حق ہے — خاص طور پر ہم جیسے سپاہیوں کو۔

اب تابوت پھر ہلتا ہے اور مجھے یوں لگتا ہے جیسے مصری اس معمے کو سمجھ گیا ہو، جیسے اس نے کہی جانے والی بات کے رموز کو پا لیا ہو۔ جس طرح تابوت اس وقت لرز رہا ہے اس سے جو شے ظاہر ہوتی ہے وہ بے اطمینانی سے زیادہ مشابہ ہے، یا شاید نامنظوری کا اظہار کرنے کی کوشش ہے، یا کسی بات کی وضاحت کرنے کی جبکہ اس کے لیے ذرا سی دیر ہو چکی ہے۔

بلاشبہ یہ تھکن اور نقاہت سے وقت سے پہلے چور ہو جانے والے ایک آدمی کے ذہن کی اڑان ہے۔ میں اب تک تھکن محسوس کر رہا ہوں، حالانکہ کہتے ہیں کچھ دیر آرام کر لینے کے بعد یہ جاتی رہتی ہے، لیکن میں ہر چیز سے الگ تھلگ ہو کر سویا پھر بھی یہ تھکن نہیں گئی؛ پہلے کی طرح موجود رہی۔ میں خود کو خستہ اور شکستہ محسوس کر رہا ہوں۔ یہ الفاظ بھی میں گویا نقاہت کے نشے میں ادا کر رہا ہوں۔ اس سے نکلنے کا واحد راستہ بات کرنا ہے، جیسے کوئی شخص ٹٹولتا ہوا زنجیر کی ایک کڑی سے دوسری کڑی تک پہنچ رہا ہو اور اس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ یہ سب کیونکر ہو رہا ہے۔ میں اپنے ساتھ جو راز لیے جا رہا ہوں، اس کے سامنے میری زندگی کی ہر چیز بے وقعت ہو کر رہ گئی ہے؛ میں اس سے موازنے کے لیے اپنی

زندگی کی کوئی تفصیل یاد کرنے کی بے سود کوشش کرتا ہوں۔ مجھے شبہ ہے کہ میری زندگی میں کبھی ایسی کوئی بات پیش نہیں آئی جس کا مقابلہ اس مصری والے معاملے سے کیا جا سکتا ہو۔

مجھے اپنی توجہ مصری اور اس کے ساتھ پیش آنے والے واقعات پر مرکوز رکھنی چاہیے، کیونکہ کسی اور چیز کے بارے میں بات کرنا خود مصری سے غداری کرنا ہوگا۔ اس کہانی کے مختلف پہلوؤں کو ایک دوسرے سے الگ الگ برتنا ایک مہلک غلطی ہوگی، کیونکہ یہ سب آپس میں جڑے ہوئے ہیں۔ لیکن میں صرف مصری کی بات کروں گا، اور آپ خود دیکھ لیں گے کہ کس طرح تمام دھاگے ایک دوسرے کے ساتھ الجھے ہوئے ہیں اور ان کو ایک دوسرے سے الگ کرنے کی کوشش کتنی مضحکہ خیز ہوگی۔

یہ سب اس دن سے شروع ہوا جب میں مصری سے پہلی بار ملا، یعنی جس دن وہ ہمارے یونٹ میں آیا۔ میں وہ وقت کبھی نہیں بھول سکتا جب میں نے پہلی بار اس کی آواز سنی تھی: جب آپ کسی شخص سے ملتے ہیں تو آواز ہی پہلی چیز ہوتی ہے جو آپ کی توجہ کو اپنی طرف کھینچتی ہے، یعنی اس کے منھ سے نکلنے والی ہوا جو ہم تک پہنچتے پہنچتے صاف سنائی دینے والی آواز کی صورت لے لیتی ہے۔ اس کی آواز میں شرم اور جھجک تھی، جیسے مدد کی التجا، ہاتھ بڑھانے اور دوستی کرنے کی درخواست۔ میں اس کی آواز سنتے ہی اس التجا کو سمجھ گیا، اور جب میں نے اس پر نظر ڈالی تو مجھے اس کی آنکھوں میں جلتی ہوئی شدت دکھائی دی۔

اگر میں نے بات کرنے کے شریفانہ رکھ رکھاؤ کو اس طرح نظر انداز کر دیا ہے — اور مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں نے ایسا ہی کیا ہے — تو میرا عذر یہ ہوگا کہ ہمارا باقاعدہ تعارف نہیں ہوا ہے۔ اس کہانی کا کوئی لکھنے والا نہیں ہے جو اس قسم کی چیزوں کا خیال رکھ سکے، چنانچہ یہ کام مجھے خود ہی کرنا ہوگا۔ میں مصری کا دوست ہوں؛ درحقیقت حالات کی سازش نے مجھے اس کا سب سے قریبی دوست بنا دیا۔ یہ حالات ہی ہیں جو افراد کی تقدیروں کو قریب لاتے اور بعض اوقات ان کو یوں جوڑ دیتے ہیں جیسے وہ ایک دوسرے کے ساتھ لپٹی ہوئی ہوں، خواہ وہ افراد خود کچھ بھی کرتے رہے ہوں؛ اور اب میں سوچتا ہوں کہ وہ کون سی چیز تھی جس نے مجھے یوں مصری کی طرف کھینچا۔ میں اس غمناک معاملے میں کس طرح شامل ہو گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ میں نہیں جانتا — یا کم از کم اس کا کوئی ظاہری سبب نہیں تھا۔

لیکن یہ سب ہماری پہلی ملاقات تک جا پہنچتا ہے، جس طرح ہم نے اس شام روبرو آنے پر ایک دوسرے کو سلام کیا۔ نئے بھرتی ہونے والوں کا ایک گروپ اس روز یونٹ میں پہنچا تھا، اور میری ڈیوٹی کمپنی آفس میں تھی۔ میرا کام ان کے کوائف نوٹ کرنا تھا اور میں نے ان سب سے وہی معمول کے سوال کیے: نام، تعلیمی قابلیت، بھرتی کی تاریخ، یونٹ میں آنے کی تاریخ، پیدائش کا مقام، سویلین پیشہ، فارغ ہونے کے بعد اختیار کرنے کے لیے پسندیدہ پیشہ، اور حاصل کردہ فوجی تربیت۔ یہ ایک چھوٹا گروپ تھا، تربیتی کیمپ سے آنے والے آٹھ رنگروٹوں پر مشتمل۔ ڈیوٹی سارجنٹ انھیں بیرک کی طرف لے گیا جہاں انھوں نے اپنا سامان رکھا، وردی اتاری اور کچھ دیر آرام کیا — ان کو کوئی کام نہیں دیا گیا کیونکہ وہ صبح دس بجے کے بعد پہنچے تھے جو ڈیوٹیاں سپرد کیے جانے کا وقت ہوتا ہے۔ انھوں نے اڈے کے باہر بنی دکانوں پر جا کر کھانے پینے کی چیزیں خریدنے کی اجازت مانگی، اور سارجنٹ نے انھیں اجازت دے دی، اور ہدایت کی کہ ایک گھنٹے کے اندر اندر لوٹ آئیں۔ وہ وقت کی پابندی کے ساتھ واپس آ گئے۔

وہ سب دن بھر کے سخت سفر سے تھکے ہوئے تھے — وہ رنگروٹوں کے لیے اُن دشوار دنوں میں سے ایک تھا۔ سارجنٹ انھیں لے کر رجسٹریشن کے لیے میرے پاس آیا، اور جب وہ سب قطار بنا کر میرے سامنے کھڑے ہو گئے تو ان میں سے ایک نے کاغذوں کا ایک پلندا میرے حوالے کیا جس میں ان سب کے کوائف لکھے ہوئے تھے: عہدہ، نام، تبادلے کی تاریخ، موجودہ تبادلے سے پہلے کے کام کے بارے میں فوج کے ہیڈکوارٹر کی رپورٹ، آخری وصول کردہ تنخواہ کی تفصیل، اور ان سیکشنوں کے نام جن سے وہ منسلک رہے تھے۔ ان میں سے سات نے اسٹریچر بردار کے طور پر تربیت پائی تھی اور صرف ایک اردلی کے درجے تک پہنچا تھا۔

یہ وہی تھا جس نے مجھے کاغذوں کا پلندا تھمایا تھا، اور میں اس کے شائستہ اطوار سے متاثر ہوا — ایسے اطوار جنھیں میری جگہ اگر کوئی باقاعدہ پیشہ ور فوجی ہوتا تو ڈھیلے ڈھالے پن اور فوجی طنطنے کی کمی سے تعبیر کرتا۔ وہ واضح طور پر اس گروہ کا قائد معلوم ہوتا تھا، اگرچہ اس کی آستینوں پر کوئی فیتہ نہیں لگا ہوا تھا؛ لیکن اس کے باوجود اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ اسے یہ کردار ادا کرنا پسند نہیں ہے۔ میں اس سے یہ کہتے کہتے رہ گیا کہ وہ قائدانہ کردار سونپے جانے کا مستحق نہیں ہے، لیکن معلوم نہیں کیوں یہ لفظ میرے

Scanned with CamScanner

حلق میں اٹک گئے: میں قسم کھا سکتا ہوں کہ اس کی عیاں شائستگی نے مجھے یہ الفاظ ادا کرنے سے باز رکھا۔ میں نے اس پر ایک اور نظر ڈالی۔ وہ کسان تھا — یہ بات اس کے ہاتھوں اور کلائیوں سے ظاہر تھی — اور میں دیکھ سکتا تھا کہ وہ ناخوش ہے۔ وہ بے بس دکھائی دیتا تھا، اس کے باوجود مدد کی التجا کرتا ہوا، اور کسی اندرونی خلجان میں گرفتار۔ یہ مٹیالا چہرہ تھا، مصری کا چہرہ، نیل کی ریت کی رنگت کا چہرہ۔

میں نے ان سب کے پتے درج کرنے شروع کیے، اور ان کے قائد نے اپنا پتا سب سے آخر میں درج کروایا — جو بجائے خود ایک عجیب بات تھی کیونکہ عموماً اس کی حیثیت کا حامل فرد خود کو دوسروں سے آگے آگے رکھتا ہے۔ جب اس کی باری آئی تو وہ فوجی سختی کے ساتھ تن کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے اس کا نام پوچھا، کیونکہ میرے سامنے پڑے کاغذات میں جو نام تھا وہ اتنی بھدی تحریر میں لکھا گیا تھا کہ میرے لیے اسے پڑھنا دشوار تھا۔

اس نے اپنا پہلا نام بتایا، لیکن باپ یا خاندان کا نام نہیں بتایا، جس کی اصل میں ضرورت تھی۔ میں نے دوبارہ پوچھا، اور اس بار اس نے اپنا پورا نام بتایا۔ اس کے کوائف اس طرح تھے: نیل کے ڈیلٹا کے ایک گاؤں کا رہنے والا، پرائمری اسکول پاس، اسکندریہ کے علاقائی بھرتی دفتر میں بھرتی ہوا، حلمیۃ الزیتون کے فوجی ہیڈکوارٹر کے طبی خدمات کے شعبے میں تعیناتی، پھر بنیادی طبی خدمات کے تربیتی کیمپ میں تبادلہ، اور پھر قاہرہ کے ایک فوجی اسپتال میں مستقل تعیناتی، جہاں میں بھی خدمت انجام دے رہا تھا۔ قاہرہ میں اس کے پاس کوئی پتا نہیں تھا، لیکن اس نے مجھے اپنے گاؤں کا نام لکھوایا۔ بھرتی کے لیے طلب کیے جانے سے پہلے کے پیشے کے خانے میں ''طالب علم'' لکھا ہوا تھا، جس نے مجھے شک میں ڈال دیا۔ طالب علم تھا تو پھر اسے کیسے طلب کر لیا گیا؟ لمحے بھر کو مجھے خیال آیا اس سے پوچھوں کہ اس نے اپنا فوجی خدمت ملتوی کیے جانے کا حق کیوں نہیں استعمال کیا، لیکن مجھے بہت سا کام کرنا تھا۔ باقی تفصیلات میں نے عام انداز سے درج کیں۔ جب میں نے اس کے بہن بھائیوں کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے پہلے بتایا کہ وہ پانچ بہنوں کا اکلوتا بھائی ہے۔ میں نے اپنا قلم رکھ دیا اور اس پر چلّانے ہی والا تھا کہ وہ فوجی خدمت سے مستثنیٰ ہے، لیکن اس سے پہلے کہ میں اپنا منھ کھول سکوں، اس نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا اور چلّایا، ''اوہ! میں کیسے بھول گیا!''

اب اس نے بتایا کہ وہ بہت سارے بھائیوں میں سب سے چھوٹا ہے، اور لکنت زدہ آواز میں

Scanned with CamScanner

اپنے پہلے بیان کی غیر اطمینان بخش وضاحت کرنے لگا۔اس کا خاندان اتنا بڑا ہے، اس نے کہا، کہ وہ تفصیلات یاد کرنے کی کوشش میں بوکھلا گیا تھا، خاص طور پر اس لیے کہ اس سے پہلی بار یہ سب تفصیلات پوچھی جا رہی ہیں۔

میں خود شہر میں پلا بڑھا ہوں اور دیہات کی ہر چیز مجھے کچھ عجیب سی لگتی ہے۔ مجھے یہ تک اندازہ نہ تھا کہ اس کسان رنگروٹ کا گاؤں کہاں واقع ہے؛ وہ کسی اسرار اور حکایات سے پُر سرزمین سے آیا ہوا لگتا تھا۔اس کے باوجود مجھے تعجب تھا کہ وہ طالب علم ہوتے ہوئے بھی بھرتی ہو گیا اور اپنے بھائیوں کی تعداد تک یاد نہیں رکھ سکتا۔

اول الذکر نکتے کے لیے بھی اس کے پاس ایک وضاحت موجود تھی۔اس نے کہا کہ وہ بیرونی طالب علم ہے اس لیے بھرتی سے استثنیٰ کا حق استعمال نہیں کر سکتا، لیکن مجھے اس بات پر یقین نہ آیا کیونکہ وہ خود بھی اس سے مطمئن معلوم نہیں ہوتا تھا۔کوئی نہ کوئی بات ضرور تھی اور وہ بات مجھے ایک نہ ایک دن اس کی دنیا میں لے جانے والی تھی۔ میرا خیال ہے ہم دونوں کو اندازہ ہو گیا کہ اسے کسی نہ کسی طرح مجھ کو پوری بات صاف صاف بتانی ہی ہوگی۔إن القلب أسبابه التى لا يعرفها العقل (دل ایسے اسباب رکھتا ہے جن کی عقل کو خبر نہیں ہوتی)، اور ایک انسان کے طور پر مجھے اپنے دوست کے دل کو اپنی محبت نذر کرنے کا حق حاصل ہے۔ مجھے محسوس ہوا کہ یہ نوجوان اعتراف کرنے کی انسانی خواہش کے ہاتھوں اذیت اٹھا رہا ہے، کسی ایسے فرد کی تلاش میں ہے جس سے اپنے دل کا راز کہہ سکے۔میں کسی بھی ایسے شخص کو پسند کرنے کو تیار رہتا ہوں جو مجھے یہ دیکھنے کا موقع دے کہ اس کے اندر کیا ہو رہا ہے، اور کئی واقعات کے زیر اثر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ جس نام سے بھرتی ہوا ہے وہ اس کا اصل نام نہیں ہے اور اس کی زندگی کی تفصیل ان کوائف سے کہیں زیادہ ہے جو کاغذات میں درج کیے گئے ہیں۔ان میں صرف ایک بات ایسی تھی جو اسے بالکل اچھی طرح یاد تھی، اور وہ تھی اس کی تاریخ پیدائش۔ ہر صبح ڈیوٹی افسر حاضری لینے کے لیے سب کے نام پکارتا، اور ہم سب نے محسوس کیا کہ وہ اپنا کاغذی نام پکارے جانے پر شاذ ہی جواب دیتا تھا۔اس کا نام کئی بار پکارا جاتا اور ڈیوٹی افسر اس کی غیر حاضری لگانے ہی کو ہوتا، تب اس کے پاس کھڑا کوئی نہ کوئی ساتھی اسے ٹہوکا دیتا کہ اس کا نام پکارا جا رہا ہے۔اس پر وہ جواب دیتا اور ڈیوٹی افسر اسے ڈانٹتا اور جاگ اٹھنے کو کہتا، پھر طنز کے ساتھ سوال

Scanned with CamScanner

کرتا کہ آیا کوئی اور رنگروٹ بھی ایسا ہے جسے اپنا نام یاد نہ آیا ہو۔ یا پھر اس سے اپنے کان صاف کرنے کو کہا جاتا۔ لیکن ٹھیک یہی واقعہ اگلی صبح بھی پیش آتا۔ صرف میں تھا جس نے اس بات پر باقاعدہ غور کیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ احمق نہیں ہے؛ اس کے برعکس، وہ بہت ذہین اور ہوشیار تھا، اس کی سماعت بہت اچھی تھی اور وہ ہمیشہ صورت حال کو بھانپ کر اس کے مطابق فوراً عمل کرتا تھا۔ ایک ہفتہ اس طرح گزرنے کے بعد کمانڈر نے اسے طبی معائنے کے لیے جانے کو کہا اور اس کی سماعت کو بالکل درست قرار دیا گیا۔ یہ بات بہت جلد بھلادی گئی، لیکن میرے ذہن میں سوالیہ نشان قائم رہا۔ مجھے اس بات کا بہت قوی احساس تھا کہ وہ ایک عجیب قسم کی زندگی گزار رہا ہے؛ جب وہ مارچ کرنے والوں کی قطار میں سب کے ساتھ قدم اٹھاتا تو یہ اس کا قدم نہ ہوتا؛ جب بات کرتا تو اس کی زبان وہ باتیں ادا کر رہی ہوتی جو اسے مجبوری میں ادا کرنی پڑتی تھیں، وہ باتیں جن کا اس پر اطلاق نہ ہوتا تھا۔ اس کے وجود کے اندر سے پھوٹنے والی چیزیں تھیں اس کی گریزپا نگاہ، عجیب طرح کی بے قراری، جذبات میں ہلچل، ایک خاص قسم کی دھڑکن — میں نہیں جانتا کہ ان کو لفظوں میں کیونکر بیان کروں۔

ایک شام ہم باتیں کر رہے تھے، اور وہ دیر تک ان لوگوں کی باتیں کرتا رہا جو بھوکے سوتے اور بڑی مشکل سے گزربسر کرتے ہیں۔ اس پر مجھے تعجب ہوا، کیونکہ کاغذات میں درج تھا کہ اس کا باپ ایک عمدہ ہے، اور عمدہ مالدار لوگ ہوتے ہیں۔ جب میں نے کہا کہ میں غریبوں اور محتاجوں کے لیے اس کی فکرمندی پر کس قدر حیران ہوں، تو وہ اچانک بول پڑا، "مگر میں بھی تو... " پھر وہ رک گیا، اور میں نے وہ سوال نہیں پوچھا جو میرے چہرے پر صاف جھلک رہا ہوگا۔ خزاں کے معتدل موسم کے باوجود اس کا چہرہ اچانک پسینے سے جھلملا گیا، اور مجھے یہ سوال کرنے کی خواہش نہ ہوئی کہ کسی عمدہ کا بیٹا کیسے خود کو غریبوں میں شامل کہہ سکتا ہے۔

ایک اور رات کی بات ہے کہ ہم دونوں ڈیوٹی پر تھے۔ گارڈ کی ڈیوٹی کرنے والے کی حیثیت سے اسے دس بجے اور پھر صبح چار بجے مجھے رپورٹ کرنا تھا۔ پہلی رپورٹ تو معمول کے مطابق ہوئی، لیکن دوسری رپورٹ کے وقت وہ بیک وقت پُرجوش اور آدھا سویا ہوا محسوس ہوا۔ میں نے اس کو جاری کی گئی رائفل اور گولیوں کے دس راؤنڈ واپس لے کر ان کا معائنہ مکمل کیا، اور جس وقت وہ بیرک میں واپس جانے کے لیے مڑ رہا تھا، اس نے اچانک کہا، "آج مجھے معلوم ہوا کہ میرا باپ زندگی بھر کس

Scanned with CamScanner

تجربے سے گزرتا رہا۔"

"تمھارا باپ؟"

"وہ بھی چوکیداری کرتا رہا ہے،" وہ الجھے ہوئے لہجے میں بڑبڑایا۔

بڑی کوشش کر کے میں نے اپنی حیرت کو چھپایا اور یوں ظاہر کیا جیسے کوئی بات نہیں ہوئی ہے۔ مجھے محسوس ہو گیا کہ اس معاملے میں کوئی راز ہے، اور سوچنے لگا کہ وہ کیا ہو سکتا ہے۔ اگلے چند دن اس کے لیے بہت دشوار تھے، ہم متواتر باتیں کرتے اور اس موضوع پر آنے سے کتراتے رہے۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ سیسے کی طرح بھاری اور لوہے کی طرح ٹھنڈے کسی بوجھ کو اٹھاتے اٹھاتے تھک گیا ہے، لیکن میں اسے اپنا راز کھولنے پر مجبور نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہم سب کے راز ہوتے ہیں، میں نے خود کو سمجھایا، اور ہر ایک کو اپنا راز اپنے تک رکھنے کا حق ہے۔ مجھے وہ لمحہ ٹھیک ٹھیک یاد نہیں جب اس کے اندر جمع ہوتا ہوا درد کا لاوا آخر کار پھوٹ بہا۔

کچھ مستقل احکام تھے جو مجھے نئے رنگروٹوں کے سلسلے میں نافذ کرنے ہوتے تھے، لیکن اصل میں ایسا کبھی کیا نہیں جاتا تھا۔ ان احکام کا تعلق دھات کے شناختی بلّوں اور واجبات وصول کرنے والے وارثوں کے ناموں سے تھا؛ ان کا مقصد یہ تھا کہ کسی رنگروٹ کے مارے جانے کی صورت میں اس کی شناخت ہو سکے اور اس کے واجبات اس کے قریب ترین عزیز تک پہنچائے جا سکیں۔ ایک روز سخت تنبیہ موصول ہوئی کہ دھات کے یہ بلّے سب رنگروٹوں کو جاری کیے جائیں اور ہر ایک سے اس کے وارث کے نام والا فارم بھروایا جائے جسے "جنگ میں کام آنے کا فارم" کہا جاتا تھا۔ جب مصری کو دھات کا بلّا دیا گیا تو وہ سخت تناؤ کے عالم میں اسے ہاتھ میں لے کر گھورنے لگا، پھر اس نے پوچھا کہ یہ کس کام کے لیے ہے۔ افسر نے جواب دیا کہ ہر بلّے پر سپاہی کا نام، شناختی نمبر اور خون کا گروپ کھدا ہوا ہے اور اسے گردن میں دھات کی زنجیر سے لٹکایا جاتا ہے۔ یہ شناخت کے لیے ہے، کیونکہ محاذ جنگ پر سپاہی کے کام آنے کی صورت میں اگر اس کی لاش جل کر کوئلہ بھی ہو جائے تو یہ بلّا سلامت رہتا ہے۔ یہ سپاہی کی شناخت میں مدد دیتا ہے اور اس بات کی شہادت کہ یہ ایک شہید کی گردن کی زینت رہا ہے۔

پھر ہم نے اسے وہ فارم دیا جس میں ہر رنگروٹ کو یہ اعلان کرنا ہوتا تھا کہ لڑائی میں اس کے

Scanned with CamScanner

کام آنے کی صورت میں اس کے واجبات اس کے کس قریبی عزیز کو پہنچائے جائیں۔اس شخص کا نام، سپاہی سے اس کا رشتہ، اس کا مکمل پتا اور قریب ترین ڈاک خانے کا نام اس فارم میں لکھا جاتا تھا۔ سپاہی کے دستخط کے نیچے یونٹ کمانڈر کی طرف سے تصدیق کے لیے جگہ تھی کہ اوپر کے دستخط مذکورہ سپاہی نے کیے ہیں۔ پھر اس فارم کو مہر لگا کر اس رنگروٹ کی فائل میں لگا دیا جاتا تھا۔لڑائی میں کام آنے کی صورت میں یہی دستاویز واجبات کی ادائیگی اور باقی تمام معاملات کے سلسلے میں کارآمد ہوتی تھی۔ ہر شخص کو یاد ہے کہ کس طرح مصری نے اس فارم کو پُر کرنے سے عجیب طور پر انکار کر دیا تھا۔اس نے اپنے وارث کا نام لکھے بغیر فارم پر دستخط کر دیے تھے۔ جب افسر نے اس سے وضاحت طلب کی تو اس نے وضاحت کرنے سے بھی انکار کر دیا۔

''اچھا، تو کم از کم رشتہ ہی لکھ دو،'' افسر نے تجویز پیش کی۔ ''ماں یا باپ یا بہن یا کوئی بھی۔''

وہ اس پر بھی راضی نہ ہوا، لیکن دو دن بعد اس نے فارم پر صرف یہ دو لفظ لکھنے کا فیصلہ کیا: ''قانونی وارث۔'' اس سے کہا گیا کہ یہ بات واضح نہیں ہے اور اسے کوئی صاف رشتہ لکھنا چاہیے، لیکن اس نے جواب دیا کہ اس نے جو کچھ لکھا ہے وہ کافی ہے اور یہی درست طریقہ ہے۔ سب نے یہی خیال کیا کہ یہ خاندان کے اندرونی جھگڑوں کا شاخسانہ ہوگا، اور فرض کر لیا کہ کسی دن وہ دفتر میں آ کر فارم پر اپنے کسی عزیز کا نام لکھ دے گا۔

جب اس نے فارم افسر کے حوالے کیا، اس وقت تک وہ لوگ اس سے پوری طرح بیزار ہو چکے تھے۔ وہ دوپہر کے وقت میرے پاس آیا اور بولا کہ اسے ایک اہم معاملے کے بارے میں مجھ سے بات کرنی ہے، اور ہم نے طے کیا کہ شام کو، پرچم اور مادرِ وطن کی سلامی کی پریڈ کے بعد ملیں گے۔ لیکن پریڈ کے بعد وہ کہیں غائب ہو گیا؛ میں نے بہت ڈھونڈا لیکن وہ کہیں نہ ملا۔

اس وقت تک وہ برداشت کی حد کو پہنچ چکا تھا۔ جب اگلی شام میری اس سے مڈبھیڑ ہوئی تو اس نے مجھ سے پوچھا کہ آیا وہ لڑائی میں کام آنے والا فارم فوج کے دستاویز خانے کو بھجوا دیا گیا ہے۔ میں نے کہا کہ مجھے معلوم نہیں۔ اس کے دوسرے سوال نے مجھے چونکا دیا: کیا کسی کو اپنے فارم میں تبدیلی کا حق حاصل ہے؟ مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا، اور یوں بھی اس فارم کو معمول کی غیر اہم رسمی کارروائی سمجھا جاتا تھا۔ میں نے کہا کہ میری ذاتی رائے میں اس فارم میں ترمیم کا مطلب اسے منسوخ کر کے نئے سرے

Scanned with CamScanner

سے نیا فارم بھرنا اور تصدیق کرانا ہوگا، جو کوئی سادہ کام نہیں ہے۔

بات کرنے کے دوران میری توجہ محض اس موضوع پر مرکوز رہی اور میں نے خود اس پر کوئی دھیان نہ دیا؛ لیکن جس وقت میں اس عمل کے پیچیدہ مرحلوں کی وضاحت کر رہا تھا وہ اپنی جیبوں میں کوئی چیز ڈھونڈنے لگا۔ بظاہر اس نے اس چیز کو بہت احتیاط سے چھپایا تھا کیونکہ یہ اس کی سب سے اندرونی جیب میں رکھے فوجی شناختی کارڈ کی تہوں میں سے برآمد ہوئی— اس نے کیا یہ تھا کہ شناختی کارڈ کو دو حصوں میں کاٹ کر اس چیز کو اس کے پیچھے رکھا اور پھر کارڈ کو دوبارہ چپکا کر پلاسٹک کے کور میں رکھ دیا تھا۔ اس نے چھپایا ہوا کاغذ نکالا جسے تہہ کر کے شناختی کارڈ کے برابر کر لیا گیا تھا، پھر اسے احتیاط سے کھول کر سیدھا کیا۔ جس وقت وہ اسے سکون، احتیاط اور آہستگی سے کھول کر سیدھا کر رہا تھا، اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور اس کے احساسات اس کی آنکھوں سے ظاہر ہو رہے تھے۔ اس نے اس کاغذ کو کھول کر اس میز پر رکھ دیا جس پر ہم آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ پھر اسے گھما کر اس کا رخ میری طرف کر دیا اور اس پر سے ہاتھ ہٹا لیا۔ میں اس عجیب طرزِ عمل پر حیران ہو کر اس کے چہرے کو دیکھنے لگا۔ اس نے اس کاغذ کی طرف دیکھ کر مجھے اس کو پڑھنے کے لیے کہا، اور پھر اتنا اور کہا کہ وہ کسی سوال کا جواب نہیں دے گا۔

یہ کاغذ کسی اصل دستاویز کی نقل تھا، اس پر اوپر کی طرف ''وزارتِ تعلیم'' اور اس کے نیچے ''قاہرہ امتحانی بورڈ'' لکھا تھا۔ اس کاغذ پر تصدیق کی گئی تھی کہ اس کا حامل پرائمری اسکول کی تعلیم مکمل کر چکا ہے اور مختلف مضامین میں اس نے کتنے نمبر حاصل کیے ہیں۔ تمام مضامین میں حاصل کیے ہوئے نمبر اوسط سے زیادہ، بلکہ غیر معمولی تھے۔ اس نے میرے ہاتھ کو آہستہ سے تھپتھپا کر مجھے میرے خیالات سے چونکا دیا، اور جب میں نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا تو اس نے کاغذ پر لکھے ہوئے طالب علم کے نام کی طرف اشارہ کیا۔ ''مصری،'' میں نے پڑھا۔ پھر اس نے کاغذ پر چھپی ہوئی طالب علم کی تصویر کی طرف اشارہ کیا اور میں نے دیکھا کہ یہ وہی شکل ہے جو میرے سامنے بیٹھے ہوئے شخص کی ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ خود میری توجہ اس طرف نہیں گئی تھی، اور پہلے تو میری سمجھ میں نہ آیا کہ اس کا کیا مطلب نکالوں۔ میں نے سوچا کہ ملتے جلتے نام یا ملتی جلتی شکل والے دو اشخاص ہوں گے، یا یہ کہ یہ اس کا نام نہیں بلکہ عرفیت ہوگی۔ میں نے سوچا کہ شاید وہ نام میں درستی کر کے اس بات کو قانونی طور

پر درج کروانا چاہتا ہو کہ یہ دونوں نام ایک ہی شخص کے ہیں، جس کے لیے اسے دو افسروں اور یونٹ کمانڈر کی تصدیق کی ضرورت پڑتی، اور پھر اس کاغذ کو فوج کے دستاویز خانے میں بھیجا جاتا۔ میں اپنے ذہن میں اس عمل کے مرحلوں کو دہرا رہا تھا— میں نے فرض کیا کہ وہ میرے پاس اسی لیے آیا ہے کہ میں انتظامی دفتر میں کام کرتا ہوں— کہ اس نے جھٹکے سے مجھے میرے خیالات سے باہر نکال لیا۔

''یہ میں ہوں،'' وہ بولا۔

وہ سرٹیفکیٹ پر لگی ہوئی تصویر کی طرف اشارہ کر رہا تھا، جو کسی دیہی علاقے کے طالب علم کی تصویر تھی، جس کی ہلکی ہلکی مونچھیں پھوٹ رہی تھیں، داڑھی پوری طرح نکلنے سے پہلے ہی مونڈ لی گئی تھی، بال بکھرے ہوئے تھے اور گلے میں ٹائی تھی جو بہت استعمال ہونے کے باعث مڑی تڑی دکھائی دیتی تھی— یقیناً فوٹو گرافر یہ ٹائی امتحان کے لیے تصویر کھنچوانے والے ہر طالب علم کے گلے میں پہنا دیتا ہوگا، اور طالب علم بھی اسے خوش قسمتی کی نشانی سمجھ کر پہن لیتے ہوں گے۔ جہاں تک کوٹ اور قمیص کا تعلق ہے، وہ کبھی کسی مالدار طالب علم، شاید کسی عمدہ کے فرزند، کی ملکیت رہ چکی ہوگی، اور فوٹو گرافر یہ چیزیں یونیفارم کے طور پر تصویر کھنچوانے والے ہر طالب علم کے حوالے کر دیتا ہوگا۔

اس نے اپنی انگلی کو کاغذ پر حرکت دی اور ایسا کرنے میں اسے اتنے زور سے دبایا کہ مجھے لگا وہ کاغذ پر لکھے ہوئے لفظوں کو مٹا دینا چاہتا ہے، مجھے ڈر ہوا کہ کہیں کاغذ پھٹ نہ جائے۔ اس کی انگلی طالب علم کے نام پر پہنچی، اس کا ناخن مصری کے 'م' کے بالکل برابر آ گیا۔

''یہ میرا نام ہے،'' اس نے آہستہ سے کہا، اور نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔

جیسا کہ میں نے کہا، میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے۔ میں بالکل ہکا بکا ہو کر، تناؤ کو کم کرنے کی غرض سے، ہنس پڑا اور میرا ہاتھ اٹھ کر اس چھوٹی سی میز پر بلند ہوا جس پر ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ یہ یونٹ کے پیچھے واقع ایک قہوہ خانہ تھا۔

''اس میں کیا کہانی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے دور فاصلے پر دیکھا، گلی میں اترتی ہوئی شام کا منظر اس کی آنکھوں کی پتلیوں میں جھلک آیا۔ اس کی زبان لڑکھڑانے لگی۔ ''کہانی... کہانی... کہانی... وہ تو...''

مجھے یاد ہے کہ کہانی کا لفظ چار بار دہرانے کے بعد ہی ساری تفصیل اس کی زبان سے ادا ہو

Scanned with CamScanner

سکی، اور اس نے مجھے اس دن کے بارے میں بتایا جب اس کے باپ نے اس سے یہ بات چھیڑی تھی۔ کہانی کے مختلف حصے بیان کرتے ہوئے وہ خوش دکھائی دیتا تھا جیسے کسی نشہ آور سیال کے چشمے پر اپنی پیاس بجھا رہا ہوں۔ اس کے چہرے پر چھائی ہوئی اسرار کی پرتیں ایک ایک کر کے پگھلنے لگیں اور پہلی بار اسے اپنی یادداشت میں محفوظ چیزوں کی صحبت میں سکون محسوس ہوا۔ عموماً وہ کچھ زیادہ بات چیت نہیں کرتا تھا لیکن اس وقت اسے جیسے اپنی آواز کا نشہ سا ہو گیا تھا اور وہ پرسکون لہجے میں بات کر رہا تھا۔ اس نے اپنی کہانی سنائی اور جوں جوں رات گزرتی گئی مجھے اس کے اندر جاگتے ہوئے جوش و خروش کا احساس ہوتا گیا۔ اس کی پتلیاں پھیل گئیں اور وہ گویا زندگی پر نئے زاویے سے نگاہ ڈالنے لگا۔ اس نے بتایا کہ کس طرح وقت گزرتا گیا اور وہ اپنی پڑھائی جاری نہ رکھ سکا؛ کس طرح اسے پڑھائی ادھوری چھوڑ کر گاؤں کی گلیوں میں چلتے ہوئے لوگوں کی طنز آمیز باتیں سننی پڑیں۔

پھر وہ اس دہشت ناک دن کی روداد پر آیا جب اس کے باپ نے اس سے یہ موضوع چھیڑا تھا۔ مجھے یہ سب سخت صدمہ انگیز اور مکمل طور پر عجیب و غریب معلوم ہوا — جو کچھ مصری نے مجھے بتایا وہ آخری چیز تھی جسے سننے کی توقع کی جا سکتی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا جب میں نے اس کا نام لیا، اور پہلے پہل مجھے یہ نام لینے میں دشواری ہوئی، کیونکہ جو شخص میرے سامنے بیٹھا تھا وہ میرے ذہن میں اسی نام سے مطابقت رکھتا تھا جس سے میں نے اسے یونٹ میں آنے کے وقت سے جانا تھا۔ جب اس نے اپنی کہانی پوری کی تو میرے ذہن میں بہت سے سوالات ابھرے، جنھیں پہلے پہل میں نے اگلی بار پر اٹھا رکھنے کا ارادہ کیا، لیکن یہ سب کچھ اس قدر تکلیف دہ تھا کہ آخرکار میں نے خود سے کہا، ''ساری بات ابھی ہو جائے تو بہتر ہے۔''

میں نے وہ سوال پوچھا جو میرے دماغ پر ہتھوڑے برسا رہا تھا۔ ''تم اس پر راضی کیسے ہو گئے؟'' میں نے کہا۔

''میرے پاس اور کوئی راستہ نہیں تھا،'' اس نے آہستہ سے جواب دیا۔

میں اس جواب سے مطمئن نہ ہوا۔ میں نے سوچا کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے اسے درست نہیں سمجھتا اور اب اس کا جواز پیش کرنے کی کوشش میں ہے (مجھ سے زیادہ خود اپنے سامنے)، اور اب تک اپنے آپ کو قائل کرنے کی جدوجہد کر رہا ہے۔ اس نے ایک لمبی تقریر شروع کر دی جس میں مجھ سے التجا کی

کہ کہیں میں یہ نہ سمجھوں کہ اسے یہ سب کرنے کا بھاری معاوضہ دیا گیا ہے۔ اس نے معاوضے کی بات تک نہیں سوچی، وہ بولا، جس کی ایک سادہ سی وجہ ہے: اس نے جو کچھ کیا اس کے سوا اس کے اور اس کے خاندان کے پاس کوئی اور راستہ نہیں تھا۔

''مجھے یقین تھا:'' اس نے کہا، ''کہ ہمیں اپنی زمین عمدہ کے حوالے کرنی ہی پڑے گی۔ ہم حکام کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ اگر زمین عمدہ نے لے لی تو ہم کس طرح زندہ رہیں گے، تو انھوں نے جواب دیا کہ اس کا اصل مسئلے سے کوئی تعلق نہیں؛ ہمیں پہلے اپنی زمین حوالے کرنی ہوگی، اس کے بعد ہم چاہیں تو عدالت میں جا سکتے ہیں۔ عدالتوں کے دروازے سب کے لیے کھلے ہوے ہیں، انھوں نے کہا، کیونکہ یہ مصر کی تاریخ کا ایسا وقت ہے جب انصاف کی حکمرانی کسی بھی گزشتہ دور سے زیادہ ہے۔ یہ سب باتیں انھوں نے ہمیں دھوکا دینے کے لیے کہی تھیں کیونکہ یہ قانونی نہیں بلکہ سیاسی معاملہ تھا۔ کسان اس مسئلے پر دو گروہوں میں بٹ گئے تھے، ایک گروہ کا کہنا تھا کہ ہمیں اپنی زمین حوالے کرنے کے بعد عدالت میں جانا چاہیے، اور دوسرے گروہ کے لوگ قسم کھا کر کہتے تھے کہ وہ اپنی زمین سے کبھی دستبردار نہیں ہوں گے چاہے اس کا نتیجہ حکومت سے تصادم کی صورت ہی میں کیوں نہ نکلے۔ اس دوران عمدہ ایک تیسرے گروہ سے بات چیت کرنے میں مصروف تھا، اور میرا باپ بھی اس گروہ میں شامل تھا۔

''پھر یہ فوجی بھرتی کا معاملہ سامنے آ گیا اور عمدہ نے میرے باپ سے کہا، 'زمین اپنے پاس رکھنے کے بدلے میں تمھیں اپنے بیٹے کو فوج میں بھیجنا ہوگا۔' میرا باپ اس پر راضی ہو گیا — بلکہ پورے خاندان کو اس سودے پر بہت خوشی ہوئی — لیکن میں نے اس پر عمل کرنے سے، بلکہ اس پر گفتگو تک کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ ویسے بھی ہمارے گاؤں کے لوگوں کو پتا نہیں کہ گفتگو کسے کہتے ہیں۔ میرے گھر والوں نے جن نظروں سے مجھے دیکھا ان سے صاف جھلکتا تھا کہ ان کے خیال میں میرے انکار کی وجہ میری خودغرضی ہے اور میں خاندان کے لیے قربانی نہیں دینا چاہتا۔ ان کو تو یہ تک اندازہ نہ تھا کہ میں اسے قربانی کیوں کہہ رہا ہوں۔ ہمیں اپنی صورت حال کا کوئی نہ کوئی حل تو ڈھونڈنا ہی تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر میں یہ پیشکش قبول کر لوں اور گاؤں سے باہر نکل جاؤں تو شاید کوئی راستہ ملے — کون کہہ سکتا ہے! کیا پتا میرا مستقبل اسی میں پوشیدہ ہو۔ اتفاق سے میں نے خود بھی ان دنوں

Scanned with CamScanner

فوج میں بھرتی ہونے کے بارے میں سوچا تھا۔ میں نے بلکہ ایک دوست کے دیے ہوئے اخبار میں سے بھرتی کا ایک اشتہار بھی کاٹ کر رکھا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے بہت سے فائدے ہیں۔ اس لیے میں راضی ہو گیا، لیکن اس دن سے لے کر اب تک عجب نیم بے ہوشی کے عالم میں ہوں، اور مجھے یہ تک یاد نہیں کہ میں اسکندریہ کیسے پہنچا تھا۔ وہاں سے میرا تبادلہ حلمیۃ الزیتون کر دیا گیا اور آخرکار میں اس یونٹ میں آ پہنچا۔''

اس سے پہلے کہ میں کہانی کو آگے بڑھاؤں، چند باتیں ایسی ہیں جن کا ذکر یہیں کر دینا مناسب ہے، یعنی یہ کہ مصری کے خیالات کیا تھے اور وہ دنیا کو کس طرح دیکھتا تھا۔ اگرچہ وہ باتونی بالکل نہیں تھا، لیکن وہ جو کچھ بھی کہتا اس سے اس کا، بقول خود اس کے، انتقام لینے کا عزم ظاہر ہوتا، یا ایسا معلوم ہوتا کہ وہ مایوسی کی گہرائیوں میں گرتا چلا جا رہا ہے۔ ''مصری ضائع ہو گیا،'' وہ کہتا۔ میرے سوا کسی اور نے اسے یہ کہتے نہیں سنا تھا۔ میرے سوا کوئی شخص کبھی نہیں جان سکے گا کہ ان لفظوں کے ایک ایک رکن کو ادا کرتے ہوئے اس کے لہجے میں کیسا جلتا ہوا طیش پوشیدہ ہوتا تھا۔ یہ عیاں جذبہ، جو مجھے گہرائی تک چھید ڈالتا تھا، میرا نجی تجربہ رہے گا: میں اسے آپ تک کبھی نہیں پہنچا سکوں گا۔ اس وقت مجھے نہ جانے کیوں یہ خیال آتا کہ مصری کے ساتھ جو کچھ پیش آیا اس کا ذمے دار میں ہوں۔

مصری ایک نوجوان تھا جس میں امنگیں ہمہ ہماری تھیں اور جس کی ذات میں ہمارے ملک میں پائے جانے والے تضادات موجود تھے: دنیا سے لگاؤ مگر ساتھ ہی بے نیازی بھی، جرأت اور جھجک دونوں بیک وقت موجود، شجاعت اور خوف، ظاہر پُرسکون اور باطنی وجود غصے اور بغاوت سے ابلتا ہوا۔ میں نے اسے بیان کرنے کے لیے موزوں الفاظ ڈھونڈنے میں بہت وقت لگایا ہے، اور میرا خیال ہے آخرکار میں نے انھیں پا لیا ہے: مشتبہ؟ مشکوک؟ نوعمر؟ اور یہ خصوصیات اس میں ہمیشہ رہنے والی تھیں، خواہ وہ نوے سال کا ہو کر مرتا۔ جب میں 'نوعمر' کہتا ہوں تو میرا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ ہمیشہ لڑکیوں کا پیچھا کیا کرتا تھا؛ اس بیچارے کی تو اپنی مختصر زندگی میں ایک لڑکی سے بھی واقفیت نہ ہو سکی۔ اس کی المناک کہانی سننے کے بعد مجھے خیال آیا کہ اگر اس نے اس شے کو جانا ہوتا جسے لوگ 'محبت' کہتے ہیں اور دن بھر جس کا ذکر کیا کرتے ہیں، تو کیا وہ خوش رہتا۔ میں نہیں جانتا۔

مصری کی نوعمری کی معصومیت اس کے اشتباہ اور تشکیک سے پھوٹتی تھی؛ اس نے دنیا کو سوچے

Scanned with CamScanner

بغیر قبول کیا تھا لیکن جب اس کا ٹکراؤ حقیقت سے ہوا تو اس کی پوری دنیا غیر یقینی پن سے بھر گئی۔ کیا یہی وجہ تھی کہ اس کے ساتھ یہ سب کچھ پیش آیا؟ میں اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا، جس کی سادہ سی وجہ یہ ہے کہ میں فوج میں بھرتی ہونے سے پہلے کے مصری سے واقف نہیں۔ میں جو کچھ بھی کہہ رہا ہوں اسے صرف میری رائے سمجھا جانا چاہیے، لیکن میرا خیال یہی ہے کہ مصری تقدیر کے راستے میں آ گیا۔ ہر پیڑھی کی اپنی تقدیر ہوتی ہے: مثلاً ہماری پیڑھی کے مصریوں کی تقدیر... کیا مجھے آگے کچھ کہنے کی ضرورت ہے؟ ہماری امنگیں زیادہ تھیں اور ان تک پہنچنے کی ہماری طاقت کم، اور جب ہم قدم اٹھاتے تو محسوس ہوتا کہ ہمارے پیروں کے نیچے کی زمین ٹھوس نہیں ہے۔ جب ہم بادلوں کی طرف نگاہ اٹھاتے تو ہمارے سروں پر سے آسمان غائب ہو جاتا۔ جس لمحے ہم نے آگے بڑھ کر اپنی پیڑھی کے بیچ کو گرفت میں لیا، ٹھیک اسی لمحے ہمارے رہنما نے اپنی قربانی دی اور ہمیں ایسے وقت میں چھوڑ کر چلا گیا جب ہمیں اس کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔

یہ آخری باتیں میں نے غور کیے بغیر اسی طرح کہہ دی ہیں جس طرح خیالات میرے ذہن میں آئے؛ اگر میں ان پر محتاط انداز میں غور کرتا تو شاید انھیں نہ کہتا۔ میں سخت دباؤ کے عالم میں بات کر رہا ہوں کیونکہ مصری اور اس کی کہانی کا محض ذکر آتے ہی مجھ پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے، لیکن میں نے 'قسمت' اور 'تقدیر' جیسے لفظ استعمال کیے ہیں، اور یہی درست ہیں۔ اب میں یہ لفظ واپس نہیں لوں گا۔

مگر ہمیں مصری کی طرف لوٹنا چاہیے۔ اس کی زندگی کے ابواب ختم نہ ہونے والی اذیت سے بھرے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود میں یہ نہیں کہوں گا کہ جو کچھ ہوا وہ 'ناگزیر قسمت' یا 'تقدیر کا لکھا' تھا، کیونکہ بات صرف اتنی نہیں۔ اس کا جواب اس خلیج میں ہے جو عمدہ کے اونچے سفید، رات کو چمکنے والے مکان اور اس شکستہ مکان بلکہ جھونپڑی کے درمیان واقع ہے جس میں مصری کا خاندان رہتا ہے، اس فرق میں ہے جو خود عمدہ کے ہاتھی جیسے وجود اور مصری کے باپ کے درمیان ہے جس کی کھال ہڈیوں پر اتنی سختی سے منڈھی ہوئی ہے کہ لگتا ہے وہ کسی بھی لمحے کھال کو پھاڑ کر باہر نکل آئیں گی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے میں اس سوال سے نظریں چرا رہا ہوں جو بہت غور کا تقاضا کرتا ہے: مصری فوج میں کیوں بھرتی ہوا؟ کیا اسے سورما کی موت مرنے کی خواہش تھی؟ اس کے پاس اس کے بہت موقعے تھے، وطن کی حفاظت کرتے ہوئے جان دینا ان میں سے پہلا تھا۔ میں حب الوطنی کا سوال نہیں اٹھاؤں گا کیونکہ ہم

Scanned with CamScanner

سب مصر سے اپنے اپنے انداز میں محبت کرتے ہیں، لیکن ہم دراصل کس مصر سے محبت کرتے ہیں؟ اس مصر سے جہاں لوگ بھوکے مر رہے ہیں یا اس مصر سے جہاں وہ بسیار خوری سے مر رہے ہیں؟ لیکن میں نے مصری کی بات چھوڑ کر اپنی بات شروع کر دی۔ میں نے کسی بات کی وضاحت کا ارادہ کیا تھا اور کہاں سے کہاں نکل گیا۔ مجھے ان باتوں پر واپس لوٹنا چاہیے جو مصری نے کہی تھیں۔

''مجھے عمدہ کے بیٹے کی جگہ فوجی خدمت کے لیے بھیجا گیا تا کہ میرا خاندان محفوظ رہ سکے — بلکہ میرے گھر والوں نے خود اصرار کر کے مجھے بھیجا۔ میں بھرتی ہو گیا لیکن عجیب بات ہے کہ ان کو اس کا معاوضہ اب تک نہیں ملا ہے — ہم نے سمجھوتا کر لیا، اور یہ وہ راستہ ہے جس کا کوئی خاتمہ نہیں۔ میں ایک بار چھٹی پر گھر گیا اور ہر شخص کو بتا دیا کہ میں فوج میں باقاعدہ ملازمت کروں گا کیونکہ میں نے جان لیا ہے کہ میں اپنی تعلیم مکمل نہیں کر سکتا۔ ان سب نے کہا کہ یہ ایک حقیقت پسندانہ اور باعزت راستہ ہے کیونکہ میں فوج کے شام کے اسکول میں پڑھ سکتا ہوں؛ پھر ثانوی اسکول پاس کرنے کے بعد میں یونیورسٹی یا فوج کے کالج میں داخلہ لے سکتا ہوں، اور ایک بار اعلیٰ تعلیم حاصل کر لینے کے بعد مجھے ترقی پر ترقی پانے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

''میرے فوج میں بھرتی ہو جانے کے بعد عمدہ نے — مجھے گاؤں والوں نے بتایا — آنا کانی شروع کر دی اور میرے باپ کو زمین نہیں دی۔ پہلے اس نے یہ زمین نئے قانون کے تحت اس سے لے لی، پھر اس کا کچھ حصہ بٹائی پر کاشت کے لیے اس کے سپرد کیا، لیکن اس غیر منصفانہ بندوبست کے سلسلے میں کسی قسم کا باقاعدہ معاہدہ کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ مجھے عمدہ کے برتاؤ پر اتنا غصہ آیا کہ میں نے جا کر اس سے ملنے کا ارادہ کیا، لیکن میرے باپ نے یہ کہہ کر مجھے روکنے کی کوشش کی کہ سب کچھ خود بخود ٹھیک ہو جائے گا اور مجھے مداخلت کر کے اس میں گڑبڑ پیدا نہیں کرنی چاہیے۔ اس بات نے مجھے قائل نہیں کیا اور میں عمدہ سے ملنے کے ارادے پر قائم رہا، لیکن وہ کہیں گیا ہوا تھا — اُن دنوں وہ اکثر کہیں گیا ہوا ہوتا تھا! پھر میری چھٹی ختم ہو گئی اور میں یونٹ میں واپس لوٹ آیا۔

''اس صورت حال کا کوئی نہ کوئی حل تو ضرور ہو گا،'' مصری نے پُرعزم لہجے میں کہا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس کے ذہن میں کیا ہے — کیا وہ عمدہ پر دباؤ ڈالنے کا ارادہ رکھتا ہے کہ وہ اپنا وعدہ پورا کرے، یا کیا؟ اس بات کو اس نے فوراً مسترد کر دیا؛ اس نے کہا کہ وہ گاؤں والوں کا سامنا نہیں کر

سکتا کیونکہ اس کے باپ نے عمدہ کے خلاف مزاحمت میں ان سب کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ یہ درست ہے کہ ان کی مزاحمت سے کچھ حاصل نہیں ہوا— ان کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ انھوں نے زمین کا قبضہ چھوڑ دیا اور پھر عدالت سے رجوع کیا، اس طرح معاملے کا سیاسی پہلو گم ہو گیا اور یہ ان ہزاروں مقدموں میں شامل ہو گیا جو پچھلے چند سال میں عدالتوں میں دائر کیے گئے ہیں۔ اگرچہ اسے اپنے باپ کے اختیار کیے ہوے طرزِ عمل پر شرمندگی تھی، پھر بھی مصری کا یہی خیال تھا کہ پورے معاملے کا انکشاف کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

''لیکن کس طرح؟'' میں نے حیران ہو کر کہا۔

''میں کمانڈانٹ سے ملاقات کا وقت مانگوں گا،'' اس نے دھیمی آواز میں کہا، ''اور اسے پوری بات بتا دوں گا۔''

''لیکن اس پوری سازش میں تم خود بھی تو شریک ہو،'' میں نے اعتراض کیا، ''اور وہ لوگ تمھیں اس کی سزا دیں گے۔''

''اگر میں نے پوری بات ظاہر نہ کی تو مجھے کبھی سکون نہیں ملے گا۔''

''لیکن تمھارے گھر والوں کے مستقبل کا کیا ہو گا؟''

''کیا تم نے کبھی سنا ہے کہ اس ملک میں کوئی شخص سچ مچ بھوکا مرا ہو؟'' اس نے سخت لہجے میں کہا۔ ''ہم نئے سرے سے شروع کریں گے اور میں مرتے دم تک ان کا خیال رکھوں گا۔''

''کیا تمھیں عمدہ سے اور گاؤں میں اس کی طاقت سے ڈر نہیں لگتا؟'' میں نے پوچھا۔

وہ کچھ ہچکچایا، پھر بولا، ''ڈر اور احتیاط سب جہنم میں جائیں!'' وہ اچانک بہت سنجیدہ دکھائی دینے لگا۔ ''آج کے بعد میں کسی سے نہیں ڈروں گا۔''

ہم بہت دیر تک بات کرتے رہے اور مجھے محسوس ہوا کہ مصری اتنا وقت لے لینے پر مجھ سے معذرت کرنا چاہتا ہے۔ اس نے اپنی گھڑی میں وقت دیکھا— آدھی رات کے کچھ بعد کا وقت تھا— اور میں نے اسے یاد دلایا کہ یہ رمضان کا مہینہ ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اس وقت سونے کے بجاے سحری تک جاگنے کو ترجیح دوں گا، کیونکہ اس وقت سونے سے میری اشتہا خراب ہو جائے گی اور پھر میں سحری کے بعد دوبارہ نہیں سو سکوں گا۔ اس نے کہا کہ میں صرف اس کے خیال سے ایسا کہہ رہا

Scanned with CamScanner

ہوں۔ اس پر میں نے قسم کھا کر اسے یقین دلایا کہ میرا پہلے سے سحری تک جاگنے کا ارادہ تھا، خواہ ہم باتیں کرتے یا نہ کرتے، کیونکہ یہ ہم شہر والوں کا پرانا دستور ہے کہ سحری کے بعد سوتے ہیں۔

مجھے اقرار ہے کہ مصری نے جس طرح مجھ سے بات کی اس سے مجھے خوشی ہوئی، کیونکہ مجھے اپنے تمام سوالوں کا جواب مل گیا تھا۔ میں خوش تھا کہ آخر کار اس نے پوری بات ظاہر کر دینے کا ارادہ کر لیا ہے۔ جس وقت وہ مجھے اپنی کہانی سناتے ہوئے اس مقام پر پہنچا جہاں اس نے عمدہ کی پیشکش قبول کی تھی، تو مجھے احساس ہوا کہ میں نے اس شخص کو کھو دیا ہے۔ جس سے مجھے محبت ہونے لگی تھی؛ لیکن جب اس نے کہا کہ اب وہ کسی سے خوفزدہ نہیں ہوگا تو مجھے لگا کہ میں نے اسے دوبارہ پا لیا ہے۔ میں نے آخر تک اس کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا۔

اس نے مجھے میرے خیالات سے چونکا دیا۔ ''ذرا سوچو کہ اگر میں مر جاؤں تو کیا ہوگا!'' وہ بولا۔ ''کیا تمھیں احساس ہے کہ اگر ایسا ہوا تو میرے گھر والوں کی کیا حالت ہوگی؟ میری موت سے کس کو فائدہ ہوگا؟''

''آگے کیا ہوگا اس کے بارے میں خواہ مخواہ فکر مند ہونا چھوڑو،'' میں نے اس سے کہا۔ ''صرف اس بات پر توجہ دو جس کے بارے میں ہم ابھی بات کر رہے تھے۔ تم نے آج رات اپنے بارے میں جو سچ دریافت کیا ہے میں اسے ذہن میں بٹھانے میں تمھاری مدد کروں گا۔ میں نہیں جانتا کہ تمھیں مبارکباد دوں یا تمھیں خبردار کروں کہ یہ انکشاف بہت سے مسائل کا آغاز ثابت ہو سکتا ہے۔''

''مجھے مسائل کی فکر نہیں ہے،'' اس نے جواب دیا۔ ''میں ان کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہوں۔'' مجھے اس کو مبارکباد دینی چاہیے، اس نے کہا، کیونکہ آج رات ایک بہت اہم چیز واقع ہوئی ہے۔ اس نے خود کو، اسی پرانے مصری کو جو کھو گیا تھا، پھر سے پا لیا ہے، اور اس نے جو شے دریافت کی ہے اس کی بنیاد پر آگے قدم اٹھانے کا عزم کر لیا ہے۔

''مبارک ہو...'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

مجھے اس کو اس کے نئے نام سے، جو اس کا اصل نام تھا، پکارنے کی عادت نہ پڑی تھی، اور اس نے میرا جملہ مکمل کرتے ہوئے کہا، ''کہو، مبارک ہو مصری!''

ہم نے اپنے ارادے پر عمل درآمد اگلی صبح سے شروع کرنے کا فیصلہ کیا، جب اسمبلی کے وقت

Scanned with CamScanner

وہ کمانڈانٹ سے علیحدگی میں ملاقات کی درخواست کرے گا اور اس درخواست کو اسپتال کے روزنامچے میں درج کروائے گا۔ اسمبلی کے وقت مصری نے کمانڈنگ افسر سے کہا کہ وہ کمانڈانٹ سے ملاقات کا وقت لینا چاہتا ہے۔ جب افسر نے اس سے ملاقات کا سبب پوچھا تو اس نے کہا کہ یہ ایک نجی معاملہ ہے اور وہ برسرِ عام اس کی تفصیل نہیں بتا سکتا۔ افسر نے بہت اصرار کیا لیکن مصری نے آگے کچھ بھی کہنے سے انکار کر دیا۔ افسر نے اس سے وعدہ کیا کہ اس کی درخواست روزنامچے میں درج کر دی جائے گی جو کمانڈانٹ کے آنے پر اس کے حوالے کیا جائے گا۔ پریڈ کے بعد مصری اتنا گھبرایا ہوا تھا کہ اس سے کوئی کام ڈھنگ سے نہیں کیا جا رہا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ اسے قہوہ خانے لے جا کر تنہائی میں اس سے بات کروں لیکن رمضان کا مہینہ تھا اور ہم دونوں روزے سے تھے۔ مگر میں نے اسے اپنا کچھ کام پورا ہونے تک اپنے ساتھ ہی رکھا کیونکہ میں اس کے اضطراب کو محسوس کر رہا تھا۔ ابھی دس بجے تھے اور دو گھنٹے باقی تھے، کیونکہ کلرک اپنی رپورٹیں کمانڈانٹ کو بارہ بجے کے قریب پیش کرتے تھے۔ کچھ دیر بعد ہمیں معلوم ہوا کہ کمانڈانٹ یونٹ میں موجود نہیں ہے کیونکہ اسے کسی ہنگامی اجلاس کے سلسلے میں ہیڈکوارٹر طلب کر لیا گیا تھا۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ وہ اجلاس کے بعد یونٹ میں واپس آئے گا یا وہیں سے سیدھا گھر چلا جائے گا۔

یہ خبر سننے پر مصری کے اضطراب اور غصے کی حد نہ رہی اور میں اس پر اس خبر کا اتنا گہرا اثر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ ایک دن سے کچھ فرق نہیں پڑتا، اس لیے یہ معاملہ اس قدر شدید ردعمل کا مستحق نہیں ہے۔ آج بدھ ہے، کل جمعرات، اور اگر کمانڈانٹ کل بھی واپس نہیں آیا تو سنیچر بھی کچھ ایسا دور نہیں۔ مصری نے اپنی بھنچی ہوئی مٹھی زور سے میز پر ماری۔ میں نے اسے پرسکون کرنے کی کوشش کی لیکن بے سود، اور دن کے تمام ہوتے ہوتے مجھے احساس ہو گیا کہ وہ آنے والے دن کے بارے میں پیش آگہی کے شدید احساس میں مبتلا ہے۔ جب کمانڈانٹ دوپہر تک نہیں لوٹا تھا تو میں نے خیال کیا تھا کہ یہ معاملہ اگلے دن پر ٹل جائے گا۔ لیکن شام چھ بجے کے قریب، خلافِ معمول، یونٹ کے تقریباً تمام افسر کمانڈانٹ کے ساتھ آتے دکھائی دیے۔ ہر شخص کا کہنا تھا کہ ضرور کوئی غیر معمولی بات ہونے والی ہے ورنہ سارے افسر اور کمانڈانٹ ایسے غیر وقت یہاں نہ آتے۔ کمانڈانٹ نے اپنے نائبین، اسپتال کے عملے، انتظامی اور تکنیکی معاملات کے نگران افسر اور کمپنی

Scanned with CamScanner

کمانڈر کے ساتھ طویل اجلاس کیے۔ خبر ہمیں جلد ہی مل گئی: ہنگامی حالات کے نفاذ کا اعلان کر دیا گیا تھا، تمام چھٹیاں منسوخ کر دی گئی تھیں اور مستقبل کی چھٹیوں کو معطل کر دیا گیا تھا۔

ہم میں سے کچھ لوگوں کو اس خبر پر حیرت نہیں ہوئی، کیونکہ ریزرو فوجیوں کو پچھلے روز ہی طلب کیا جا چکا تھا۔ وہ یہاں کبھی کبھی تربیت حاصل کرنے آیا کرتے تھے، لیکن اس بار وہ اپنے پورے ساز و سامان کے ساتھ آئے تھے— دراصل یہ سلسلہ شروع اکتوبر ہی سے چل رہا تھا، اگرچہ کسی نے اس پر زیادہ دھیان نہیں دیا تھا۔ پھر سلسلہ وار احکامات موصول ہوئے: بعض مخصوص مہارتیں رکھنے والے افراد کو فوری طور پر محاذ پر بھیجا جانا تھا۔

کمانڈانٹ نے پورا رکا ہوا کام نمٹانے کا حکم دیا، اور مصری کو اس سے ملاقات کے لیے فوری طور پر بلوایا گیا، کیونکہ کسی کو کچھ معلوم نہ تھا کہ اگلے روز کیا ہونے والا ہے۔ کمانڈانٹ سے ملنے کے لیے جاتے وقت مصری بہت زیادہ پریشان نہیں معلوم ہو رہا تھا، اور اس چند منٹ کی ملاقات سے لوٹ کر بھی وہ خوش دکھائی دیتا تھا۔ اس نے مجھے وہاں ہونے والی بات چیت کی کوئی تفصیل نہیں بتائی اور سیدھا اپنی بیرک کی طرف چلا کہ اپنا سامان لے سکے۔ وہ اتنی عجلت میں معلوم ہوتا تھا کہ میرے سوالوں کا جواب تک نہ دے رہا تھا اور مجھے ملاقات کی تفصیل جاننے کے لیے اسے گریبان سے پکڑ کر روکنا پڑا۔ ’’میں محاذ پر جا رہا ہوں،‘‘ اس نے صرف اتنا ہی بتایا۔

’’ہوا کیا؟‘‘

’’کچھ نہیں۔ میں نے شکایت درج کرانے کے بجائے محاذ پر بھیجے جانے کی درخواست کی۔ کسی بھی حیثیت سے، جلد سے جلد۔‘‘

’’اور اس مشکل کا کیا بنا جس کا تم نے مجھ سے ذکر کیا تھا؟‘‘

’’ایسے وقت میں جب مصر کو جنگِ آزادی کا سامنا ہے، مجھے اپنی ذاتی مشکل کی بات کرتے ہوئے شرم آ رہی تھی۔‘‘

’’تمھیں کس نے بتایا کہ جنگ ہونے والی ہے؟‘‘

’’مجھے محسوس ہو رہا تھا۔‘‘

’’ہنگامی حالات کے نفاذ کا اعلان تو پہلے بھی ہوا ہے، لیکن اس اعلان کے بعد جنگ تو نہیں ہوئی۔‘‘

Scanned with CamScanner

''اس بار حالات مختلف ہیں۔''

''لیکن تمھاری مشکل... اس کا کیا ہوگا؟'' میں نے چلا کر کہا۔

اس نے کہا، ''تمام مشکلیں اور قضیے کچھ دنوں کے لیے ملتوی کیے جا سکتے ہیں۔ یا کچھ مہینوں یا برسوں کے لیے۔ لیکن ارضِ وطن کی آزادی کو ملتوی نہیں کیا جا سکتا۔'' پھر کچھ ٹھہر کر بولا، ''جب ہم واپس آئیں گے، جب آزادی کی جنگ کا پہلا مرحلہ مکمل ہو جائے گا، تب ہم دوسرا مرحلہ شروع کر سکتے ہیں، یعنی داخلی مسائل سے نمٹنے کا مرحلہ۔ تم مطمئن رہو۔''

''کیا تم نے کمانڈانٹ کو اس بات کا کوئی اشارہ دیا جو تم اس سے کہنا چاہتے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ اس بات کا وقت نہیں ہے۔''

میں نے اسے بتایا کہ اگر اسے موجودہ صورت حال میں یہ بات چھیڑتے ہوئے گھبراہٹ محسوس ہو رہی ہے تو میں اس کی طرف سے بات کرنے کو تیار ہوں، لیکن اس نے انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ عام حالات میں اس میں اور عمدہ کے بیٹے میں ہزار فرق ہو سکتے ہیں، لیکن اب یوں لگتا ہے کہ وہ دونوں ایک ہی شخص بن چکے ہیں کیونکہ نام، حلیے اور خدوخال کے فرق اب بے معنی ہو چکے ہیں۔ وہ مصر کی آزادی کی جنگ میں شرکت کا اعزاز پانے کے لیے پُرعزم ہے: یہی اہم چیز ہے، نہ کہ اس کا نام یا عہدہ۔ یہ بات اس نے کمانڈانٹ کو ایک مختلف انداز میں بتائی تھی، اور کہا تھا کہ محاذ پر بھیجے جانے سے اسے وہ اطمینان حاصل ہو جائے گا جو اسے درکار ہے — یعنی اپنی کھوئی ہوئی عزتِ نفس کو دوبارہ پا لینے کا اطمینان۔

مصری کی باتوں سے کئی سوال بے جواب رہ گئے تھے۔ کیا وہ واقعی محاذِ جنگ پر جا کر جان دے دینے کا خواہش مند تھا؟ وہ کس جذبے کے تحت محاذ پر جا رہا تھا؟ کیا یہ احتجاج کا اظہار تھا یا جان بوجھ کر دی جانے والی قربانی؟ ایک طرح سے وہ محاذِ جنگ پر خارجی دشمن کا سامنا کرنے سے بھی پہلے اپنے داخلی معرکے میں مارا جا چکا تھا۔ یہ پورا معاملہ اس قدر الجھا ہوا ہے۔ اب اس کے بارے میں بات کرتے ہوئے میں اپنے اس عزیز شخص کا خون اپنی رگوں میں بہتا محسوس کرتا ہوں، اور وہ ایک ایسی ذمے داری ہے جسے میں اب بھی اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہوں۔ مصری ضائع ہو گیا ہے۔ یہ الفاظ اس نے مجھ سے کئی بار کہے تھے۔ اور اب میں صرف اسے یاد کر کے رو سکتا ہوں یا اس کا ذکر کر سکتا ہوں۔ لیکن اس سے کیا حاصل؟ جب کوئی شخص مرتا ہے تو سب سے کٹ جاتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کے

قریب ترین لوگ بھی زندگی کے اپنے اپنے راستے پر آگے بڑھ جاتے ہیں۔لیکن اس میں اُس کا کیا قصور؟ اور میرا بھی کیا قصور؟ اس کی کہانی میرے لیے صرف ایک معنی رکھتی ہے، کہ ہماری اس دنیا میں انصاف کا وجود نہیں ہے، اور اگر ہمیں انسان کی عزت کی طلب ہے تو ہمیں اوپر والے سے ہی انصاف مانگنا ہوگا۔اور اگر وہاں سے بھی انکار ہو جائے تو کوئی اور رب ڈھونڈنا ہوگا۔اور انصاف کا ایک ہی مطلب ہے: کہ قوت اور قدرت رکھنے والا ہاتھ اس شخص کا مددگار ہو جو حق پر ہے مگر عاجز ہے۔لیکن میں نہیں چاہتا کہ آپ مجھ سے اس قسم کے سوال کریں کہ تم نے مصری کی موت کے سلسلے میں کیا کیا۔ یا یہ کہ تم اپنی تمام امیدیں آسمان کی غیبیات اور اساطیر سے کیوں لگائے بیٹھے ہو؟ اور اپنی تقدیر خود بنانے کی انسان کی صلاحیت پر تمھارا ایمان کیوں جاتا رہا؟ اس لیے مصری کے قصے کی طرف اور محاذ پر جانے کے اس کے عجیب اصرار کی طرف واپس چلتے ہیں۔میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن اس نے میری بات پر کوئی توجہ دیے بغیر اپنی تیاری جاری رکھی۔ یہ بات میری سمجھ میں کبھی نہیں آئے گی۔ ہدایات کے مطابق کچھ مخصوص مہارتیں رکھنے والے افراد کو محاذ پر بھیجا جانا تھا، اور اس کے پاس ایسی کوئی مہارت نہ تھی۔ بھرتی ہونے والا ہر رنگروٹ کسی نہ کسی مخصوص میدان، یا فوجی اصطلاح میں کسی نہ کسی مخصوص زُمرے سے تعلق رکھتا ہے، اور موجودہ احکامات کے مطابق انھیں اسٹریچر بردار، ایکسرے کے ماہرین، لیبارٹری اسسٹنٹ، اور محاذ کے باورچی خانوں میں کام کرنے والے درکار تھے۔ مصری کو نرس کے طور پر تربیت دی گئی تھی، اور حالانکہ نرسوں کو طلب نہیں کیا گیا تھا، اس نے محاذ پر بھیجے جانے کے لیے اصرار کیا۔میں اپنی پوری زندگی میں اس جیسے کسی نوجوان سے نہیں ملا۔ہم میں سے کچھ لوگ محاذ پر جانے سے بچ نکلتے تھے، اگر مثلاً کسی کا کسی اونچے اہلکار سے خون یا شادی کے ذریعے کوئی رشتہ ہوتا، یا کسی جوڑ توڑ سے کسی اعلیٰ افسر کو فون کرا کے وقتاً فوقتاً چھٹی منظور کرائی جاسکتی۔ یونٹ کا ٹیلیفون متواتر بجا کرتا؛ یونٹ کے کسی شخص کے رشتے دار ایسے لوگوں کی سی نرم آواز میں جنھیں کبھی مصیبتوں سے سابقہ نہ پڑا ہو، درخواست کرتے کہ اسے محاذ پر نہ بھیجا جائے۔ بھلا ایک سپاہی سے کیا فرق پڑ جائے گا؟ اور پھر یوں بھی وہ اونچے گھرانوں کے لڑکے خاص مقام رکھتے تھے: ان میں سے ایک ایسی فرم کا مالک تھا جو ملک کو فائدہ پہنچا رہی تھی، دوسرے کے سر پر اپنے خاندان کی ذمے داری تھی، تیسرے کا باپ کسی سرکاری مشن پر ملک سے باہر گیا ہوا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔

Scanned with CamScanner

مصری اپنی قسم کا ایک ہی تھا۔ اپنی مشکل کا حل، میرے خیال سے، اسے یہی سوجھا کہ نہر کے علاقے میں چلا جائے جہاں کے پانی سے اس کے اب تک کے طول طویل برسوں کے سب مصائب گویا دھل جائیں گے۔ پھر وہ بات کرنے کے ارادے سے میرے پاس آیا۔ وہ اچانک جوش میں آ گیا، اس میں ایسا جذبہ پھوٹ پڑا جو اس سے پہلے محسوس نہ ہوا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ عمدہ کے بیٹے کی جگہ فوجی خدمت کرنے پر آمادہ ہونے اور اُس روز اس بات کو کمانڈانٹ سے نہ اٹھانے کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ کوئی چوری یا اسمگلنگ نہیں کر رہا تھا بلکہ مصر کے لیے اپنی حب الوطنی کا فرض نبھا رہا تھا۔ اسے مصر سے بے پناہ محبت تھی اور اس کا نام، مصری، اس کی خالی زندگی میں کسی قدر خوشی لانے والی واحد شے تھی۔ اسے معلوم نہ تھا کہ اسے یہ نام اتفاق سے دیا گیا تھا یا جان بوجھ کر، لیکن وہ یہ نام رکھنے کے لیے اپنے باپ سے محبت کرتا تھا کیونکہ اس نام ہی نے اسے اس سرزمین سے جوڑ دیا تھا جس سے اسے محبت تھی۔ یہ واحد موقع تھا کہ میں نے مصری کو اس قدر جوش میں دیکھا کہ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور پیشانی پر پسینے کے قطرے جھلملا رہے تھے۔ جس وقت وہ محاذ پر روانگی کے لیے تیاری کر رہا تھا اس کے اندر ایک نیا شخص مجسم ہو رہا تھا۔ روانگی سے پہلے اسے یاد دلایا گیا کہ اگر وہ لڑائی میں کام آنے کی تفصیلات والے فارم کے اندراجات میں کوئی تبدیلی کرنا چاہے تو اسے چاہیے کہ تبادلے سے پہلے کر لے، لیکن اس نے کہا کہ اسے کوئی تبدیلی نہیں کرنی ہے۔ پھر وہ مجھے ایک طرف لے گیا اور مجھ سے کہا کہ میں واحد شخص ہوں جو اس کے راز سے واقف ہے، اور اگر وہ زندہ واپس نہ آئے تو مجھے چاہیے کہ معاملے کو درست کرنے کے سلسلے میں جو کچھ میرے بس میں ہو کروں۔ اس نے اپنی بات میں اضافہ کیا کہ زندگی میں اس کے ساتھ غیر منصفانہ برتاؤ کیا گیا ہے اور وہ نہیں چاہتا کہ بے انصافی مرنے کے بعد بھی اس کا پیچھا کرتی رہے۔ میں اس معاملے میں گواہی دینے کا ارادہ رکھتا ہوں، اور اس سلسلے میں جذباتی مناظر کو گھسیٹ لانے سے کسی کا بھی بھلا ہونے والا نہیں۔ میں آپ کی آنکھوں میں گرم آنسو لانے کا خواہش مند نہیں، بلکہ ہمیں مل کر اس واقعے پر غور کرنا چاہیے۔ چنانچہ میں آپ کو یہ سب نہیں بتاؤں گا کہ رخصت کا وقت آنے پر میں نے مصری کو کس طرح الوداع کہا، یا یہ کہ خزاں کی سیاہ رات میں نصف شب کو اس کا روانہ ہونا کیسی علامتی حیثیت رکھتا تھا، یا حتیٰ کہ یہ بات کہ رخصت ہوتے وقت اس کے آخری الفاظ کیا تھے۔

اگلے روز یونٹ کو مزید آدمی محاذ پر بھیجنے کے احکامات موصول ہوے، اور میں نے اس ٹولی کے ساتھ بھیجے جانے کی درخواست کی، کیونکہ میں مصری کے ساتھ ہونا چاہتا تھا۔ ہمارا دوبارہ ملنا بہت متاثر کن تھا: یہ نوجوان جس کے وجود کے اندر وہ تمام مشکلیں موجود تھیں، اب ایک بہادر لڑاکا سپاہی بن چکا تھا۔ جب میں وہاں پہنچا اس وقت اسے محاذ پر آئے ایک دن ہی ہوا تھا، لیکن مجھے ایسا لگا جیسے وہ محاذ پر برسوں گزار چکا ہے۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے پورے کیمپ کا چکر لگوایا، اور اس جگہ سے اس کے لگاؤ نے مجھے یقین دلا دیا کہ وہ اسے اپنا گھر سمجھنے لگا ہے۔ تیاریوں اور چہل پہل کے درمیان چند منٹ ساتھ گزارنے کے دوران ہی یہ واضح ہو گیا کہ وہ اپنی مشکل کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہے، لیکن حالات ہمیں اس کا موقع نہیں دے رہے۔

میں جمعے کی دوپہر کو محاذ جنگ پر پہنچا، اور اس کے چوبیس گھنٹے بعد ہی جنگِ آزادی شروع ہو گئی؛ چنانچہ وقت بہت مختصر تھا، لیکن ہماری بے تابی نے گویا اسے ابدیت میں تبدیل کر دیا تھا۔ جونہی ہمارے یونٹ کی نفری پوری ہوئی، ہم نے خندقیں کھود لیں، اور ریت سے بہت بڑی تعداد میں بوریاں بھر کر ان سے اپنے گرد فصیلیں بنا لیں۔ ہم نے انتظامی دفاتر اور سونے کے لیے خیمے کھڑے کر لیے، ایک خیمہ طبی معائنے کے لیے اور ایک آپریشن تھیٹر کے لیے؛ لیکن سب سے بڑا خیمہ زخمیوں کو رکھنے کے لیے مخصوص کیا گیا۔ ہمیں بتایا گیا کہ ایک اور خیمہ پوسٹ مارٹم کرنے کے لیے استعمال کیا جائے گا۔ اس بات کا علم ہونے کے بعد اس خیمے کے لیے زمین ہموار کرتے، میخیں گاڑتے اور بانس کھڑے کرتے ہوے ہمارے دل مغموم تھے۔ اب صرف کیمپ کو کیموفلاژ کرنے اور گاڑیاں کھڑی کرنے کے لیے گڑھے بنانے کا کام باقی رہ گیا۔ ہم نے محاذ کا باورچی خانہ بھی بنایا اور طبی سامان، گولہ بارود، اسلحے اور راشن کا ذخیرہ کر لیا۔

اس کے بعد مجھے اپنی انتظامی ذمے داریاں سنبھالنی تھیں، فرمانِ امروز لکھنے کے لیے کتاب تیار کرنی تھی، یونٹ میں تعینات نفری کے لیے رجسٹر مرتب کرنا تھا، آنے اور جانے والے پیغامات کی کتاب بنانی تھی اور پہرے داروں کی تبدیلی کا رجسٹر بنانا تھا۔ یہ خاصا دشوار، تھکا دینے والا کام تھا، لیکن ہم اتنے خوش تھے کہ ہمیں تھکن کا احساس نہ ہوا، اور رات گہری ہونے پر بھی ڈیوٹی افسر کے لیے ہمیں سونے کے لیے بھیجنا بہت مشکل ہوا۔

Scanned with CamScanner

ہمارا یونٹ ایسا اسپتال نہیں تھا جہاں زخمیوں کا علاج ہوتا ہو یا لڑائی میں کام آنے والوں کی لاشیں وصول کی جاتی ہوں۔ اس کا کام اس کے نام سے ظاہر تھا: فیلڈ سورٹنگ ہاسپٹل نمبر ون۔ یہ آگے کی طرف، محاذ جنگ کے قریب واقع اسپتال تھا، جہاں زخمیوں کو وصول کر کے انھیں مختلف زمروں میں بانٹا جاتا تھا۔ معمولی زخمیوں کو مرہم پٹی کے بعد واپس میدان جنگ میں بھیج دیا جاتا تھا جبکہ دوسروں کا مکمل طبی معائنہ ہوتا تھا۔ جہاں تک لڑائی میں مارے جانے والوں کا تعلق تھا، ہمیں ان کے لیے مقررہ طریق کار پر عمل کرنا تھا۔

اپنی فرنٹ لائن پر ہمیں نرسوں اور اسٹریچر برداروں کی پوری پلٹن سے بھی زیادہ تعداد درکار تھی، اور ہم سے کہا گیا تھا کہ اپنے کیمپ پر طبی خدمات کے ڈویژن کا پرچم لہرائیں کیونکہ بین الاقوامی قانون کی رو سے دشمن کے لیے ہم پر فائر کرنا ممنوع تھا۔ فیلڈ اسپتال کا کمانڈر ان لوگوں کے نام پڑھنے کے لیے کھڑا ہوا جنھیں بالکل آگے فرنٹ لائن پر بھیجا جانا تھا جو اس روز، سنیچر کی صبح، نہر سویز کا مغربی کنارہ تھا۔ ساڑھے سات بجے کا وقت تھا اور ہم سب صبح کی اسمبلی کے لیے قطاروں میں کھڑے تھے۔ مصری میرے داہنے ہاتھ پر کھڑا تھا، بغیر استری کی فوجی یونیفارم پہنے، اگرچہ یہ مجھ پر واضح تھا کہ پچھلی رات وہ اس وردی کو تہہ کر کے اپنے تکیے کے نیچے رکھ کر سویا تھا تاکہ استری شدہ معلوم ہو۔ جونہی کمانڈر نے کہا کہ وہ محاذ جنگ پر جانے والوں کا انتخاب کرنے والا ہے، مصری نے اپنا داہنا ہاتھ بلند کر دیا اور کپکپاتے جسم کے ساتھ اور پرعزم آواز میں اس نے صرف ایک لفظ کہا، "جناب!"

اذن ملنے سے پہلے ہی مصری بے تاب ہو کر قطار سے باہر نکل آیا اور سامنے کی طرف چلتا ہوا کمانڈر کے بالکل سامنے جا پہنچا اور اسے سلیوٹ کیا۔ افسر نے سلیوٹ کا جواب دیا اور پوچھا کہ کیا بات ہے۔ مصری نے کہا کہ وہ لڑائی میں شامل ہونے والا پہلا شخص ہونا چاہتا ہے۔ اس سے کمانڈر خوش ہوا اور مصری کو جوابی سلیوٹ کر کے اس نے اس کا نام فہرست میں سب سے اوپر لکھنے کا حکم دیا۔ میں بھی اس کے ساتھ جانا چاہتا تھا لیکن میرے کاموں کی نوعیت اس کی اجازت نہ دیتی تھی — میں انتظامی عملے میں تھا اور میری فطری جگہ یونٹ ہی میں تھی۔

اب مجھے آپ کو اس موقعے کے بارے میں بتانا ہے جب میں نے مصری کو آخری بار دیکھا۔ جب پہلی پلٹن کا انتخاب ہو چکا، جس کا رہنما مصری کو بنایا گیا، تو اس میں شامل لوگ پٹیاں، دوائیں،

Scanned with CamScanner

راشن، گیس ماسک اور پانی کے فلاسک جاری کرانے چلے گئے۔ یہ کام کسی رکاوٹ کے بغیر جلد ہی ہو گیا۔ مجھے اس سے بات کرنے کا موقع تو نہیں ملا، لیکن میں نے اسے اپنے ایک ساتھی کو اسٹریچر لے جانے میں مدد دیتے ہوئے دیکھا؛ اس نے اپنے جاری کرائے ہوئے سامان کو اپنی وردی کے ساتھ باندھ رکھا تھا۔ میں نے اسے ایک ٹیلے کے اوپر صحرا کی بے کراں ریت کے پس منظر میں دکھائی دیتے ہیولے کے طور پر دیکھا۔ پلٹن کے روانہ ہونے سے پہلے وہ ہماری طرف مڑا، اور مجھے یقین ہے کہ میں نے خزاں کے کسی قدر سرد موسم کے باوجود اس کے چہرے پر پسینے کے قطرے دیکھے؛ مجھے یہ منظر اچھی طرح یاد ہے کیونکہ اس کا چہرہ سورج کی شعاعوں کو منعکس کرتا لگ رہا تھا۔ پلٹن سست رفتاری سے مشرق کی سمت روانہ ہوگئی، لیکن مصری اتنے تیز قدموں سے چل رہا تھا کہ اس کا جسم معمول سے مختلف لگ رہا تھا، کیونکہ اس کے دھڑ کا اوپری نصف آگے کو بڑھا ہوا تھا؛ ممکن ہے آپ مجھے مبالغے کا مرتکب قرار دیں لیکن مصری کا جسم مشرق کے رخ تنی ہوئی کمان کی طرح نظر آ رہا تھا۔ یہ آخری موقع تھا جب میں نے اسے اس کے قدموں پر دیکھا۔

اسے دوبارہ دیکھنے سے پہلے پندرہ دن گزر گئے۔ پُرصعوبت حالات کے باعث یہ طے کیا گیا تھا کہ ہر پلٹن باقاعدہ وقفوں سے بدلی جاتی رہے، اور اس پلٹن کے بہت سے افراد واپس بھی آئے، لیکن مصری محاذ پر ہی ٹھہرا رہا۔ اس نے جو دلیری دکھائی وہ ناقابل بیان ہے۔ اس کے بارے میں بات کرتے ہوئے میرے ذہن میں صرف پامال الفاظ اور فقرے آتے ہیں، زبان پیش پا افتادہ اور کمزور محسوس ہوتی ہے۔ یہ اتوار، ۲۱ راکتوبر کی شام تھی، رمضان کا آخری عشرہ چل رہا تھا اور چاند رات کو دیر سے آسمان پر نمودار ہوا۔ کہا گیا کہ لیلۃ القدر رمضان کی انھی آخری راتوں میں ہوگی اور رات کی باری پر متعین سپاہیوں کو چاہیے کہ اس کی جھلک پانے کی کوشش کریں۔ اس رات، نصف شب سے کچھ پہلے، مصری کو اس کی پلٹن کے ایک اسٹریچر پر لایا گیا۔ اس کی گردن پر گولے کا تیز دھار ٹکڑا لگا تھا، پیٹ میں بھی زخم آیا تھا اور بایاں پیر چکنا چور ہو چکا تھا۔ زخمی ہونے کے باوجود اس نے دوسرے زخمیوں کی دیکھ بھال کا کام جاری رکھا تھا اور کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ زخمی ہو گیا ہے۔ جب وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا تب اس کے ساتھیوں کو اس کے متعدد زخموں کا پتا چلا۔ اس کے جسم کا بہت سا خون ضائع ہو چکا تھا اور ایک زخم میں زہر پھیلنے لگا تھا۔

Scanned with CamScanner

جس لمحے اسے اسپتال پہنچایا گیا، میں نے اپنا کام جہاں کا تہاں چھوڑ دیا۔ میں نے اس کا معائنہ کرنے والے ڈاکٹروں کے چہرے دیکھ کر جان لیا کہ اس کے بچنے کی امید نہیں ہے، لیکن کمانڈر نے حکم دیا کہ اس کے باوجود جو کچھ ممکن ہو ضرور کیا جائے۔ میں اس کے ہذیانی بخار کے دوران اس کے سرھانے بیٹھا رہا جس میں وہ صرف ایک بات کی تکرار کرتا رہا کہ میں جا کر اس کے گھر والوں سے ملوں اور انھیں انصاف دلواؤں۔ اس نے مجھے تاکید کی کہ مجھے اس کی کہانی معلوم ہے اور یہ کہ اس نے مصری کی حیثیت سے جان دی ہے، عمدہ کے بیٹے کے طور پر نہیں۔ جو کچھ بھی ہوا، اس کی سچائی سامنے آنی چاہیے۔ وہ جب تک زندہ رہا اپنے گھر والوں کے کسی کام نہ آ سکا، اور اب چاہتا تھا کہ اس کے لڑائی میں کام آنے سے ہی اس کے خاندان کو غیر یقینی مستقبل سے پناہ مل سکے۔

میں نے اس کی باتوں سے اتفاق کیا، لیکن میرے ذہن میں کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ وہ واقعی مرنے والا ہے۔ کاش ہم اسے بیس کیمپ کے اسپتال یا اچھے ساز و سامان والے ضلعی اسپتال ہی میں منتقل کر سکتے! رات کے بیشتر حصے میں اس پر ہذیان طاری رہا۔ مجھے قاہرہ جا کر سنٹرل ڈپو سے دواؤں کا ذخیرہ لانے کا حکم ملا تھا، میں نے سوچا کہ کوئی عذر کر کے جانے کو ٹال دوں تاکہ مصری کے ساتھ رہ سکوں، لیکن یہ درخواست کرتے ہوئے مجھے ہچکچاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ ہم نے کوئی چھوٹی لاری حاصل کرنے کی کوشش کی، لیکن آخر یہی اندازہ ہوا کہ تابوت گاڑی ہی سفر کا مناسب ذریعہ ہوگی: اس کے وسیع عقبی حصے میں تالا ڈالا جا سکتا تھا، اس لیے یہ طبی سامان کی نقل و حمل کے لیے بہترین سواری تھی۔

جس وقت ہم ورک آرڈر اور ملٹری پولیس کو دکھائے جانے والے کاغذات تیار کرنے میں مصروف تھے، علاقائی ہیڈکوارٹر سے ملانے والے فیلڈ ٹیلیفون کی گھنٹی بج اٹھی۔ پیغام یہ تھا کہ اس شام پونے سات بجے جنگ بندی کر دی جائے۔ اس غمناک خبر کے گہرائی تک اترنے سے پہلے ہی مجھے یہ اطلاع بھی ملی کہ مصری دم توڑ رہا ہے۔ میں خیمے کی طرف دوڑا اور پایا کہ وہ تیزی سے مر رہا ہے۔ سب کچھ چند منٹ کے اندر اندر ہو گیا۔ میں نے اس کی ٹانگیں سیدھی کیں، بازو پہلو میں رکھے اور آنکھیں بند کر دیں۔ جب کمانڈر کو اطلاع دی گئی تو اس نے ہمیں لاش کو بھی اپنے ساتھ گاڑی میں قاہرہ لے جانے اور وہاں سے تدفین کے لیے اس کے گاؤں پہنچانے کی ہدایت کی۔ میت کو جلدی جلدی تیار کیا گیا اور لڑائی میں کام آنے کی تفصیلات کا بیان تیار کیا گیا۔

Scanned with CamScanner

سو اب میں تابوت گاڑی کے پچھلے حصے میں بیٹھا تھا۔ ریڈیو اب بھی چل رہا تھا لیکن میں نے سوئی گھما کر دوسرا اسٹیشن لگا دیا تھا۔ ایک گمبھیر آواز سنائی دے رہی تھی: ''آج صبح چھ بج کر پینتالیس منٹ پر وزیرِ جنگ اور مسلح افواج کے کمانڈر انچیف فیلڈ مارشل احمد اسمٰعیل علی نے فوج کے تمام دستوں کو حکم دیا کہ ۲۲ راکتوبر ۱۹۷۳ء کو قاہرہ کے وقت کے مطابق شام چھ بج کر پینتالیس منٹ پر جنگ بندی کر دی جائے، بشرطیکہ دشمن فوج بھی اس متفقہ وقت پر جنگ بندی پر عمل کرے۔''

ہم اسی شام قاہرہ پہنچ گئے، اور گاڑی کی کھڑکی میں سے مجھے زندگی اسی طرح رواں دواں دکھائی دی جیسی میں سترہ دن پہلے چھوڑ کر گیا تھا۔ مجھے ایک نوعمر لڑکی روٹیاں لے جاتی نظر آئی جو گرم روٹی سے جل جانے والی انگلی پر پھونکیں مارتی جا رہی تھی۔ ایک نیم تاریک، خالی سڑک پر مجھے ایک نوجوان لڑکا لڑکی ہاتھ میں ہاتھ ڈالے، آنکھوں سے خفیہ پیغامات کا تبادلہ کرتے دکھائی دیے، اور ایک بوڑھی عورت شام کے وقت گھومنے نکلنے والوں سے بھیک مانگ رہی تھی۔

ہم اسپتال پہنچے۔ یہ اس شہر کے، جو خوف بھری خاموشی کے ساتھ خود کو آنے والی لمبی رات کے لیے تیار کر رہا تھا، اور اس کے باوجود اس میں جنگ کی بے آواز بورچی ہوئی تھی، مرکزی چوک سے بہت فاصلے پر واقع تھا۔ میں اسپتال میں پچھلے دروازے سے داخل ہوا جو اسٹریچر کیس لانے لے جانے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اس راستے سے ہم مصری کو پوسٹ مارٹم کے کمرے میں لے گئے اور وہاں اس کا تابوت کھولا۔ بلیک آوٹ کی وجہ سے ہم اندھیرے میں ٹٹول رہے تھے اور میں مصری کے چہرے کے نقوش کو محسوس نہ کر سکا۔ میں اس تھکن اور تناؤ کے شکار چہرے کی آخری جھلک دیکھنے کے لیے دیا سلائی جلانا چاہتا تھا لیکن بلیک آوٹ اب تک نافذ تھا، اور محاذ سے ابھی ابھی لوٹنے والے شخص کے طور پر مجھے ہر دوسرے شخص کی طرح اس کی سنگینی کا خوب اندازہ تھا۔ پوسٹ مارٹم کے کمرے میں متعین سپاہی جا کر برف کی دو سلیں لے آیا جنھیں ہم نے توڑا اور اس کے ٹکڑے لاش کے اردگرد بھر دیے۔

میں نے دواؤں کے اس ذخیرے کی بابت پوچھا جسے لینے میں آیا تھا، اور مجھے بتایا گیا کہ ایک ذخیرہ اسی صبح روانہ کیا گیا ہے اور اگلے ذخیرے کے لیے مجھے تین دن انتظار کرنا ہوگا۔ چنانچہ میرے پاس اتنا وقت تھا کہ میں اپنے عزیز دوست کے ساتھ اس کے گاؤں جا سکتا تھا۔ افسر آپ کو اس سفر کے بارے میں بتائے گا اور یہ بھی کہ وہاں پہنچنے کے بعد کیا ہوا — میں بہت کچھ کہہ چکا ہوں۔ میں ان

Scanned with CamScanner

قاہرہ والوں کی طرح نہیں ہوں جنھوں نے زندگی بھر اپنے شہر کے باہر قدم نہ رکھا ہو اور اس پر فخر بھی کرتے ہوں۔ نہیں، یہ دیہات میں جانے کا میرا پہلا اتفاق نہیں تھا۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ یہ پہلا موقع تھا جب میں نے کسی گاؤں کا بہت اچھی طرح جائزہ لیا۔

تو میں آپ کو بتاتا ہوں کہ میں نے وہاں کیا دیکھا۔ میں جانتا ہوں آپ میں سے بہت سے لوگ یہ سوچ رہے ہوں گے کہ ان تمام باتوں کا اس جنگ سے کیا تعلق ہے جو سرزمین مصر میں لڑی گئی اور جس کے بارے میں اتنے سارے ناول اور افسانے لکھے گئے (جنگ کے بارے میں ان لوگوں کی لکھی ہوئی کہانیاں نہایت مقبول ہوتی ہیں جو حکام اور مقتدر طبقات سے قربت کا رشتہ رکھتے ہیں — جب تک اگلی جنگ پیش نہ آجائے)۔ لیکن میں آپ کو اپنے سفر کی بات بتا رہا ہوں۔

میں نہیں جانتا کیوں، لیکن سب سے زیادہ میں مصری کے گھر والوں سے ملنے کے لیے بے تاب تھا، اس کے ماں باپ اور بہنوں سے۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں انھیں پہلے سے جانتا ہوں، کیونکہ ہماری طویل گفتگوؤں کے دوران مصری نے مجھے ان کے بارے میں ایک ایک بات بتا دی تھی، لیکن یہ پہلی بار تھی کہ میں اس کے باپ سے سچ مچ ملا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میری اس سے دو بار ملاقات ہوئی، ایک بار مصری کی باتوں میں اور دوسری بار اب۔ اس کا چہرہ بالکل کھلا تھا اور اس کے ہر احساس کو فوراً ظاہر کر دیتا تھا۔ میں نہیں جانتا کہ مجھے اس کی ماں سے لگاؤ کیوں محسوس ہوا لیکن جب میں نے اس پر پہلی بار نظر ڈالی اسی لمحے سے ایک لفظ میرے دماغ میں کھب گیا اور سوچے سمجھے بغیر میرے ہونٹوں پر آ گیا: ''فلاّحہ!''

میں نے وہ سب کچھ یاد کرنے کی کوشش کی جو مجھے بتایا گیا تھا۔ اس سے بات کرتے وقت میں نے اسے اس رشتے کا احساس دلانے کی پوری کوشش کی جو اس کے بیٹے کے اور میرے درمیان موجود رہا تھا۔ جب وہ بولی تو اس کے الفاظ آنسوؤں میں گندھے ہوئے تھے: ہر لفظ اس کی آنکھ سے ایک آنسو اور اس کے غمزدہ دل سے ایک آہ کھینچ لاتا تھا۔ ایک اجنبی کے سامنے رونے پر شرمندہ، وہ اپنے آنسو روکنے کی کوشش کر رہی تھی جس سے اس کی سسکیاں یوں معلوم ہوتی تھیں جیسے کونجیں کرلا رہی ہوں۔ اس نے مسکرانے کی کوشش کی اور اپنے آنسو پی لیے، اور اس کا چہرہ اس مسکراہٹ سے یوں تن گیا کہ اس کے پیچھے سے اس کا رنج صاف جھلکتا تھا۔

وہاں سے لوٹتے ہوئے میرا دل رونے کو چاہ رہا تھا کیونکہ بعض حالات کی وجہ سے جن کے

Scanned with CamScanner

بارے میں آپ کو آگے چل کر علم ہوگا، مصری کے گھر والے ہر ممکن طریقے سے میرے لیے اپنی محبت کا اظہار کرنا چاہتے تھے۔ میں نے ان سب باتوں کے بارے میں بہت سوچا ہے، لیکن کیا مجھے یہاں اپنے خیالات کا اظہار کرنے کا حق پہنچتا ہے؟ خیر، میں آپ سے ایسا کرنے کی اجازت طلب کرتا ہوں۔ میں عمدہ کے دوار کے باہر بیٹھا تھا اور اندھیری رات دیہات کی تمام پراسرار آوازوں سے بھری ہوئی تھی۔ یہ کوئی مرموز زبان معلوم ہوتی تھی۔ اندر تحقیقات جاری تھی، میں باہر بیٹھا تھا اور میرے خیالوں میں مدوجزر اٹھ رہے تھے۔ میں نے گاؤں کے راستے میں بے اندازہ عذابوں اور مصیبتوں کا مشاہدہ کیا تھا اور خدا سے اس ملک پر رحم کرنے اور اسے عذاب سے نجات دینے کی التجا کرتا رہا تھا۔ میں نے سوچا تھا، خدا کب مصر کو اس رنج و بلا سے نجات بخشے گا؟ اس سوال کا جواب کوئی نہیں جانتا، لیکن حالات جیسے ہیں، بہت دنوں تک ایسے نہیں رہ سکیں گے۔

مصری کی کہانی میں آسمانی انصاف کہاں ہے؟ اگر انصاف کا وجود ہوتا تو خدا نے غریبوں کو وہ حق دے دیا ہوتا جسے حاصل کرنے کی وہ متواتر جستجو کرتے رہتے ہیں۔ وہ حق پر ہیں، لیکن طاقت کے سامنے حق کی کب چلی ہے؟ حق اپنے آپ میں بے بس ہوتا ہے — ایسی بندوق جو جس کے ہاتھ میں ہو اسی کا سینہ چھلنی کرتی ہے۔ یہ لکڑی کی ایک ٹوٹی ہوئی تلوار سے زیادہ نہیں۔ مصری کے گھر والوں کے پاس صرف ان کے ہاتھ ہیں، جبکہ عمدہ کے پاس ہر قسم کی طاقت ہے اور وہ یہ کہتے نہیں تھکتا کہ یہ طاقت اسے خدا نے دی ہے — جو شاید سچ بھی ہے۔ سب سے سادہ سچ یہ ہے کہ اگر خدا نے خود کو امیروں کا خدا بنا لیا ہے تو غریبوں کو اپنے لیے کوئی اور خدا تلاش کرنا ہوگا۔ شاید وہ انھیں مل بھی جائے — کون کہہ سکتا ہے! شاید وہ اس وقت سے ان کا منتظر ہو جب سے دنیا نے اس مسلسل وسیع ہوتی ہوئی خلیج کے وجود کو محسوس کیا ہے جو غریبوں کو امیروں سے الگ کرتی ہے۔

تو یہاں ہیں ہم، میں نے سوچا، محاذِ جنگ سے لوٹ کر ہم نے پایا ہے کہ ہمارے ملک میں خونیں دور شروع ہو چکا ہے۔ کیا ہم ایک جنگ سے اس لیے واپس آئے ہیں کہ ایک اور منتظر جنگ کا سامنا کریں؟ میرا خیال ہے، ہم سے غلطی ہوئی ہے، کیونکہ جس جنگ کا خاتمہ کل ہوا اس میں ایک دشمن ہمارے عقب میں بھی موجود تھا۔ مقبوضہ سینائی کی طرف جتنی گولیاں چلائی گئیں اتنی ہی گولیاں غلام مصر کی سمت بھی چلائی جانی چاہیے تھیں، جو ایک اور قسم کے قابضوں کے تصرف میں ہے — غربت،

پسماندگی، بے انصافی اور جبر۔ لیکن ہمیں اس کا احساس نہیں ہوا۔ ہم نے اپنی تمام کوششیں اس دشمن پر مرکوز کر دیں جو واضح طور پر نظر آ رہا تھا اور ان مہلک، سرطانی دشمنوں کو بھول گئے جو ننگی آنکھ سے دکھائی نہیں دیتے۔ ہم نے سوچا تھا کہ پیچھے موجود لوگ یہ کام اپنے ہاتھ میں لیں گے، لیکن انھوں نے ہماری توقعات پوری نہ کیں — جس کا مطلب یہ ہے کہ اب یہ کام ہمیں خود کرنا ہوگا۔ اس کام کو اب مزید ٹالا نہیں جا سکتا، ورنہ سرطان پھیل کر پورے ملک کے جسد کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا، جس کے باعث معالجہ اور بھی دشوار ہو جائے گا۔ کون جانے یہ مرض اتنی تیزی سے پھیلے کہ اس پورے جسد کا خاتمہ ہی واحد علاج رہ جائے۔ ان دونوں حلوں میں سے جو بہتر ہے وہی زیادہ کٹھن اور تکلیف دہ بھی ہے۔

مجھے جو سبق واضح طور پر ملا ہے وہ یہ ہے کہ ہمارا ملک ایک بلی کی طرح ہے جو بے رحمی سے اپنے ہی بچوں کو کھا جاتی ہے۔ ہمارے ملک کے بچے مچھلیوں کی طرح باہر دنیا میں نکلتے ہیں، اور بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو کھا لیتی ہیں۔ ہمارے ملک کی صورت حال پر قریب سے نظر ڈالیے — ایک عجیب دنیا جو بارودی سرنگوں سے بھری ہوئی ہے پھر بھی خود کو محفوظ تصور کرتی ہے؛ یہ بیک وقت مضطرب بھی ہے اور مطمئن بھی، محبت بھری بھی ہے اور عداوت سے پُر بھی، آسودہ بھی ہے اور ناآسودہ بھی۔ بہرکیف، یہ ہماری دنیا ہے، اور دراصل یہی اصل مسئلہ ہے — کیا یہ واقعی ہماری ملکیت ہے، کب سے، اور ہم میں سے کس کی؟ کیا آپ اس بات سے اتفاق نہیں کرتے کہ یہ فقرہ ''یہ ہمارا ملک ہے''، بہت سے مختلف معانی رکھتا ہے؟ میں خواہش کرتا ہوں (آج کل ہم خواہش کرنے کے سوا کر بھی کیا سکتے ہیں) کہ کاش جنگ ابھی تک جاری ہوتی، کہ میں اپنے خون کا ایک قطرہ بہا سکتا، آخری قطرہ جو وادیِ نیل کی سرزمین کی حفاظت کے لیے بہایا جاتا، اور یوں اس کہانی میں میرا باب مکمل ہو جاتا۔ لیکن مصر میں جنگوں کا دور اب گزر چکا ہے، اور باتیں کرنے کا دور شروع ہو چکا ہے؛ لفظ ایک دوسرے کو آگ لگا دیتے ہیں، اور مصر کی سرزمین لفظوں کے سوا کسی چیز سے کبھی واقف نہیں ہوگی۔

میری خواہش تھی... لیکن خیر، اب ہمیں ان باتوں کو بھول جانا چاہیے۔ اس وقت میرے سامنے بس ایک ہی کام ہے: خاموش رہنا۔ ایسے وقت میں جب ہر شخص لفظوں کے سمندر میں تیر رہا ہو، خاموشی گفتگو سے زیادہ اونچی آواز میں بولتی ہے۔

Scanned with CamScanner

— ۵ —
افسر

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میں اسے نہیں جانتا تھا؛ میں نے اسے پوری عمر میں کبھی دیکھا تک نہ تھا۔ پرسوں میں یونٹ میں پہنچا اور کمانڈانٹ کو اپنے کاغذات پیش کیے، اور اس کے اگلے ہی دن مجھے یہ کام سونپ دیا گیا؛ بظاہر میرے سوا ہر شخص اس کام کی غمناکی کے باعث اس سے دامن بچانا چاہتا تھا۔ مجھے احتجاج کرنے کا خیال آیا، لیکن میں بہانے بنانے اور کام سے انکار کرنے سے شروعات نہیں کرنا چاہتا تھا، خاص طور پر جبکہ میرے یونٹ کے کمانڈانٹ نے، جب میں نے اسے اپنے کاغذات پیش کیے، ایک خاص نکتے پر اپنی توجہ مرکوز کی تھی: ''تم ایکٹو سروس کے افسر ہو یا ریزرو فورس کے؟''

''ریزرو فورس کا، سر!'' میں نے عام سے لہجے میں جواب دیا۔

اس پر وہ خوش نہیں دکھائی دیا۔ بلکہ نمایاں طور پر فکر مند نظر آیا۔ مجھے بتا دیا گیا تھا کہ جنگ میں کام آنے والوں کی لاشیں ان کے آبائی قصبے یا گاؤں لے جا کر ان کے گھر والوں کے سپرد کرنا ہی سماجی خدمات کے افسر کے طور پر میرے کام کا بنیادی جز ہوگا۔ یونٹ کے سماجی خدمات کے شعبے میں ہم تین افراد تھے؛ باقی دو میں ایک نوجوان لڑکی تھی جس کا عہدہ فرسٹ لیفٹیننٹ کا تھا اور ایک عورت جو میجر کے عہدے پر تھی۔ ان دونوں میں سے کسی سے یہ توقع کرنا معقول بات نہ ہوتی کہ وہ یہ کام کر سکیں گی۔

میں نے اپنے لیے ہدایات حاصل کیں اور روانہ ہو گیا۔ جس دن سے میں آیا تھا، پوسٹ مارٹم کا کمرہ وہ واحد جگہ تھی جو مجھے مضطرب کر دیتی تھی۔ پچھلے دو دنوں میں اس کے گرد ان لوگوں کی بھیڑ لگی رہی تھی جو لاشیں وصول کرنے آئے ہوئے تھے — یوں لگتا تھا جیسے یہ روز کا معمول ہے۔ لیکن اِس بار

Scanned with CamScanner

جب میں وہاں پہنچا تو مجھے وہاں کوئی نہ دکھائی دیا، جس پر مجھے تعجب ہوا، لیکن جب میں نے مرنے والے شخص کا پتا پڑھا تو میں اس کی وجہ جان گیا — یہ شخص قاہرہ کا رہنے والا نہیں تھا۔ میں کمپنی کمانڈر کے پاس پہنچا جو کیپٹن کے عہدے کا ایک اعزازی افسر تھا۔ میں نے اپنا تعارف کرایا اور ہم دونوں نے مصافحہ کیا، اور میں نے اس سے ان آدمیوں کو مقرر کرنے کی درخواست کی جو اس کام کے سلسلے میں میرے ساتھ جانے والے تھے۔ اس نے گھنٹی کا بٹن دبایا اور اردلی سے کہا کہ کمپنی دفتر کے سربراہ کو بلا لائے، تاکہ وہ ان آدمیوں کا انتخاب کر سکے۔ جو سپاہی اس ٹولی کے سپاہیوں کے پتوں کا حساب رکھتا تھا رجمنٹ کے دفتر سے آ پہنچا اور جیسا کہ اسے ہدایت کی گئی تھی، مرنے والے کے سرکاری پتے کی دو نقلیں ساتھ لے آیا۔ اصل اس نے مجھے دے دی اور میں نے نقل پر رسید لکھ کر دستخط کر دیے اور اس سے دریافت کیا کہ کیا اسے اس گاؤں کو جانے والا راستہ معلوم ہے۔

''نہیں،'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''اگر پوچھتے پاچھتے جائیں تو بھٹکیں گے نہیں،'' میں نے خود کو تسلی دینے کی خاطر کہا۔

سپاہی چلا گیا۔ پھر کمپنی دفتر کے سربراہ کو ساتھ لیے لوٹا۔ ان دونوں نے مجھ سے پوچھا کہ اگر مرنے والے کا دوست سپاہی بھی ساتھ چلے تو مجھے کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؛ وہ مرنے والے شخص کے بہت قریب رہا تھا اور اس کا خیال تھا کہ اسے اس گاؤں کا راستہ معلوم ہے۔

''اس کے نہ جانے کی کیا کوئی وجہ ہو سکتی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، بلکہ وہ تو خود آپ کے ساتھ جانا چاہتا ہے۔''

اس موقعے پر لڑائی کی وردی میں ملبوس ایک سپاہی اندر آیا، اور مجھے اور کمانڈر کو سلیوٹ کر کے بولا کہ اس کے پاس مرنے والے کے گاؤں جانے کی اجازت مانگنے کا فوری جواز موجود ہے۔

''کیا تم بھی اسی گاؤں کے رہنے والے ہو؟''

''نہیں۔''

''پھر تم وہاں جانے کے لیے اتنے بے تاب کیوں ہو؟''

''خصوصی حالات کی وجہ سے۔''

کمانڈر نے اس کو عندیہ دیا کہ اس کے جانے پر کوئی اعتراض نہیں ہے، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ وہ

Scanned with CamScanner

ہمارے یونٹ سے تعلق نہیں رکھتا: اپنے تبادلے کے وقت سے وہ فیلڈ سورٹنگ ہاسپٹل نمبر ا کا رکن ہے، اور وہی دفتر اسے کسی سرکاری کام پر جانے کی اجازت دینے یا نہ دینے کا مجاز ہے۔ اس کے علاوہ وہ ہمارے یونٹ میں ایک مخصوص حیثیت میں آیا ہے، اور اس کا مقصد سنٹرل ڈپو سے دواؤں کا ذخیرہ حاصل کرنا ہے۔ کیا یہ کام اس کی واپسی تک کے لیے ملتوی کیا جا سکتا ہے؟

سپاہی کے کہنے کے مطابق دواؤں کا ذخیرہ تین دن بعد حوالے کیا جانا تھا۔ پھر اس نے دریافت کیا کہ وہ غیر سرکاری حیثیت میں کیوں نہیں جا سکتا، اور کمانڈر راضی ہو گیا۔ مجھے ڈر تھا کہ گاڑی میں کہیں اس کے لیے جگہ کم نہ پڑ جائے، اور مجھے فوجی پولیس کی طرف سے اعتراضات اور دھمکائے جانے کا بھی اندیشہ تھا، لیکن چونکہ وہ واحد شخص تھا جو مرنے والے سے واقف رہا تھا، اور غالباً وہی ایک تھا جو اس کے گھر والوں کو جانتا تھا اور جسے اس گاؤں کا راستہ معلوم تھا، اس لیے اسے ساتھ لینا بہتر تھا، بجائے اس کے کہ ہم اکیلے نکل کھڑے ہوں اور راستہ بھٹک جائیں، خاص طور پر اس لیے کہ ہمارے وہاں پہنچتے پہنچتے رات ہو جانے والی تھی۔ یہ میرے سپرد کیا جانے والا پہلا کام تھا اور میں چاہتا تھا کہ یہ کامیابی سے انجام کو پہنچے۔ ایک اور سپاہی، ایک نان کمیشنڈ افسر اور ایک ڈرائیور کو بھی ساتھ جانے کے لیے مقرر کیا گیا، اور ایک سویلین مکینک کو بھی، اس خیال سے کہ کہیں گاڑی راستے میں خراب نہ ہو جائے۔ میں نے کمپنی سے ان کے ساتھ جانے کے احکام حاصل کیے اور پاس جاری کروایا۔

میں مرنے والے کے دوست کے ہمراہ کمپنی دفتر سے باہر نکلا۔ وہ واضح طور پر مضطرب دکھائی دیتا تھا، لیکن میں نے اس کا کچھ خیال نہ کرتے ہوئے اسے اپنے ساتھی کی موت کے غم پر محمول کیا۔ شاید اس نے اسے محاذ پر اپنی نظروں کے سامنے ہلاک ہوتے دیکھا تھا، جو کسی بھی شخص کے لیے انتہائی ہلا دینے والا تجربہ ہو سکتا ہے۔ جس وقت ہم بیٹھے کچھ کاغذات کے آنے کا انتظار کر رہے تھے، اس کے چہرے پر غم کے سوا دیگر احساسات بھی ظاہر ہونے لگے، اور میں سوچ میں پڑ گیا کہ یہ تشویش ہے، موت کا سامنا کرنے کی دہشت، یا ملال۔ اس کا داہنا ہاتھ لرز رہا تھا، اور مجھے واضح طور پر یاد ہے کہ وہ مجھے کچھ بتانے و بے چین معلوم ہوتا تھا، لیکن فیصلہ نہ کر پا رہا تھا کہ بتائے یا نہ بتائے۔ شاید میرے رویے نے اس کی زیادہ حوصلہ افزائی نہ کی ہو، حالانکہ میں ملنسار، دوستانہ انداز کا حامل شخص ہوں اور مجھے لوگوں کو بھانپ لینے میں ذرا وقت نہیں لگتا۔ جب وہ کچھ نہ بولا تو میں سمجھا کہ وہ مجھے نیا افسر جان کر

مجھ سے جھینپ رہا ہے؛ میرا یہ خیال حماقت پر مبنی تھا۔ ہیجان اور شدتِ جذبات اس کے چہرے پر پوری طرح ظاہر تھی، اور وہ اپنے ہاتھوں کو اتنے زور سے بھینچے ہوئے تھا کہ ان میں خون کی گردش رکی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اضطراب میں وہ اپنے ہاتھ بار بار اپنے سر پر مارتا تھا۔

''کیا کوئی مسئلہ ہے، سپاہی؟'' میں نے پوچھا۔

اس کا منھ کھلا اور وہ کچھ کہنے کو ہوا، لیکن اس کے لفظ ہونٹوں تک آتے آتے گویا مر گئے۔ اس کے منھ سے کوئی لفظ نہ نکلا اور میرے پاس کھڑے رہ کر انتظار کرنے کا وقت نہ تھا۔ میں باہر چلا گیا، اسے اس کے بوجھ اور اس راز کے ساتھ تنہا چھوڑ کر جسے ناگزیر طور پر باہر آنا ہی تھا۔ گاؤں میں پہنچنے کے بعد جب مجھے پورا قصہ معلوم ہوا، تب مجھے افسوس ہوا کہ میں نے اس کی بات سن کیوں نہ لی تھی — میں ایک دوست کے طور پر اس کی مدد کر سکتا تھا۔ لیکن کیا اس سے کوئی فرق پڑتا اور جو کچھ ہوا اس کا ہونا رک جاتا؟ میں ایسا نہیں سمجھتا، کیونکہ یہ نہایت سنگین معاملہ تھا اور اس کے مضمرات انتہائی وسیع تھے۔ میں نے اس نان کمیشنڈ افسر کو بلایا جو ہمارے ساتھ جانے والوں کا سربراہ تھا، اور اسے ہدایت کی کہ مرنے والے کی تمام اشیا احتیاط سے ساتھ لے لے۔

''اور مصری کی وہ تصویریں بھی مت بھولنا جو اس نے یونٹ میں آنے کے بعد کھنچوائی تھیں،'' اس کے دوست نے کہا۔

''مصری کون؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''وہی جو مرا ہے،'' اس نے جواب دیا۔

میں نے خیال کیا کہ 'مصری' اس کا بے تکلفی کا نام ہوگا اور جو کاغذوں میں لکھا ہے وہ اصل نام ہوگا۔

''کیا مصری اس کا بے تکلفی کا نام تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''غریبوں کے پاس بے تکلفی کے نام ہوتے ہیں کیا؟'' اس نے جواب دیا اور پھر اپنی بات کی وضاحت کی: ''آپ کے کاغذوں میں جو نام لکھا ہے وہی اصلی ہے — میں 'مصری' کو لفظی معنوں میں استعمال نہیں کر رہا تھا۔ کیا اس ملک کے ہر رہنے والے کو یہ نام نہیں دیا جا سکتا؟''

وہ مجھے نارمل دکھائی دے رہا تھا، لیکن گاؤں کی طرف جاتے ہوئے راستے میں جب اس نے

مجھے تاکید کی کہ 'مصری' کا نام ہرگز نہ لوں تو مجھے احساس ہوا کہ کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے، کوئی ایسی بات جس سے میں لاعلم ہوں، لیکن اس وقت میں نے اس پر کچھ زیادہ دھیان نہیں دیا۔

دفتر جا کر میں نے شعبے کی سربراہ خاتون سے باقی کارروائی کی تفصیل دریافت کی۔ میں نے پوچھا کہ آیا وہ مجھے کوئی چھپی ہوئی ہدایات یا ہدایت نامہ دے سکتی ہے، جس کی مدد سے میں تمام کارروائی مناسب طور سے انجام دے سکوں۔ اس نے ایک مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا کہ ایسا کوئی ہدایت نامہ یا تحریری ہدایات موجود نہیں ہیں؛ ان لوگوں نے تمام مناسب طریق کار اسی قسم کے حالات میں ان لوگوں سے سیکھے تھے جو ان سے پہلے یہ کام سرانجام دیتے رہے تھے۔

وہ کاغذ قلم لے آئی اور مجھ سے اس عمل کے مختلف مرحلوں کو نوٹ کرنے کو کہا۔ میں نے اسے بتایا کہ میرا حافظہ خاصا اچھا ہے اور میں ان مرحلوں کو زبانی یاد رکھ سکتا ہوں۔

''سب لوگ یہی کہتے ہیں،'' وہ ایسے لہجے میں بولی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اس معاملے کو بخوبی جانتی ہے، ''لیکن جب عملی اقدامات کا وقت آتا ہے تو وہ ان میں سے بہت کچھ بھول چکے ہوتے ہیں۔'' اس پر میں نے سعادت مندی سے لکھنا شروع کر دیا۔

''مسلح افواج کے کسی فرد کے جنگ میں کام آنے کی صورت میں،'' میں نے لکھا، ''خواہ وہ عام سپاہی ہو یا نان کمیشنڈ آفیسر، اس کی تدفین کے سلسلے میں مندرجہ ذیل دس اقدامات پر مبنی طریق کار پر عمل کیا جائے گا...'' (بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ آفیسروں کی تدفین کے سلسلے میں خصوصی طریق کار ہے جو سپاہیوں اور نان کمیشنڈ افسروں کی تدفین کے لیے اختیار کیے جانے والے طریق کار سے بالکل الگ ہے۔)

''۱۔ اس امر کی تصدیق کی جائے کہ جنگ میں کام آنے سے متعلق مسلح افواج کے طباعت اور اشاعت کے محکمے کے جاری کیے ہوئے مقررہ فارم پر تیار کردہ سرٹیفکیٹ موجود ہے؛ اور یہ کہ اس فارم پر تمام اندراجات مناسب طور سے کیے گئے ہیں اور اس پر دو عینی گواہوں کے دستخط اور چیف آف اسٹاف یا یونٹ کمانڈر کے تصدیقی دستخط موجود ہیں۔ اس فارم پر جنگ میں کام آنے کی تاریخ، وقت اور مقام اور ان حالات کا خلاصہ درج ہونا ضروری ہے جن میں موت واقع ہوئی۔

''۲۔ اگر آپریشنز کے مخصوص حالات کے باعث مذکورہ سرٹیفکیٹ موجود نہ ہو تو ماہانہ جائزے

Scanned with CamScanner

کے بورڈ کی نگرانی میں ایک تحقیقی کمیٹی قائم کی جائے جو جنگ میں ہونے والی موت کی تصدیق کرے اور مذکورہ بالا مکمل معلومات مہیا کرے۔

''۳۔ مرنے والے کے رہائشی پتے کی تصدیق کرنے والی سرکاری دستاویز حاصل کی جائے، کیونکہ درست پتے کا علم ہی وہ واحد ذریعہ ہے۔ جس کی مدد سے لاش کو اس کے گھر والوں تک بروقت پہنچانا ممکن ہے۔ اس پتے کی تصدیق کسی ذمہ دار افسر، یا کم از کم ایڈ جوٹنٹ سے کرائی جائے اور اسے رہائشی پتوں کے تازہ ترین رجسٹر سے، ترجیحاً کسی ایسے رجسٹر سے نقل کیا جائے جو حالیہ جنگی آپریشن کے سلسلے میں تیار کیا گیا ہو، کیونکہ عموماً اسی میں دیے گئے پتے درست ہوتے ہیں۔

''۴۔ جنگ میں کام آنے والے شخص کی اپنی تحریر میں جمع کرائے گئے بیان کی نقل حاصل کی جائے جس میں اس نے اپنے وارث کی نشان دہی کی ہو۔ اگر اس کی فائل میں اس قسم کے ایک سے زیادہ بیان پائے جائیں تو تازہ ترین بیان کو درست سمجھا جائے۔

''۵۔ جنگ میں کام آنے والے سپاہی کے جسم پر موت کے بعد پائی جانے والی تمام اشیا اس کے بیان کردہ وارث کے حوالے کی جائیں۔ ان تمام اشیا کا اندراج ایک سرکاری رپورٹ میں کیا جائے اور اس پر وارث کے وصولیابی کے دستخط کافی ہوں گے۔

''۶۔ مسلح افواج کے محکمۂ انسانی وسائل کی جانب سے مرنے والے کے خاندان کو تدفین کے اخراجات اور فوری مالی امداد کی ادائیگی کی جائے۔ اس رقم کا تخمینہ لگاتے ہوئے ان ہدایات کو پیش نظر رکھا جائے جو سپاہیوں اور نان کمیشنڈ افسروں کے بارے میں پہلے سے موجود ہیں۔

''۷۔ جنگ میں کام آنے کی بابت یونٹ کی جاری کردہ رپورٹ کی بنیاد پر نزدیک ترین دفتر صحت سے مرنے والے کی موت کا سرٹیفکیٹ اور تدفین کا اجازت نامہ حاصل کیا جائے۔

''۸۔ یونٹ کے پوسٹ مارٹم کے کمرے سے مرنے والے کی تجہیز و تکفین کی تصدیق کی جائے اور لاش کو رہائشی پتے پر لے جانے سے پہلے اس بات کا یقین کیا جائے کہ اسے سربمہر تابوت میں حفاظت سے رکھ دیا گیا ہے۔

''۹۔ رہائشی قصبے یا گاؤں میں پہنچنے پر ڈیوٹی پر مامور افسر مقامی حکام کو مطلع کرے اور لاش کو فوری طور پر مقامی قبرستان میں پہنچانے کا بندوبست کرے۔ اس موقعے پر وہ مرنے والے کے رشتے

Scanned with CamScanner

داروں کی شناخت کرے اور انھیں مقامی حکام کی موجودگی میں قبرستان لے جائے۔ مرنے والے کا تابوت فوجی گاڑی سے براہ راست قبر تک پہنچایا جائے اور کسی کو تابوت کھولنے کی اجازت نہ دی جائے۔

''۱۰۔ اس ڈیوٹی کو انجام دے کر واپس آنے پر سماجی خدمات کے شعبے کا افسر ایک تفصیلی رپورٹ تحریر کرے جس میں اپنے اٹھائے ہوئے تمام اقدامات کو بیان کرے اور اس کے علاوہ (چونکہ اسے طریق کار میں ترمیمات تجویز کرنے کا اختیار حاصل ہے) اپنی سفارشات اور تجاویز تحریر کرے۔''

میں نے وہ کاغذات اٹھائے جن پر طریق کار کے یہ دس مرحلے نوٹ کیے تھے اور پھر انھیں غور سے پڑھا۔ اس کے بعد میں نے اپنا لائحۂ عمل تیار کیا۔ اس نان کمیشنڈ افسر کو بلا کر جسے میرے ساتھ جانا تھا، میں نے موت کا تصدیق نامہ اور تدفین کا اجازت نامہ، اور مرنے والے کے دستخط شدہ، مہر کردہ اور تصدیق کردہ بیان کی نقل حاصل کرنے اور تجہیز و تکفین کی تصدیق کرنے کی ذمے داریاں اس کے سپرد کیں۔ (یہ بات قابل ذکر ہے کہ جنگ میں کام آنے والوں کی لاشوں کو غسل نہیں دیا جاتا۔) مالی معاملات کی جانچ پڑتال کرنے کی غرض سے میں خود محکمۂ انسانی وسائل کے دفتر کو روانہ ہوا، اور ایک اور سپاہی کو ہدایت کی کہ وہ گاڑی کے لیے سفر کا اجازت نامہ، اور پٹرول کی ٹنکی اور اضافی ٹنکی کو بھروانے کے لیے تحریری احکامات حاصل کرے۔ میں نے ان دونوں سے کہا کہ دو گھنٹے بعد پوسٹ مارٹم کے کمرے کے باہر آ کر مجھ سے ملیں۔

چہل پہل، نوجوان مردوں اور عورتوں اور اپنے روزمرہ کے کاموں سے آتے جاتے لوگوں سے بھری سڑکوں پر نکلتے ہی مجھے اس وسیع خلیج کا خیال آیا جو ہمیں ان سے جدا کرتی تھی۔ تبھی مجھے یہ بھی یاد آیا کہ میں نے افطار کے بعد اپنے کچھ دوستوں سے ملنے کا وعدہ کر رکھا ہے تاکہ اپنے کام کے پہلے دن کا حال انھیں سنا سکوں، اور ساتھ ہی احساس ہوا کہ اب میں ان سے نہیں مل سکوں گا، بجز اس کے کہ کسی معجزے سے میں اپنی ڈیوٹی پوری کر کے افطار سے پہلے واپس آ جاؤں۔ میرا خیال تھا کہ ایسا نہیں ہو سکے گا اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ ان میں کسی ایک سے رابطہ قائم کر کے طے شدہ پروگرام کے مطابق ان سے نہ مل پانے کے لیے معذرت کر لوں، اور یہ بھی بتا دوں کہ مجھے ایک ڈیوٹی پر جانا پڑ رہا ہے جس کی نوعیت میں انھیں فون پر نہیں بتا سکتا، اور ڈیوٹی پوری ہونے سے پہلے اس کا راز فاش بھی نہیں کر سکتا، خاص طور پر اس بات کے پیش نظر کہ ہمارا ملک ایک نازک وقت سے گزر رہا ہے۔ جو کام مجھے سونپا گیا تھا

Scanned with CamScanner

وہ معمول کا کام تھا لیکن ایسا ظاہر کرنے میں کوئی حرج نہ تھا کہ یہ غیر معمولی اہمیت کا کام ہے۔

ہم لوگوں کو عجوزہ کے — جو قاہرہ کا ایک متوسط علاقہ ہے — ایک فرنشڈ فلیٹ میں ملنا تھا جسے میں نے اپنے تین اور ساتھیوں کے ساتھ مل کر کرائے پر لے رکھا تھا۔ ہماری ٹولی کا ایک دوست میری طرح فوج میں تھا، دوسرے کو اس بنا پر استثنیٰ مل گیا تھا کہ وہ اپنے گھر میں اکلوتا لڑکا تھا، اور تیسرا کچھ ایسے طریقے اختیار کر کے لام بندی سے بچ نکلا تھا جن کی تفصیل بتانا میں مناسب نہیں سمجھتا۔ فلیٹ میں فون نہیں تھا، اور اس کا ہر مکین اپنی مرضی سے جو چاہتا کرتا تھا، واحد شرط یہ تھی کہ وہ باقی ساتھیوں کو اپنے آنے کے وقت سے پیشگی مطلع کر دے، تاکہ کسی کی مشغولیت میں خلل نہ پڑے۔ میں نے واپسی پر ان میں سے ایک سے رابطہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ پہلے میں نے سوچا کہ گھر جا کر اپنی کچھ چیزیں لے لوں — زیر جامہ، رات کے کپڑے، بجلی کا ریزر اور تولیہ — لیکن پھر ارادہ بدل دیا، کیونکہ ہر کسی کا کہنا تھا کہ مرنے والے کے گاؤں میں کیے جانے والے کام میں گھنٹے بھر سے زیادہ وقت نہیں لگے گا، اور ممکن ہے چند منٹ میں ہی سب معاملہ نمٹ جائے۔ مرنے والے کے اقربا مجھے سربمہر تابوت میں بند اپنے بیٹے کی غمناک واپسی سے ہی جوڑ کر دیکھیں گے اس لیے جب میں چلنے کا ارادہ ظاہر کروں گا تو کوئی مجھے روکنے کی کوشش تو کرے گا نہیں۔

مجھے اپنی چکنی، گوری جلد والی حبیبہ یاد آئی، اور پھر اس حسین شام کا خیال آیا جو میں، اپنی ٹولی کے دوستوں سے اجازت لے کر، عجوزہ والے فلیٹ میں اس کے ساتھ گزارنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میرے دوست یقیناً مجھے شرارت سے آنکھ ماریں گے اور اس شام کے سلسلے میں اپنی نیک خواہشات کا اظہار کریں گے۔ مجھے اس بات پر جھنجھلاہٹ سی ہو رہی تھی کہ میرے پاس اس سے رابطہ قائم کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا اور میرے وقت پر نہ پہنچنے کا نتیجہ یقینی طور پر مہینوں اس کی ناراضگی اور طعنوں اور میری وضاحتوں اور معافیوں کی صورت میں نکلنے والا تھا۔

دفاتر میں میں نے سویلین ملازموں اور افسروں کو پرتعیش گردوپیش میں پایا۔ ان کے قدموں تلے بچھے ہوئے قالین اتنے دبیز تھے کہ جوتے ان میں پورے کے پورے ڈوب جاتے تھے؛ ان کی میزوں کے ساتھ رکھے جلتے ہوئے ہیٹر سرخ ہو رہے تھے (حالانکہ ابھی جاڑا آیا بھی نہ تھا)؛ اور فون ان کی دسترس میں رکھے تھے جن کی گھنٹی اچانک بج اٹھتی اور انھیں اطلاع مل جاتی کہ فلاں خیریت سے

ہے یا گوشت کا کیا بھاؤ چل رہا ہے، یا کوئی انھیں دلاسا دیتا کہ مرغی کے گوشت کے راشن کا بندوبست کر دیا جائے گا، یا بتاتا کہ بلیک مارکیٹ میں ڈالر کتنے میں بک رہا ہے، یا یہ کہ خوشگوار رات بسر کرنے کے لیے سب سے اچھی جگہ کون سی ہے۔ میں نے اپنے ہاتھ میں تھامے ہوے کاغذات ان کے حوالے کیے اور تصدیق کی کہ دو دن پہلے مصر کا ایک فرزند اس کی خاطر جنگ میں کام آ گیا۔ میں توقع کر رہا تھا کہ وہ کاغذات ملاحظہ کرتے ہوے تھوڑے بہت احترام کا مظاہرہ کریں گے اور، چونکہ مجھے سونپا گیا کام اتنا پرمعنی تھا، مجھے اس کی انجام دہی میں ہر قسم کی مدد فراہم کریں گے۔ اس لیے مجھے جھٹکا سا لگا جب لوہے کی جالی کے دوسری طرف بیٹھے ایک شخص نے غصے سے کاغذات پر نظر ڈالی اور تیکھے لہجے میں مجھے سرزنش کی، ''تمھیں وقت پر آنا چاہیے تھا۔''

جتنی دیر وہ کاغذات کا مطالعہ کرتا رہا، میں اس کے چہرے کا جائزہ لیتا رہا۔ میں اس کے تاثر میں کسی تبدیلی کا اندازہ نہ لگا سکا۔ کاغذات اس نے مجھے یہ کہتے ہوے لوٹا دیے کہ ''جنگ میں کام آنے والے بیان پر لگی ہوئی مہر صاف نہیں ہے۔ دوبارہ مہر لگوانی ہوگی۔'' میں نے اسے بتایا کہ یونٹ محاذ پر متعین ہے۔ وہ بولا، ''تو کیا ہوا؟'' میں نے وضاحت کی کہ مرنے والے کی موت کو تین دن گزر چکے ہیں۔ اس نے پہلے مجھے چپ رہنے کا اشارہ کیا اور پھر اپنی داہنی طرف کے دروازے کی طرف انگلی اٹھا کر مجھ سے کہا کہ مجھے افسرِ اعلیٰ سے بات کرنی ہوگی۔ افسرِ اعلیٰ اپنے ہاتھ میں لمبی سی تسبیح لیے بیٹھا، آنکھیں بند کیے، منھ ہی منھ میں کچھ بدبدا رہا تھا۔ میں نے بات شروع کی لیکن اس نے اپنا وظیفہ پورا ہونے تک میری بات کا کچھ جواب نہ دیا۔ پھر اس نے بایاں ہاتھ کاغذات لینے کے لیے بڑھایا اور داہنے ہاتھ سے تسبیح کے دانوں سے کھیلتا رہا۔ اس نے کاغذات پر بہت دیر تک نظریں جمائے رکھیں۔ اس کے ہونٹ پھر ہلنے لگے تھے، اور میں نے امید کی کہ وہ اپنے سامنے کے کاغذوں کو پڑھ رہا ہوگا۔ جب اسے پہلے والے شخص کے اعتراض کے بارے میں معلوم ہوا تو اس نے اعلان کیا کہ اس کا اعتراض بالکل درست تھا اور اس نے پہلے سے نافذ احکامات کی پابندی کی تھی۔ ہماری بات چیت بہت جھنجھلا دینے والی اور قطعی غیرضروری تھی۔ لیکن چونکہ صورت حال اتنی نازک تھی اور ہم اس پر گفتگو کرنے میں اتنا وقت گزار چکے تھے، اس نے ایک حل تجویز کیا۔ مجھے ایک تصدیق نامہ تحریر کرنا ہوگا، اس نے کہا، جس میں کہا گیا ہو کہ مرنے والے کے بیان پر لگی ہوئی مہر اصلی ہے، اور اس کے ساتھ ہی

Scanned with CamScanner

اپنے بارے میں پوری تفصیلات دینی ہوں گی اور مہر کے جعلی ثابت ہونے کی صورت میں تمام ذمے داری اپنے سر لینے کا اقرار کرنا ہوگا۔

میں واپس اسپتال اس حالت میں پہنچا کہ مجھے سخت تھکن محسوس ہو رہی تھی، اور وہاں بیٹھ کر ان لوگوں کا انتظار کرنے لگا جو وہ مختلف قسم کی دستاویزات حاصل کرنے گئے تھے جو ہمارے کام کے لیے درکار تھیں۔اس کے بعد میں اپنے دوستوں میں سے ایک سے رابطہ قائم کر کے اسے یہ اطلاع دے سکا کہ آج طے شدہ پروگرام کے مطابق ان لوگوں سے نہیں مل سکوں گا۔آخرکار ہم سب ایک جگہ جمع ہوئے اور لاش کا تابوت گاڑی کے پچھلے حصے میں رکھا گیا۔مکینک، مرنے والے کا دوست اور میرے ساتھ جانے پر مامور ایک سپاہی تابوت کے پاس بیٹھ گیا اور دوسرا میرے اور ڈرائیور کے بیچ میں۔سہ پہر ڈھل رہی تھی۔قاہرہ سے نکلنے سے پہلے ہم نے اندازہ لگایا کہ اس سفر میں کتنا وقت لگے گا، جس پر ہمیں احساس ہوا کہ ہم افطار سے پہلے گاؤں نہیں پہنچ سکیں گے۔ہمیں روزہ راستے میں، طنطہ کے قصبے میں رک کر کھولنا ہوگا اور پھر گاؤں کی طرف اپنا سفر جاری رکھنا ہوگا جہاں ہم آرام سے افطار کے بعد کسی وقت پہنچیں گے۔

میں نے اپنی جیب میں ٹٹول کر پتے کے کاغذ کی موجودگی کا اطمینان کیا۔ایک لمبا سفر ہمارے سامنے تھا۔گاڑی آرام دہ نہ تھی اور خزاں کی رکی ہوئی ہوا کے سبب حبس ہو رہا تھا۔ہم مغرب کی سمت قاہرہ سے اسکندریہ کے ڈیلٹا کی طرف جانے والی سڑک پر سفر کر رہے تھے اور سورج کی زرد، نرم دھوپ ہمارے چہروں پر پڑ رہی تھی۔گاڑی سست رفتار تھی لیکن ڈرائیور اس کا دفاع کرتے ہوئے دعویٰ کر رہا تھا کہ یہ تمام دوسری گاڑیوں کو پیچھے چھوڑ سکتی ہے؛ اس نے اسپیڈومیٹر کی طرف اشارہ کیا جس پر ۱۶۰ کلومیٹر فی گھنٹہ تک کے ہندسے لکھے ہوئے تھے۔تاہم حادثوں سے بچنے کے لیے — خاص طور پر اس لیے کہ گاڑی کو بیشتر ہائی وے پر چلنا پڑتا تھا — فوجی مہمات کے کمانڈر نے اس کی زیادہ سے زیادہ رفتار گھٹا کر ساٹھ کلومیٹر فی گھنٹہ مقرر کر دی تھی۔

میں گاڑی کے جھکولوں کے اثر سے کھڑکی کے شیشے سے سر ٹکا کر اونگھنے لگا۔میرے برابر میں بیٹھا سپاہی بھی اونگھ گیا ہوگا، کیونکہ ڈرائیور نے ہم دونوں کو جگایا اور ایک لمبا لیکچر دینے لگا کہ ہائی وے پر گاڑی چلانے والے کے برابر کی سیٹ پر بیٹھنے والوں کی کیا ذمے داری ہوتی ہے۔اس نے کہا کہ

زیادہ تر حادثے اسی وجہ سے ہوتے ہیں کہ ڈرائیور کے برابر میں بیٹھنے والے سو جاتے ہیں۔ اسے اکثر سفر پر جانا ہوتا ہے اور وہ اپنے ساتھ بیٹھے لوگوں سے بات چیت کرنے پر ہی انحصار کرتا ہے؛ اگر اس کے برابر بیٹھا شخص اچھی بات چیت کرنے والا ہو تو وہ پوری طرح بیدار رہتا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ سب سے دلچسپ گفتگو قصوں کہانیوں اور داستانوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ دوسری طرف سائنس یا سیاست کا ذکر بھی آ جائے تو اسے فوراً نیند آ لیتی ہے۔

''اگر تمھارے برابر میں بیٹھا ہوا شخص دلچسپ بات چیت نہ کر سکتا ہو تو پھر کیا ہوتا ہے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

اس نے ہنس کر گاڑی کی رفتار دھیمی کر دی۔ پھر اس نے اپنی وردی کی ٹوپی اتار کر اسے گیئر کی سلاخ پر ٹانگ دیا اور باتیں کرنے لگا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ اسے گاڑی چلانا ایک ایسے شخص نے سکھایا تھا جس نے ڈرائیونگ بہت پہلے انگریزوں کے کیمپ میں سیکھی تھی؛ اور اس شخص نے اسے بتایا تھا کہ اگر کبھی وہ اکیلا سفر کر رہا ہو اور گاڑی کی حرکت کے اثر سے اسے نیند آنے لگے تو اس کے توڑ کے لیے کچھ باقاعدہ اقدامات ہیں جنھیں اس طرح یاد کر لینا چاہیے جیسے پہاڑے یاد کیے جاتے ہیں۔ پہلا قدم یہ ہے کہ خود کو وہ کہانیاں سناؤ جو تمھاری دادی اماں جاڑوں کی لمبی شاموں میں سنایا کرتی تھیں۔ لیکن کہانیاں ہمیشہ کارآمد ثابت نہیں ہوتیں، اس لیے جب تمھارا دھیان بھٹکنے لگے تو دوسرا قدم یہ ہے کہ سیٹی پر کچھ سادہ، جانی پہچانی دھنیں بجانے لگو اور نیند بھگانے کے لیے زور زور سے گانے لگو۔

جو کچھ وہ بتا رہا تھا وہ میرے لیے نیا تھا، پھر بھی مجھے اکتاہٹ ہونے لگی۔ میں نے اس کی بک بک بند کرانے کے لیے اس سے پوچھا: ''اگر یہ سب کچھ نیند بھگانے میں کارآمد نہ ہو تو پھر تم کیا کرتے ہو؟''

یہ بہت اچھا سوال ہے، اس نے کہا، اس سے اس ذہانت کا پتا چلتا ہے جو افسروں میں شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتی ہے۔ ''اگر میں یہ سب کچھ کر کے بھی بیدار نہ رہ سکوں،'' وہ بولا، ''تو ایک آخری طریقہ موجود ہے۔ معلوم ہے وہ کون سا طریقہ ہے؟''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا!'' میں نے حیران ہو کر کہا۔

تو پھر، اس نے کہا، وہ مجھے یہ طریقہ ضرور بتائے گا اور اس کے لیے اجر اللہ سے طلب کرے گا۔ آخری قدم یہ ہے کہ اگر تم داہنے ہاتھ سے کام کرتے ہو تو داہنے ہاتھ سے، ورنہ بائیں ہاتھ سے

Scanned with CamScanner

اسٹیئرنگ تھام کر دوسرے ہاتھ سے زور زور سے اپنے ماتھے کے اوپر کے بال کھینچنے لگو۔

اس کی زبان اس وقت بند ہوئی جب اچانک گاڑی کے پچھلے حصے سے کھٹکھٹانے کی آواز آئی، جس کا مطلب تھا کہ پیچھے بیٹھے ہوئے لوگ گاڑی رکوانا چاہتے ہیں۔ جب ہم نیچے اترے تو پیچھے بیٹھے ہوئے لوگ ہمیں پسینے میں شرابور دکھائی دیے۔ ان کے چہرے سرخ ہو رہے تھے۔ انھوں نے ہمیں بتایا کہ ان کا دم گھٹا جا رہا تھا اور لاش سے اٹھنے والے تعفن کی وجہ سے ہوا اتنی خراب ہوگئی تھی کہ ان میں سے ایک کو قے آ گئی تھی۔ مجھے احساس ہوا کہ اس لاش کے قریب بیٹھنا کتنا دشوار رہا ہوگا جو پہلے تو تین دن تک محاذ کے پوسٹ مارٹم کے خیمے میں پڑی رہی اور پھر اسپتال کے پوسٹ مارٹم کے کمرے میں جس میں کسی قسم کے کارآمد آلات بھی نہ تھے (اگرچہ، جیسا کہ مجھے اس کے انچارج فوجی نے بتایا، یہ کمرہ مصر کی لڑی ہوئی چار جنگوں کی لاشیں وصول کر چکا تھا)۔

ہم کھلی ہوا میں بیٹھ کر آرام کرنے لگے اور ڈرائیور نے ریڈی ایٹر میں پانی تبدیل کیا۔ باقی کے سفر میں خاموشی کا ایک لمحہ بھی نہ آیا۔ ڈرائیور مسلسل بولتا رہا۔ اس بار اس نے ہمیں اپنے ان تمام سفروں کے قصے سنائے جو اس نے ان لوگوں کی لاشیں پہنچانے کے سلسلے میں کیے تھے جو جنگ میں کام آئے تھے یا کسی بیماری میں مبتلا ہو کر اسپتال میں مرے تھے۔ کہنا چاہیے کہ اس کی گفتگو نے ہوتے ہوتے شیخی خوری کا انداز اختیار کر لیا۔ جو بات اسے دوسرے لوگوں سے جدا کرتی ہے، اس نے کہا، وہ اس کے فولادی اعصاب ہیں، اور اپنی بات کے ثبوت کے طور پر اس نے بتایا کہ اس گاڑی کو چلانے والا اس سے پچھلا ڈرائیور لاشیں ڈھوتے ڈھوتے پاگل ہو گیا تھا اور اس وقت ایک دماغی شفاخانے میں بند ہے۔ اس کی بیماری نروس بریک ڈاؤن سے شروع ہوئی تھی، جو اپنے عزیز کی موت کی خبر پانے والے خاندانوں کے ردعمل اور تدفین کے موقعے پر ان کی حرکات دیکھنے کا نتیجہ تھا۔ اس کے برخلاف وہ خود پچھلے تین سال سے یہ ناخوشگوار کام انجام دے رہا ہے اور اب تک ہوشمند ہے۔

آخر میں اس نے اس شخص کی بات کی جس کی لاش ہم اس وقت لے جا رہے تھے، اس کے بارے میں جو کچھ جانتا تھا ہمیں بتایا اور اس کے لیے اللہ کی رحمت طلب کی۔ پہلے اس نے مجھ سے پوچھا کہ آیا یہ شخص کسی گاؤں کا رہنے والا تھا یا کسی ضلعی قصبے کا یا صوبائی صدر مقام کا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ یہ گاؤں کا رہنے والا تھا تو اس نے تبصرہ کیا کہ گاؤں کے لوگ فراخدل اور بہادر ہوتے ہیں

Scanned with CamScanner

اگرچہ اپنے رنج وغم کے اظہار میں مبالغہ کرتے ہیں۔

مغرب کا وقت ہو چلا تھا اور ہمیں سڑکوں پر کم ہوتی ہوئی بھیڑ اور اترتے ہوئے سناٹے سے اندازہ ہونے لگا تھا کہ افطار ہونے والا ہے۔ چنانچہ ہم نے روزہ کھولنے کے لیے اپنے راستے میں پڑنے والے پہلے قصبے کا رخ کیا، اور چونکہ میں کسی ریستوران میں نہیں کھانا چاہتا تھا، دو سپاہی بازار سے کھانے کی چیزیں خریدنے چلے گئے۔ میں نے کسی قہوہ خانے میں جانے سے انکار کر دیا، چنانچہ ہم نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ہی جلدی سے روزہ افطار کیا اور چائے پی جو نزدیک کے کسی چائے خانے سے لائی گئی تھی۔ ایک سپاہی اور مکینک نے قریب کے قہوہ خانے میں جا کر حقہ پینے کی اجازت مانگی، اور میں نے انھیں جلدی لوٹنے کی ہدایت کی۔

پھر جب قصبے کے باہر اندھیرا چھا گیا تھا، ہم دوبارہ گاؤں کی طرف روانہ ہوئے۔ مرنے والے کا دوست اپنی یادداشت سے اس راستے کی نشان دہی کرنے لگا جو ہمیں اختیار کرنا تھا، لیکن مجھے ڈر ہوا کہ ہم بھٹک جائیں گے۔ ہم اس مقام کے قریب پہنچے جہاں ہمیں بڑی سڑک سے اتر کر ایک کچے راستے پر مڑنا تھا۔ گاؤں کا راستہ مرنے والے کے دوست کے ذہن پر نقش تھا، چنانچہ مجھے راستے پر اس کی بتائی ہوئی نشانیاں دکھائی دیتی چلی گئیں۔ اس نے بتایا کہ ہمیں ایک پرائمری اسکول کے قریب، ریلوے اسٹیشن کے برابر میں ایک پل دکھائی دے گا۔ اسکول کے عقب میں ریلوے کے کارکنوں کے کوارٹر تھے جن کے سامنے وہ لیول کراسنگ تھی جس پر سے ہو کر ہمیں کچے راستے پر اترنا تھا۔

اس کچے راستے پر آتے ہی ہم نے خود کو گھپ اندھیرے میں گھرا ہوا پایا۔ ہم رک گئے اور مرنے والے کا دوست اتر کر کراسنگ کی طرف گیا جہاں روشنی کا ایک چھوٹا سا نقطہ دکھائی دے رہا تھا جو اصل میں اس چولھے کی آگ تھی جس پر کراسنگ کا چوکیدار چائے بنا رہا تھا۔ اس نے چوکیدار سے پتا پوچھا تو اس نے پتا بتانے کے بجائے اپنے برابر میں بیٹھے ہوئے ایک کسان کی طرف اشارہ کیا۔ کسان سے کہا، ''تم خوش قسمت ہو،'' اور پھر مرنے والے کے دوست کو بتایا کہ ہمیں اس مبارک وقت پر ایک نیک کام کرنا چاہیے کیونکہ اس کسان کو اسی گاؤں جانا ہے اور اس وقت وہ کسی سواری کے انتظار ہی میں بیٹھا ہوا تھا؛ وہ ہمارے ساتھ جا کر ہمیں گاؤں تک پہنچا دے گا۔

کسان اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے جلابیے پر سے گرد جھاڑنے لگا — وہ ننگی زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔

Scanned with CamScanner

چوکیدار نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور ہمیں چائے پینے کی دعوت دی (ہمیں اس کی مدھم، بلبلے سے بناتی ہوئی آواز دور سے سنائی دے رہی تھی) لیکن ہم نے شکریے کے ساتھ انکار کر دیا۔ کسان اپنی بے تحاشا ممنونیت کا اظہار کرتا ہوا ہمارے ساتھ آ بیٹھا اور کہنے لگا کہ ہم غیبی امداد کے طور پر پہنچے ہیں۔ اگر کوئی گاڑی نہ آتی، اس نے کہا، تو اسے ساری رات کراسنگ پر بیٹھا رہنا پڑتا؛ اور یہاں سے کبھی کبھار ہی کوئی گاڑی گزرتی ہے۔

''کیا گاؤں بہت دور ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، زیادہ دور نہیں،'' اس نے کہا۔

''کتنے کلومیٹر ہوگا؟''

اس نے میرے سوال کا جواب ایک مختلف صورت میں دیا۔ ''پیدل دو گھنٹے کا راستہ ہے،'' وہ بولا ''گاڑی سے پندرہ منٹ کا۔''

اس پر ڈرائیور بول اٹھا۔ کہنے لگا کہ اگر ایسا ہے تو وہ اپنے وسیع تجربے سے بتا سکتا ہے کہ یہ فاصلہ کم سے کم دس کلومیٹر ہوگا۔ میں نے کسان سے پوچھا کہ وہ پیدل کیوں نہیں چلا گیا، خاص طور پر جبکہ وہاں کا موسم خاصا خوشگوار اور ہوا صاف ہے۔ اس پر وہ ہنسنے لگا۔ بولا کہ میں ضرور گاؤں کا نہیں بلکہ شہر کا رہنے والا ہوں گا جو سورج ڈوبنے سے دن نکلنے تک رنگ برنگی روشنیوں میں نہایا رہتا ہے اور پوری طرح لیس پولیس والوں سے بھرا رہتا ہے جو لوگوں اور ان کے مکانوں اور دکانوں کی حفاظت پر متعین رہتے ہیں۔ اس کے برخلاف یہاں رات میں ہر طرف بھیڑیے اور کتے منڈلاتے رہتے ہیں۔

اس کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی، اس لیے اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ جہاں تک اس کی یادداشت کام کرتی ہے یہاں کے لوگ ہمیشہ سے خاموشی، سکون اور ہم آہنگی کی زندگی گزارتے چلے آئے ہیں۔ لیکن اِدھر کچھ عرصے سے راتوں کو کچھ ٹولیاں گھومنے لگی ہیں جو اغوا، قتل اور لوٹ مار کی وارداتیں کرتی ہیں؛ یہ وارداتیں اب بڑھتی چلی جا رہی ہیں اور کوئی نہیں جانتا کہ آگے چل کر کیا ہوگا۔ کون سوچ سکتا تھا، اس نے سوال کیا، کہ اس پرامن دیہاتی علاقے میں جہاں سخاوت، برداشت اور ہم آہنگی کی روایات رہی ہیں، ایسی باتیں پیش آنے لگیں گی؟ وہ ایک خوش دل آدمی

Scanned with CamScanner

معلوم ہوتا تھا اور میں نے اس کے لیے پسندیدگی محسوس کی — لیکن وہی بعد میں ہمیں پیش آنے والی ساری مصیبتوں کا سبب ثابت ہوا۔ جب وہ لٹیروں کی ان ٹولیوں کے بارے میں اپنے قصے پورے کر چکا تو ہم سب خاموش ہو گئے، اور اس خاموشی کو توڑنے والی واحد آواز گاڑی کی گھر گھراہٹ تھی جو ناہموار راستے پر بڑھی چلی جا رہی تھی۔ اچانک کسان میری طرف مڑا۔ ''آپ کو گاؤں میں کس سے ملنا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے مرنے والے کے باپ کا نام بتایا جو کاغذات میں درج تھا۔ مجھے یہ نام اچھی طرح یاد تھا کیونکہ میں نے کاغذات نکال کر اسے بار بار پڑھا تھا۔

''وہ گاؤں کا عمدہ ہے،'' کسان نے کہا، ''اس وقت گاؤں ہی میں ہے۔''

ڈرائیور، جس نے ہر گفتگو میں شامل ہونے کا تہیہ کر رکھا تھا، گاڑی کے پچھلے حصے کی طرف اشارہ کر کے کسان سے کہنے لگا، ''شہید کو لے جانا بڑا غمناک کام ہے۔''

کسان نے چونک کر اپنے سینے پر ہاتھ مارا۔ ''اللہ ہمیں مصیبت سے بچائے۔ کون ہے یہ؟''

''عمدہ کا بیٹا۔''

''لیکن عمدہ کا کوئی بھی بیٹا شہر میں زیرِ علاج نہیں تھا۔ یا کوئی حادثہ ہوا ہے؟''

''حادثے سے تمھارا کیا مطلب ہے؟'' ڈرائیور غصے سے چلایا۔ ''یہ محاذ پر شہید ہوا ہے۔''

''جنگ میں؟'' کسان نے پوچھا۔

''آہ! آخر کار اس کی سمجھ میں آ ہی گیا!''

کسان کچھ دیر سوچتا رہا، اس کے چہرے پر گہرے تفکر کا تاثر تھا۔ اچانک اس نے اپنا ہاتھ ہوا میں بلند کیا۔ ''لیکن عمدہ کا کوئی بھی بیٹا فوج میں نہیں ہے!'' اس نے کہا۔

''یہ تمھیں کس نے بتایا؟'' مرنے والے کے دوست نے پہلی بار زبان کھولی۔

''مجھے اس کا پورا یقین ہے۔''

''ہمیں بھی اس بارے میں پورا یقین ہے۔''

اس کے بعد خاموشی کا جو مختصر سا وقفہ آیا اس سے ہم میں سے کسی کو کوئی تسکین نہیں ملی۔ کسان، جو بہت مضطرب تھا، چین سے بیٹھ نہیں پا رہا تھا اور اپنی دھن میں بولتا جا رہا تھا۔ ''عمدہ کے سارے بیٹوں

Scanned with CamScanner

کو بھرتی سے استثنیٰ حاصل ہو گیا تھا،'' اس نے کہا، '' اور ویسے بھی وہ اب اس عمر سے نکل چکے ہیں۔ صرف سب سے چھوٹا اس عمر کا ہے کہ اسے فوج میں بھرتی ہونا چاہیے تھا، لیکن وہ تو گاؤں میں موجود ہے۔''

''تم نے اسے آخری بار کب دیکھا تھا؟''

''آج صبح۔ میں نے اسے سلام بھی کیا تھا۔''

''شاید عمدہ کا کوئی اور بیٹا بھی ہو جس کا تمھیں علم نہ ہو،'' مرنے والے کا دوست تلخ لہجے میں بولا۔

کسان نے طنز کے اس عنصر کو محسوس کر لیا جو گفتگو میں در آیا تھا اور اَور زیادہ طنزیہ لہجے میں کہنے لگا، '' کسے معلوم؟ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عمدہ کا بیٹا طلسماتی طاقت رکھتا ہو اور ایک ساتھ دو جگہوں پر موجود ہو سکتا ہو۔ آخر ہم لوگ معجزوں کے دور میں رہ رہے ہیں نا!''

چنانچہ میں نے خود کو ایک مسئلے کی گرفت میں پایا۔ جب کسان نے اپنی باتیں شروع کی تھیں تو میں نے انھیں خالی خولی باتوں پر ہی محمول کیا تھا جن سے سفر جلدی کٹ سکتا تھا۔ مجھے یہ اندازہ تک نہ تھا کہ اس کی باتیں ہمیں ایک مسئلے سے دوچار کر دیں گی — ایک ایسے مسئلے سے جس کی میں نے ہرگز پیش بینی نہیں کی تھی اور جس سے نمٹنے کا کوئی طریقہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اگر میں اپنے سپرد کیے گئے اس پہلے کام میں ناکام ہو گیا تو اس سے یونٹ میں میرے مستقبل پر برا اثر پڑے گا۔ اپنے بڑھتے ہوئے اضطراب پر قابو پانے کے لیے میں نے مرنے والے کا نام لیا۔

کسان کی آواز میں پہلی بار غصے کی جھلک آئی۔ '' وہ زنخا،'' اس نے کہا، '' وہی تو عمدہ کا سب سے چھوٹا بیٹا ہے۔'' وہ کہتا رہا، '' اور وہ زنخا ہے، گاؤں میں کسی سے بھی پوچھ لو۔''

''کیا اسی سے آج صبح تمھاری ملاقات ہوئی تھی؟''

''ہاں، بالکل۔'' پھر کچھ نہ سمجھ پاتے ہوئے اس نے سوال کیا، '' لیکن جب وہ گاؤں میں تھا تو پھر محاذ پر کس طرح کام آ گیا؟''

''شاید وہ عیوضی کے طور پر کام آ گیا ہو،'' مرنے والے کے دوست نے آہستگی سے کہا۔

کسان کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی، اور نہ اس سے اگلی بات۔ '' اس مختار نامے کے تحت جو مصر نے اس کام کے لیے اسے دیا تھا۔''

میں نے ڈرائیور سے گاڑی روکنے کو کہا اور بتیاں نہ بجھانے کی ہدایت کی۔ پھر میں کسان کو

Scanned with CamScanner

ساتھ لے کر نیچے اتر آیا۔ میں نے روشنی میں جا کر جیب سے کاغذات نکالے اور مرنے والے کے بارے میں درج تمام تفصیلات کو ایک بار پھر غور سے پڑھا: نام، گاؤں کا نام اور باپ کا پیشہ۔ ساری تفصیلات بالکل درست ہیں، کسان نے کہا، سوائے اس کے کہ جس نوجوان کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ محاذ پر کام آ گیا وہ گاؤں میں زندہ موجود ہے۔ ہم پھر سوار ہوئے اور ڈرائیور اضطراب اور اندیشوں سے بھری خاموشی میں گاڑی چلانے لگا۔ اس نے ہمیں یقین دلایا کہ اس کے لیے یہ کوئی نئی کہانی نہیں ہے اور وہ ایسی چیزیں وقوع پذیر ہوتے پہلے بھی دیکھ چکا ہے۔ میں اس پر چلایا پڑا اور وہ اپنی بات نامکمل چھوڑ کر چپ ہو گیا۔ میں نے اسے رفتار تیز کرنے کو کہا اور کسان سے آخری بار دریافت کیا کہ آیا وہ جو کچھ کہہ رہا ہے اس پر اسے پورا یقین ہے۔

اس نے جواب دیا کہ اگر ہم صبر سے کام لیں تو وہ مرنے والے کو ہمارے سامنے لا کھڑا کرے گا، زندہ اور بخیریت۔ پھر میں نے مرنے والے کے دوست سے پوچھا کہ آیا ہمارے پاس موجود تفصیلات درست ہیں۔ اس نے مبہم سا جواب دیا، ''گاؤں پہنچ کر پتا چل جائے گا۔''

میرے اعصاب جواب دے گئے۔ میں نے یونٹ میں ممکنہ طور پر پیش آنے والی ہر صورت حال، اور ہر صورت حال میں کیے جانے والے مطلوبہ اقدامات کے بارے میں دریافت کیا تھا؛ لیکن اس بات کا ہرگز میرے وہم و گمان میں بھی نہ ہوا تھا کہ جس شخص کی لاش لے جانے کا کام مجھے سونپا گیا ہے وہ زندہ نکلے گا۔ میں نے ڈرائیور سے دوبارہ گاڑی روکنے کو کہا اور نیچے اتر کر گاڑی کے پچھلے حصے کا دروازہ کھولا۔ سپاہی سے جب میں نے تابوت کو ہلا کر دیکھنے کو کہا تو وہ حیرت میں پڑ گیا، چنانچہ میں نے اسے بتایا کہ میں اس بات کا اطمینان کرنا چاہتا ہوں کہ مرنے والا اس میں موجود ہے۔ تابوت کو ہلا کر — جو بڑی مشکل سے ممکن ہوا — اور اس کی ایک درز میں آنکھ گڑو کر، اس نے مجھے یقین دلایا کہ لاش اب تک اندر موجود ہے اور کسی قدر رجھلاہٹ کے لہجے میں دریافت کیا کہ آیا لاش کے چوری ہو جانے کا بھی کوئی امکان ہے۔ اس سے بات کرنے کو میرا دل نہیں کر رہا تھا، اس لیے میں نے اس سے مرنے والے کا سامان میرے حوالے کرنے کو کہا۔ میں نے ان تمام چیزوں کو ٹٹول کر مرنے والے کا سویلین شناختی کارڈ برآمد کیا اور کسان کو بلا کر گاڑی کی بتیوں کی روشنی میں یہ کارڈ اسے دکھایا۔ وہ کارڈ کو اپنی آنکھوں کے اتنے نزدیک لے گیا کہ مجھے ڈر ہوا کہ کہیں اپنی آنکھ نہ پھوڑ بیٹھے؛ مجھے معلوم ہو رہا

تھا جیسے وہ کارڈ کو اپنے پپوٹے کے اندر گھسا لینا چاہتا ہو۔

''یہ تو مصری کا فوٹو ہے،'' وہ بے چین آواز میں بولا،''عمدہ کے چوکیدار کے بیٹے کا۔''

وہ ان پڑھ تھا اس لیے میں نے کارڈ پر لکھی عبارت اسے پڑھ کر سنائی۔ کارڈ پر لکھا ہوا نام عمدہ کے بیٹے کا تھا۔

کسان نے پوری صورت حال کا خلاصہ پیش کر دیا۔''نام عمدہ کے بیٹے کا ہے اور فوٹو اس کے چوکیدار کے بیٹے کا۔''

اس پر میں پوری طرح بوکھلا گیا۔ میں نے یونٹ واپس جانے کے بارے میں سوچا، لیکن لاش سے اٹھتے تعفن کے باعث یہ ناقابل عمل تھا۔ اور جب کسان نے گاؤں کی روشنیوں کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ ہم بس پہنچا ہی چاہتے ہیں تو میں نے اپنا لائحۂ عمل طے کر لیا۔

ہماری گاڑی گاؤں میں داخل ہوئی اور عمدہ کے دوار کے سامنے پہنچ کر رک گئی؛ پھر ہم سب باہر نکلے اور ایک چھوٹے سے کمرے میں جمع ہو گئے جہاں ایک ٹیلیفون اور کچھ بندوقیں رکھی تھیں۔ مجھے بتایا گیا کہ عمدہ اور اس کا بڑا بیٹا نماز ادا کر رہے ہیں۔ کسان غائب ہو گیا، پھر واپس آیا اور سرگوشی میں مجھے اطلاع دی کہ عمدہ کا سب سے چھوٹا بیٹا گھر میں موجود ہے۔ میں نے اس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو ایک لاڈلا سا دکھائی دینے والا نوعمر لڑکا نمودار ہوا۔ میں نے اس سے اس کا نام اور دوسری تفصیلات پوچھیں راس کے جواب ہو بہو ان تفصیلات کے مطابق تھے جو میرے پاس موجود تھیں۔ لیکن جب میں نے اس سے شناختی کارڈ دکھانے کو کہا تو اس نے بتایا کہ وہ تین مہینے سے اس کے باپ کے پاس ہے اور وہ کارڈ اسے واپس دینے سے متواتر انکار کرتا رہا ہے، نہ معلوم کیوں۔ جہاں تک لازمی فوجی خدمت کے سلسلے میں اس کی کیفیت کا سوال تھا، اس نے مجھے یقین دلایا کہ اسے اس کی تعلیم مکمل ہونے تک کے لیے ملتوی کر دیا گیا ہے۔ جب میں نے اس سے التوا کا سرٹیفکیٹ دکھانے کو کہا تو اس نے کہا کہ وہ اسکول میں ہے؛ اور جب میں نے پوچھا کہ سرٹیفکیٹ اسکول کو کس نے دیا تو اس کا جواب تھا کہ اس کے باپ نے۔

''کیا تم نے التوا کا سرٹیفکیٹ خود دیکھا تھا؟'' مرنے والے کے دوست نے سوال کیا۔

''نہیں، میں نے اس کے بارے میں سنا تھا۔ خیر، سرٹیفکیٹ تو ہوگا ہی، جبھی تو میں بھرتی نہیں ہوا۔''

Scanned with CamScanner

اس موقعے پر عمدہ اندر داخل ہوا اور ہم سے علیک سلیک کرنے لگا۔ اس کے پیچھے پیچھے اس کے بیٹے اور کئی محافظ تھے۔ میں نے کاغذات نکالے اور اپنی بات شروع کی، اور یہ دیکھ کر حیران ہو گیا کہ وہ خبر سن کر چونکا تک نہیں۔ وہ صرف یہ چاہتا تھا کہ میں کاغذات، مرنے والے کی چیزیں اور لاش اس کے حوالے کروں اور اپنے آدمیوں سمیت فوراً وہاں سے چل دوں۔ میں نے اپنے اوپر قابو پایا۔

''کیا مرنے والا واقعی آپ کا بیٹا تھا؟'' میں نے دریافت کیا۔

اس نے میرے سوال کا کوئی سیدھا جواب نہیں دیا۔ مرنے والے کا دوست مجھے باہر لے آیا اور گاڑی کے پاس کھڑے ہو کر اس نے مجھے پورا قصہ سنا دیا۔

''کیا یہ بات تمھیں ہمارے روانہ ہونے سے پہلے معلوم تھی؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''یہ بات میں اس کے مرنے سے بھی پہلے سے جانتا ہوں،'' اس نے جواب دیا۔

میں نے اسے گریبان سے پکڑ لیا اور قریب تھا کہ اسے تھپڑ رسید کروں، لیکن پھر خود کو سنبھال لیا۔ ایک سوال میرے ذہن میں ابھر آیا جس کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا: مرنے والے کے دوست نے قاہرہ سے روانہ ہونے سے پہلے اس تمام پیچیدہ معاملے سے مجھے آگاہ کیوں نہیں کیا؟ کیا اس نے جان بوجھ کر ایسا کیا، یہ سوچ کر کہ واقعات کو اپنے بہاؤ پر چھوڑ کر وہ مرنے والے کے خاندان کے ساتھ بھلائی کر رہا ہے؟ شاید اس کے طرزِ عمل کی وجہ وفاداری رہی ہو۔ شاید اسی لیے اس نے ہمارے ساتھ آنے پر اصرار کیا، حالانکہ لوگ اس قسم کے کام پر بھیجے جانے سے بچتے ہیں۔

مرنے والے کے دوست نے مجھے ٹھنڈا کیا۔ اہم بات یہ ہے، اس نے کہا، کہ اس غیر معمولی صورت حال سے کیسے نمٹا جائے، اور اس نے مجھے عمدہ کی طاقت اور جبر سے خبردار کیا۔ مجھے احساس ہوا کہ مجھے بات کو اور بگڑنے سے بچانا ہو گا: عمدہ اب چوکنا ہو گیا تھا، کسی ایسے شخص کی طرح جو میدان میں اترنے کی تیاری کر رہا ہو۔ تاہم صورت حال اس وقت بدل گئی جب ہڈیالے چہرے والا ایک چوکیدار کندھے پر بندوق لٹکائے اندر داخل ہوا اور ہمارے قریب آ کر روتے ہوئے کہنے لگا، ''شہید کا باپ میں ہوں۔''

عمدہ کا ردِعمل پسپائی کا نہیں بلکہ ڈھیر ہو جانے کا سا تھا۔ یہ سب کچھ گاؤں کے بہت سے باسیوں کے سامنے پیش آ رہا تھا — اب تک تقریباً پورا گاؤں دوار کے باہر جمع ہو چکا تھا۔ عمدہ نے

Scanned with CamScanner

مجھے اپنے گھر میں چلنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی، لیکن میں نے انکار کر دیا؛ پھر اس نے مطالبہ کیا کہ میں گاڑی کو فوراً قبرستان کی طرف چلنے کا حکم دوں، میں نے اس سے بھی انکار کر دیا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ اگر مجمع اکٹھا ہوا تو میں ذمے دار ہوں گا۔ گاؤں میں ڈاکوؤں کی بہت سی ٹولیاں ہیں، اس نے کہا، بہت سے پرانے جھگڑے چکائے جانے کو موجود ہیں اور مصر اس وقت دشوار حالات سے گزر رہا ہے۔ موجودہ خطرناک صورت حال کے نتائج کی ذمے داری وہ نہیں اٹھا سکے گا۔

میں اپنی کپکپاہٹ اور بے چینی کے باوجود کاغذات، مرنے والے کا سامان اور لاش اس کے حوالے کرنے ہی کو تھا کہ مرنے والے کے دوست نے مداخلت کی اور مجھ سے ضلعی پولیس تھانے چلنے کی التجا کی۔ اس پر عمدہ غضب ناک ہو گیا۔ کہنے لگا کہ گاؤں میں وہی حکومت کا نمائندہ ہے اور اگر کوئی مسئلہ درپیش ہے تو اس سے نمٹنا اسی کا کام ہے۔ جب تک ہم اس کے زیر انتظام گاؤں میں موجود ہیں، اس کی ہدایت کے بغیر ہمیں پولیس کے پاس جانے کا اختیار نہیں۔

میرے پاس تین صورتیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ میں ضلعی پولیس تھانے جا کر، جس کی حدود میں یہ گاؤں پڑتا تھا، ضروری اقدام کرتا۔ لیکن میرے مسئلے کا ایک فوجی پہلو بھی تھا: ہمیں دی گئی ہدایات میں لکھا تھا کہ ہمیں فوجی پولیس کی قریب ترین چوکی تلاش کرنی چاہیے جو اس سلسلے میں کارروائی کرے گی — لیکن اس وقت گھپ اندھیرے میں میں فوجی پولیس چوکی کیسے تلاش کر سکتا تھا؟ یا پھر میں قاہرہ واپس جا کر کمانڈانٹ کو پوری صورت حال سے آگاہ کر سکتا تھا جو اس پر مناسب ایکشن لیتا۔ میری قطعی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کروں۔

اس سوال کا فیصلہ گاؤں والوں کے ہاتھوں اس وقت ہو گیا جب میں عمدہ سے بات کر رہا تھا۔ چوکیدار باہر چلا گیا تھا اور گاؤں والے جمع ہو گئے تھے — غالباً جو کچھ اس نے ان لوگوں سے کہا تھا اس کے زیر اثر وہ دوار کی سمت بڑھے چلے آئے تھے۔ عمدہ کا خون پی جانے کی خواہش، انتقام، زمین، عزت، زرعی اصلاحات کی منسوخی، اور اس تمام واقعے کی اطلاع پولیس کو دینے کی ضرورت کی بابت کچھ باتیں میرے کانوں میں پڑیں۔ کوئی شخص عمدہ کے پاس آیا اور اس سے فوری اقدام کرنے کو کہا، لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کر پاتا، میں نے اقدام کیا۔ میں اپنے آدمیوں کو لے کر بندوقوں والے کمرے سے نکل آیا اور لوگوں کے سمندر میں سے راستہ بناتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ مجھے تعجب ہو رہا تھا کہ اتنے سارے

Scanned with CamScanner

لوگ وہاں کیونکر جمع ہو گئے؛ مجھے کچھ اندازہ نہ تھا کہ اتنا بڑا ہجوم کہاں سے آ کر اکٹھا ہوا ہوگا۔

گاڑی تک پہنچنا دشوار ہو رہا تھا اور ہجوم میں زور لگا کر آگے بڑھتے ہوئے مجھے باتوں کے ٹکڑے سنائی دے رہے تھے۔ گاؤں والے مجھ سے ضلعی پولیس تھانے جا کر اطلاع دینے اور عمدہ کے آدمیوں کے مجھ پر حملہ آور ہونے سے پہلے کوئی قدم اٹھانے کو کہہ رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ مقدمہ آسانی سے ثابت ہو سکتا ہے؛ ساری شہادتیں موجود ہیں اور عمدہ نے پہلی بار خود کو قانونی شکنجے میں پھنسا لیا ہے۔ اگر میں نے لاش کو ہاتھ سے جانے دیا تو خود ذمے دار ہوں گا۔ جس وقت میں گاڑی میں داخل ہونے کے لیے زور لگا رہا تھا، ایک آدمی میرے قریب آیا اور مجھ سے کہنے لگا کہ ان لوگوں کو ابھی ابھی معلوم ہوا کہ عمدہ نے اپنے بیٹے کی جگہ رات کے چوکیدار کے بیٹے کو فوج میں بھرتی کروا دیا تھا۔ اس نے کہا کہ اس معاملے کو سامنے لانا انتہائی ضروری ہے۔

''ہم کب تک اس قسم کی چیزوں کو برداشت کرتے رہیں گے؟'' اس نے سوال کیا۔ وہ کسی حد تک تعلیم یافتہ معلوم ہوتا تھا۔ ''جنگ تک میں!'' وہ کہتا رہا۔ ''ہم چپ بیٹھے دیکھتے رہے اور ان لوگوں نے مصر کی ہر چیز کو بدعنوانی سے گندا کر ڈالا: زمین، پانی، ہوا، انسان، ہر چیز۔ اور کہتے ہیں کہ مصر کی سرزمین کی عزت کا دفاع کر رہے ہیں! ایسا نہیں ہو سکتا!''

اس شخص کے الفاظ نے مجھے احساس دلایا کہ جو کچھ پیش آیا ہے وہ باضابطہ جرم ہے، اور مجھے یوں لگا جیسے میرے ہاتھ اس لاش کے خون سے رنگے ہوئے ہیں جو تابوت میں رکھی ہے۔ مجھے قدم اٹھانا ہی ہوگا۔ یہ ایک منفرد، نادر قسم کی مجرمانہ واردات ہوئی تھی —— ڈاکے، قتل، بلکہ سرکاری دستاویزات میں جعل سازی تک سے مختلف۔ یہ ایک ایسا جرم تھا جس کے لیے کوئی نام بھی اب تک وضع نہیں کیا گیا تھا، کیونکہ اس طرح کے جرم کا ارتکاب اس سے پہلے کیا ہی نہیں گیا تھا، نہ مصر میں اور نہ کہیں اور۔ فوری اقدام انتہائی ضروری تھا، کیونکہ جب تک عمدہ جیسے لوگ موجود ہیں، کون ضمانت دے سکتا ہے کہ یہ جرم دہرایا نہیں جائے گا؟ اور اگر اس جرم کا دوبارہ ارتکاب کیا گیا تو پھر مستقبل میں مصر کا دفاع کرنے والا کون ہوگا؟

عمدہ کے آدمی باہر نکل آئے اور مجھے ان کی بندوقیں اور لاٹھیاں صاف دکھائی دینے لگیں، لیکن لوگوں کے سمندر نے انھیں مجھ تک پہنچنے سے روک دیا۔ مرنے والے کا دوست اس کے باپ

Scanned with CamScanner

کے ساتھ آ پہنچا۔ مجھے نہیں معلوم ہم تینوں ڈرائیور کے برابر والی سیٹ میں کس طرح سما گئے۔ باپ کا بے آواز رونا مسلسل جاری رہا، یہاں تک کہ مرنے والے کے دوست نے اسے بتایا کہ ہم اس کے ساتھ ہیں اور اسے تنہا نہیں چھوڑیں گے۔ اسے اس کا حق مل کر رہے گا— یہ ہم دونوں کا اس سے وعدہ ہے، مرنے والے کا دوست بولا۔ اس پر اس بوڑھے آدمی کو کچھ تسکین ہوئی، اگرچہ اس کے بعد بھی مجھے آنسوؤں کے بہنے سے بننے والے دو چمکدار راستے دکھائی دیتے رہے جو اس کے ہڈیالے چہرے کی جھریوں اور گڑھوں میں سے گزر رہے تھے۔

اِدھر میں نے چلّا کر ڈرائیور کو گاڑی چلانے کا حکم دیا، اُدھر لوگوں کا سمندر جیسے کسی معجزے کے زیرِ اثر شق ہو کر ہماری گاڑی کو راستہ دیتا چلا گیا۔ ان میں سے کئی ایک کود کر گاڑی کے پائیدانوں اور سامنے والے بونٹ پر چڑھ گئے جس سے ڈرائیور کے سڑک کو دیکھنے کے لیے بہت ذرا سی جگہ باقی رہ گئی۔ انجن کے اسٹارٹ ہونے سے پہلے لوگوں نے اپنے سینوں سے گاڑی کو دھکا لگا کر متحرک کر دیا۔ بندوق چلنے کی آوازیں سنائی دیں لیکن میں نہیں کہہ سکتا کہ ان کا نشانہ ہماری گاڑی تھی یا یہ محض لوگوں کو خوفزدہ کرنے کے مقصد سے چلائی گئی تھیں۔ ہم ضلعی پولیس تھانے کی طرف روانہ ہو گئے۔

وہاں پہنچ کر مجھے پتا چلا کہ ڈیوٹی پر موجود افسر میرا ہم عمر نوجوان ہے جس کے کندھوں پر دو دو ستارے لگے ہوئے ہیں؛ میری طرح وہ بھی قاہرہ کا رہنے والا تھا، اگرچہ شہر کے ایک مختلف علاقے کا۔ میں نے اسے مختصراً صورت حال سے آگاہ کیا اور تحقیقات شروع کرنے کی درخواست کی۔ میں نہایت تھک چکا تھا اور صورت حال کا تمام جوش میرے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا۔ اس نے میرے لیے چائے منگوائی اور ہم اس کے انتظار میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ وہ معاملے کی تفصیلات سے واقفیت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ چونکہ یہ ایک سنگین معاملہ تھا اس لیے اس نے مجھ سے ضلعی پولیس کے مامور سے مشورہ کرنے کی اجازت مانگی، جس نے اسے ضلعے کے سرکاری تفتیش کار کو بلوانے کا حکم دیا۔ وہ سب لوگ آ گئے اور اپنے کاغذ قلم نکال کر تیار ہو بیٹھے۔

میں نے کسی کی آواز سنی: ''سوال: تمھیں اس معاملے کے بارے میں کیا کہنا ہے؟'' اور میں نے اپنے جواب کا آغاز کیا۔

۶
تفتیش کار

نصف شب کا وقت مجھے بہت مسحور کرتا ہے۔ میں اسے دو دنوں کو جدا کرنے والی لکیر سمجھتا ہوں؛ ایک وہ جو ختم ہو چکا اور دوسرا وہ جس کے بارے میں ابھی ہم اس کے نام کے سوا کچھ نہیں جانتے۔ قریب کے کسی ریڈیو پر سنائی دینے والی بارہ یکساں آوازیں، رات میں آنے والے جاڑوں کا ہلکا سا اشارہ، رمضان کے آخری دنوں میں دیہات میں گزرنے والی ایک رات۔ کل رات اور اس سے پچھلی رات گزری اور لوگوں نے لیلۃ القدر کا سراغ نہ پایا۔ اب ایک رات اور باقی رہ گئی ہے۔ اس کے بعد شاید عید آ جائے گی اور لوگوں کو اپنے خواب اگلے برس کے لیے ملتوی کر دینے پڑیں گے۔

نصف شب ہوتے ہی میں بستر پر جانے کے لیے تیار ہو جاتا ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ نیند کب آئے گی اور کب مجھے اس سلگتی ہوئی بیداری سے نجات ملے گی، لیکن بہر حال کسی نہ کسی وقت تو میری آنکھ لگ ہی جائے گی۔

آج ضلعی انتظامیہ کا ایک آدمی آیا تھا (دروازے پر تو ہر شام کو ہی دستک ہوتی ہے)۔ وہ ایک ایسے معاملے کے سلسلے میں طلبی کا سرکاری پروانہ لایا تھا جسے بہت اہم بلکہ سنگین قرار دیا گیا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ کون سا معاملہ ایسا ہوتا ہے جو اہم اور سنگین نہ ہو۔

میں نے پیغام لانے والے سے پوچھا کہ آیا ضلعی پولیس تھانے کے ڈیوٹی افسر نے معاملے کی ابتدائی چھان بین کر لی ہے۔ نہیں، اس نے جواب دیا۔ اس نے صرف زبانی معلومات حاصل کیں اور پھر مامور سے رابطہ قائم کیا جس نے آتے ہی میری طلبی کا حکم دیا۔ اس نے ضلعی انتظامیہ میں محافظہ یعنی فوجی صلاح کار کے دفتر کو بھی اطلاع بھجوادی۔

Scanned with CamScanner

''آخر واردات کیا ہے؟ قتل، چوری، حملہ یا بلوا؟'' میں نے تیار ہوتے ہوئے پیغام رساں سے سوال کیا۔

اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا کہ اسے کچھ نہیں معلوم یہ کس قسم کا معاملہ ہے؛ وہ صرف اتنا جانتا ہے کہ کوئی گھنٹہ بھر پہلے ایک فوجی تابوت گاڑی محاذِ جنگ پر کام آنے والے ایک سپاہی کی لاش لے کر ضلعی پولیس تھانے پہنچی تھی۔ گاڑی کے ساتھ ایک افسر تھا اور چند سپاہی جو اسی ضلعے کے ایک گاؤں کے رہنے والے تھے۔ میں جلدی جلدی تیار ہوا اور اس کے ساتھ باہر سڑک پر نکل آیا۔ میرا گھر ڈیلٹا کے علاقے کے ایک چھوٹے سے ضلعی قصبے میں ہے جہاں لوگ دس بجے رات کو سو جاتے ہیں، اگرچہ آج کل رمضان کی وجہ سے وہ رات بھر جاگتے ہیں۔ ضلعی پولیس تھانے میں میں نے ڈیوٹی افسر، ماموراور انٹیلی جنس افسر کو موجود پایا، اور جیسا کہ قاعدہ ہے، میں ڈیوٹی افسر کے برابر میں بیٹھ گیا اور اس سے دریافت کیا کہ کیا معاملہ ہے۔

نوجوان پولیس افسر اتنے جوش اور اضطراب کی کیفیت میں تھا کہ بولتا ہی چلا گیا۔ ہم لوگوں کے برخلاف اس کے لیے کہانی میں کوئی الگ باب مخصوص نہیں کیا گیا، اس لیے میں نے اس سے جو کچھ سنا وہ آپ کو حرف بہ حرف سنا دیتا ہوں، بشمول ان باتوں کے جن کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

نوجوان پولیس افسر اپنی کرسی میں پیچھے کو ہو بیٹھا اور کہنے لگا: ''میں ڈیوٹی افسر ہوں اور آج شام میرے پاس کرنے کو کچھ نہ تھا؛ رمضان میں افطار کے بعد عموماً کرنے کو کچھ نہیں ہوتا۔ عشا کی اذان کے بعد میں محرر کے کمرے کی کھڑکی کے پاس شیشے سے ناک لگائے کھڑا تھا اور میرے سانس کی بھاپ شیشے کو گدلا کر رہی تھی۔ میں کھڑکی کے شیشے پر اپنی انگلی سے لکیریں بنا رہا تھا جب میں نے ایک سیاہ گاڑی کو سست رفتار سے تھانے کی طرف بڑھتے دیکھا۔ جب وہ کھمبے کی بتی کے نیچے پہنچی تو مجھے اس کے خطوط صاف دکھائی دینے لگے؛ اس کے بعد وہ روشنی کے اس قطعے سے نکل کر رات کے اندھیرے میں اوجھل ہو گئی۔ تھانے کے سامنے پہنچ کر گاڑی آہستہ ہوتی ہوئی سامنے والے چوکور احاطے میں آ کر رک گئی۔ میں نے دیکھا کہ اس کی سامنے والی پلیٹ ریت کے رنگ کی تھی اور اس پر کالے حروف میں گاڑی کا نمبر اور نیچے 'الجیش' (فوج) کا لفظ لکھا ہوا تھا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ اس کا کچھ نہ کچھ تعلق جنگ سے ہو سکتا ہے۔

Scanned with CamScanner

''میں کمرے سے نکل کر تھانے کے دروازے پر جا کھڑا ہوا۔ گاڑی کا دروازہ کھلا اور ایک بالکل نوجوان افسر، ایک فرسٹ لیفٹیننٹ باہر نکلا۔ اس کے پیچھے پیچھے جنگی وردی میں ملبوس ایک سپاہی اور ایک معمر فلاح نیچے اترے۔ پھر گاڑی کا پچھلا دروازہ کھلا اور دو سپاہی اور ایک سویلین باہر آئے۔ سب کے سب بہت دور کا سفر طے کر کے آئے ہوئے لگتے تھے۔ آخرکار میرے پاس کام آ گیا تھا جس سے میں رات کے طویل، خالی گھنٹوں کو پُر کر سکتا تھا۔ سردی کے باوجود مجھے ان سب آدمیوں کے چہروں پر پسینے کے قطرے دکھائی دے رہے تھے۔

''میں نے فوجی افسر کا گرمجوشی سے خیر مقدم کیا اور اس کے اور اس کے ساتھیوں کے لیے کرسیاں نکالیں؛ پھر، جب وہ میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا تو میں نے پوچھا کہ میں اس کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔

''کچھ دیر تک وہ کچھ نہ بولا، اور جب بولا تو میں جان گیا کہ میرا واسطہ ایک ایسے مسئلے سے آ پڑا ہے جو اس سے پہلے کبھی پیش نہیں آیا تھا۔ اس معاملے میں جو عمدہ ملوث ہے اس سے پورے علاقے میں لوگ خوف کھاتے ہیں۔ اس انوکھی صورت حال کے روبرو آ کر میری سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرنا چاہیے: میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ مامور کا مکان تھانے کے قریب ہی ہے، قریب کیا بالکل سامنے ہی، اور اس وقت وہ گھر پر موجود بھی تھے۔ اس لیے میں نے ان سے مشورہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

''میں نے مامور کو اپنے بڑے بیٹے کے ساتھ شطرنج کھیلتے ہوئے پایا۔ کمرہ اکتوبر کی سردی کے لحاظ سے خوب گرم کیا ہوا تھا۔ میں نے اپنے آنے کی اطلاع پہنچوائی اور اس بے وقت مداخلت پر معذرت کرنے کے بعد پورا قصہ سنایا۔ پہلے تو یہ بات سن کر ان کا مزاج بہت برہم ہوا، پھر انھوں نے خود کو سنبھال لیا اور مجھے اس سلسلے میں قانونی اقدامات کرنے کا اختیار دے دیا اور وعدہ کیا کہ کچھ دیر بعد وہ خود تھانے پہنچ جائیں گے۔ میں نے مرنے والے کے سامان کو سربمہر کروایا اور آپ کو بلوانے کے لیے آدمی بھیجا؛ جب آپ آئے اس وقت تک مامور بھی تھانے پہنچ چکے تھے۔''

اس کے بعد میں نے اپنی تفتیش کا آغاز کیا۔ فوجی افسر کو بلوایا گیا اور اس نے معاملے کا خلاصہ بیان کیا: وہ قاہرہ سے جنگ میں کام آنے والے ایک سپاہی کی لاش اس کے گھر والوں کے سپرد کرنے کی غرض سے لے کر آیا تھا کہ اس پر انکشاف ہوا کہ جو مرنے والے کا نام ہے اس نام کا آدمی زندہ اور

بخیریت موجود ہے، جبکہ اس کی تحویل میں جو لاش ہے وہ کسی اور آدمی کی ہے جو اس نام کے آدمی کی جگہ فوج میں بھرتی ہوا تھا۔ افسر بہت تھکا ہوا تھا اور اس کے چہرے پر تھکن اور پسینے کی لکیریں تھیں۔ مجھے اس کی سنائی ہوئی کہانی کے بارے میں شکوک تھے، لیکن ساتھ ہی مجھے اس کے لہجے کے پوری طرح پُریقین ہونے کا بھی احساس تھا۔ میں نے اس سے تفصیلی سوالات پوچھے۔ پھر میں نے ان لوگوں کے ناموں کا جائزہ لیا جو اس کے ساتھ آئے تھے۔

میں نے مرنے والے کے دوست سے آغاز کیا۔ میرے سامنے بیٹھ کر اس نے مجھے پوری کہانی سنائی جسے سنتے ہوئے میں حیرت اور بے یقینی کے درمیان ڈولتا رہا۔ میں نے اس سے دریافت کیا کہ آیا اس کے پاس مرنے والے کے ایسے کوئی کاغذات ہیں جن کا تعلق اس وقت سے ہو جب وہ چوکیدار کے بیٹے سے عمدہ کا بیٹا نہیں بنا تھا۔ اس کا پرانا شناختی کارڈ یا اس کا طالب علمی کا کارڈ؟

اس نے مرنے والے کے سامان کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی جو میں نے اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے فوجی شناختی کارڈ نکالا اور اسے پھاڑ کر کھول لیا۔ اس کے اندر ایک کاغذ احتیاط سے تہہ کیا ہوا رکھا تھا جسے اس نے باہر نکالا اور میرے سامنے پھیلا کر رکھ دیا۔ یہ ابتدائی اسکول کا سرٹیفکیٹ تھا۔ مرنے والے کے دوست نے سرٹیفکیٹ اور شناختی کارڈ ساتھ ساتھ رکھ دیے، اور وہ بالکل ایک سکے کے دورخ دکھائی دینے لگے جن میں معلوم اور نامعلوم کے درمیان کا ازلی وابدی تضاد صاف جھلک رہا تھا۔ شناختی کارڈ جسے ہم سب دیکھ چکے تھے عمدہ کے بیٹے کا شناختی کارڈ ہونے کا دعویٰ رکھتا تھا جو مفروضہ طور پر فوج میں سپاہی تھا؛ اس کے برابر میں رکھی ہوئی دستاویز بتاتی تھی کہ فوج میں عمدہ کے بیٹے کے طور پر جانے والا شخص چوکیدار کا بیٹا تھا۔ اس قسم کے فرائض کی انجام دہی میں اپنی عیوضی میں کسی کو بھیجنا کبھی قانونی طور پر قابل قبول نہیں ہوسکتا، خواہ اس کی منظوری کسی بھی درجے کے اہلکار نے دی ہو۔

میرے ہاتھ میں اب ایک دھاگے کا سرا آ گیا تھا جو حقیقت تک پہنچنے میں میری رہنمائی کرسکتا تھا۔ اسکول کے سرٹیفکیٹ میں مصری کے شناختی کارڈ کا نمبر اور اجرا کی تاریخ درج تھی۔ میں نے اس نمبر کو اس شناختی کارڈ کے نمبر سے ملا کر دیکھا جس پر اس کی تصویر اور عمدہ کے بیٹے کا نام تھا؛ اس کا نمبر اور اجرا کی تاریخ مختلف تھی، اگرچہ دونوں ضلعی انتظامیہ کے ایک ہی شعبے، یعنی سول رجسٹری دفتر، کے جاری کیے ہوئے تھے۔ میں الجھن میں پڑ گیا۔ کیا اسے دو شناختی کارڈ جاری کیے گئے تھے؟ مجھے اقرار

Scanned with CamScanner

ہے کہ اس چھوٹے سے نکتے نے مجھے سچ کی پردہ دری کرنے کی تحریک دی۔ میرے تمام حواس بیدار ہو گئے اور دل زور زور سے دھڑکنے اور خون کو تیز رفتار سے میری رگوں میں دوڑانے لگا۔ میں نے اپنا کوٹ اتار کر ٹانگ دیا۔ اب تک میں نیم دلی سے کام کرتا رہا تھا، کیونکہ معاملہ میرے ذہن میں واضح نہیں ہوا تھا۔

اب میں نے ایک سادہ کاغذ لیا اور اس پر ان افراد کے ناموں کی فہرست بنائی جن سے مجھے پوچھ گچھ کرنی تھی:

۱۔ مصری کا باپ، سابق چوکیدار، اب پنشن یافتہ۔

۲۔ گاؤں کا عمدہ۔

۳۔ عمدہ کا سب سے چھوٹا بیٹا، جس کا نام مرنے والے نے اختیار کر رکھا تھا۔

۴۔ ضلعی انتظامیہ کا بھرتی افسر جو مرنے والے کی بھرتی کے وقت شعبے کا انچارج تھا۔

ایک اور کاغذ پر میں نے ان دستاویزات کی فہرست بنائی جو تفتیش کے سلسلے میں درکار تھیں:

۱۔ ضلعی انتظامیہ کے سول رجسٹری دفتر میں محفوظ رکھے جانے والے فارم جن کی بنیاد پر دو شناختی کارڈ جاری کیے گئے۔ ان کے علاوہ اس دفتر کی فائل میں موجود فوٹو گراف۔

۲۔ مرنے والے اور عمدہ کے بیٹے کے پیدائش کے سرٹیفکیٹ (فوٹو کاپی)۔

۳۔ ان دونوں نوجوانوں کی لازمی فوجی خدمت کے سلسلے میں تفصیلی بیان، مع تمام متعلقہ کاغذات اور دستاویزات کے، خواہ وہ اہم ہوں یا غیر اہم۔

۴۔ دونوں نوجوانوں کی تعلیمی کامیابیوں کا تفصیلی بیان؛ اور اگر ان میں سے کوئی اب تک زیر تعلیم ہے تو تعلیم کی متعلقہ سطح کی تفصیل۔

۵۔ معاملے کی تفصیلی تفتیش کی رپورٹ جسے پولیس تھانے کے انٹیلی جنس افسر نے حقیقت تک پہنچنے کے مقصد سے انجام دیا ہو۔

میں نے اپنی تفتیش کا آغاز کیا۔ کچھ دیر بعد ضلعی پولیس تھانے کا مامور مجھ سے ملنے آیا۔ اس نے مجھ سے محافظہ سے آنے والے فوجی صلاح کار کا انتظار کرنے کو کہا۔ میں نے اس سے دریافت کیا کہ فوجی صلاح کار کا اس معاملے سے کیا تعلق ہے، تو اس نے کہا کہ اس معاملے کا ایک فوجی پہلو ہے،

Scanned with CamScanner

اور شاید سیاسی پہلو بھی، اس لیے فوجی صلاح کار کی رائے جاننا ضروری ہے۔ میں نے اس کو بتایا کہ یہ معاملہ بالکل صاف ہے: میں اپنی تفتیش جاری رکھوں گا اور جب فوجی صلاح کار آئے گا تو وہ اس وقت تک کی تفتیش کا جائزہ لے کر فیصلہ کر سکتا ہے کہ اس میں اس کے کرنے کے لیے کچھ ہے یا نہیں۔ میں نے اپنی تفتیش پھر شروع کی، لیکن ماموراک بار پھر میرے پاس آیا اور اس بار اس نے مجھے لاش کے سلسلے میں ضوابط کی یاد دہانی کرائی: یا تو مجھے لاش کی تدفین کی اجازت دینی چاہیے یا پھر لیبارٹری کے پیتھولوجسٹ کو ان اقدامات کے سلسلے میں ہدایات جاری کرنی چاہئیں جو تفتیش کے سلسلے میں درکار ہیں۔ اس پر مجھے احساس ہوا کہ میں لاش کو تو بالکل ہی بھول گیا تھا جس پر سب سے پہلے توجہ دینی چاہیے تھی۔ چنانچہ میں نے اس فوجی افسر کو طلب کیا جو لاش لے کر آیا تھا۔

میں نے ان دستاویزات کا جائزہ لیا جن میں محاذِ جنگ پر واقع ہونے والی موت کی تفصیلات بیان کی گئی تھیں۔ اس جائزے میں میں نے پوری توجہ اور خاصا وقت صرف کیا۔ میرے پاس اس کا جواز موجود تھا کیونکہ اس معاملے نے اتنے سارے سوالوں کو جنم دیا تھا کہ مجھے اس بات پر بھی شبہ ہونے لگا تھا کہ میرے ہاتھ میں پانچ انگلیاں ہیں، کہ ہر انگلی میں ایک ناخن ہے، اور یہ کہ آسمان زمین کے اوپر تنا ہوا ہے۔

میں نے لاش پر بھی سرسری نظر ڈالی اور اس کے چہرے کی کچھ تصویریں اتروائیں۔ اس کے بعد میں نے تدفین کی اجازت دے دی۔ تصویروں کی بہت اہمیت ہوتی ہے؛ تفتیش کے سلسلے میں یہ بہت سے سوالات کا جواب دے سکتی ہیں۔ لیکن ایک مسئلہ تھا۔ لاش کو دفن کیسے کیا جائے جبکہ پورا گاؤں جانتا ہے کہ کیا ہوا ہے؟ اس بات کو کیونکر یقینی بنایا جا سکتا تھا کہ کوئی ہنگامہ نہیں ہوگا؟

مجھے اس بات پر تعجب ہوا جب مامور نے تدفین سے پہلے فوجی صلاح کار اور فوجی پولیس کے نمائندے کا انتظار کرنے اور سیاسی حکام سے مشورہ کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس نے کہا کہ وہ چاہتا ہے کہ لاش کو اتنی دیر گاڑی میں پڑا رہنے دینے کے بجائے ضلعی اسپتال پہنچوا دیا جائے۔ میں اس بات پر راضی ہو گیا، یہ سوچ کر کہ میں ایک شہید کی لاش کو عزت دے رہا ہوں جس نے میرے ملک اور میرے خاندان کی اور خود میری حفاظت کی خاطر اپنی جان قربان کر دی۔ بدقسمتی سے یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ میں نے سخت غلطی کی — لیکن یہ دوسری کہانی ہے۔

Scanned with CamScanner

اب میں نے گواہوں کو پوچھ گچھ کے لیے طلب کرنا شروع کیا۔ میں ان کے بیانات کا خلاصہ بیان نہیں کروں گا کیونکہ آپ ان میں سے بیشتر باتیں پہلے ہی سن چکے ہیں۔

کچھ گواہوں نے فوراً ہی حقیقت حال بتا دی۔ جو کچھ مرنے والے کے حقیقی باپ نے، آنسوؤں کے درمیان، کہا وہ نہایت اثر انگیز تھا اور ہم سب کو اس کی حالت پر رنج محسوس ہوا۔ تاہم عمدہ نے اعتراف نہیں کیا اور میں اس سے اس معاملے میں اس کے ملوث ہونے کے بارے میں ایک لفظ بھی نہ اگلوا سکا۔ میں نے چوکیدار کو اس کے سامنے کیا، اپنے پاس موجود کاغذات اسے دکھائے، اسے یاد دلایا کہ اسے اس کی زمین لوٹا دی گئی ہے اور اس زمین میں وہ قطعہ بھی شامل ہے جس پر چوکیدار کھیتی کرتا تھا۔ اس نے جواب دیا کہ اس کا موجودہ معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بعض موقعوں پر اسے کوئی جواب نہ سوجھتا، لیکن تب بھی وہ ٹس سے مس نہ ہوا اور نہ اس کی آنکھوں میں کسی طرح کے پچھتاوے کی جھلک دکھائی دی۔ اس کی آواز پرسکون تھی، اس میں گوشت اور چربی، مرغی اور بطخ کی مہک تھی۔ اس کے چہرے اور ہاتھوں پر گوشت کی تہیں تھیں۔

میں نے اس سے اس کے بیٹے کی لازمی فوجی خدمت کے بارے میں سوال کیا تو اس نے جواب دیا کہ اسے اس کی تعلیم مکمل ہونے تک کے لیے ملتوی کر دیا گیا ہے۔ جب میں نے اس کی شہادت طلب کی تو اس نے کہا کہ مذکورہ سرٹیفکیٹ اسکول کے حوالے کر دیا گیا تھا اور وہ فوری طور پر اسے حاصل نہیں کر سکتا۔ یہ سرٹیفکیٹ کہاں سے جاری ہوا تھا، میں نے پوچھا۔ اس پر وہ پہلی بار لاجواب ہوا، لیکن آخرکار بولا کہ اسے اسکندریہ سے حاصل کیا گیا تھا۔ میں نے اسے وہ فوجی شناختی کارڈ دکھایا جس کی رو سے اس کا بیٹا اس وقت فوج میں بھرتی ہو چکا ہے۔ اس پر وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑایا لیکن کوئی واضح جواب نہ دیا۔

عمدہ سے پوچھ گچھ کرنا خاصا تھکا دینے والا کام ثابت ہوا؛ ہم دونوں متواتر دائروں میں گھومتے رہے۔ کئی بار میں نے اسے گھیر لیا اور اپنی دانست میں اسے اعتراف کے بالکل نزدیک لے آیا، لیکن اس نے اعتراف کر کے نہ دیا۔ میں سوچنے لگا کہ اسے کس بات کا انتظار ہے۔ وہ اعتراف کر کے خود کو اور مجھے اس اذیت ناک سوال و جواب سے نجات کیوں نہیں دلا دیتا؟ وہ یقیناً اس ذلت آمیز مصیبت سے نکل آنے کے لیے کسی رخنے کی تاک میں تھا۔ اس معاملے نے مجھے سخت اضطراب میں

Scanned with CamScanner

مبتلا کر دیا تھا لیکن معلوم ہوتا تھا کہ اس کے لیے یہ ایسا ہی ہے جیسا کوئی روزمرہ کا معاملہ۔

تفتیش کے دوران ایک سوال مجھے متواتر پریشان کرتا رہا: وہ منصوبہ ساز کون تھا جس نے اس پورے منصوبے کو اس کی نازک تفصیلات سمیت تیار کیا تھا؟ اس نے کچھ نقائص یقیناً چھوڑ دیے تھے، لیکن یہ معمولی نقائص تھے جن سے عام حالات میں منصوبے کا راز کھلنے کا کوئی اندیشہ نہ ہو سکتا تھا۔ آخرکار مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ کون تھا: یہ وہ شخص تھا جسے 'متعہد' یا 'دلال' کہا جاتا تھا۔ کئی گواہوں نے اپنے بیانات میں برسبیلِ تذکرہ اس کا نام لیا تھا اور مجھے یہ خیال ہوا تھا کہ 'متعہد' غالباً اس کا خاندانی نام ہے۔ بعد میں اسے میرے پاس لایا گیا۔ وہ کسی ایسے آدمی کی مانند تھا جو ہر امید سے دستبردار ہو چکا ہو، اور اس نے مجھے کسی مشکل میں نہیں ڈالا۔ اس نے جو کچھ کیا تھا اس کا پورا پورا اعتراف کر لیا لیکن مجھے کئی بار، نہایت خلوص کے ساتھ یقین دلایا کہ یہ اس کا کیا ہوا اس قسم کا آخری کام تھا اور اب وہ اپنی زندگی کا ایک نیا ورق الٹنے والا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ دلال کے دفاعی بیان کو پوری تفصیل کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کروں، لیکن اس کا وقت نہیں ہے اور مجھے اختصار سے کام لینا ہوگا۔

اس نے بتایا کہ اسے اس بات پر تعجب ہے کہ تفتیش آخر ہو کیونکر رہی ہے۔ ''ایک دلیر، شریفانہ جذبہ رکھنے والا مصری باشندہ،'' وہ بولا، ''اپنے ایک ہم وطن پر احسان کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ کیا آپ نے گلی کوچوں میں لوگوں کو ایک دوسرے سے یہ کہتے نہیں سنا کہ میں تمھارے لیے اپنی جان قربان کر دوں گا؟ کیا خود ریاست، سرکاری ذرائع ابلاغ کی مدد سے، ہمیں اس بات پر آمادہ نہیں کرتی کہ ہم اپنے ہم وطنوں اور ہم مذہبوں کے لیے اپنی جان قربان کر دیں؟ اور اگر ہم رضاکارانہ طور پر اس کے لیے آمادہ نہ ہوں تو کیا ریاست رقم ادا کر کے ہماری جانیں خرید نہیں لیتی؟ اس معاملے میں بھی تو یہی ہوا ہے۔ چوکیدار کے بیٹے نے عمدہ کے بیٹے کے عیوضی کے طور پر حب الوطنی کا فرض ادا کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ کام اس نے اپنی مرضی سے کیا ہوگا، جبھی تو اس نے کسی مرحلے پر اعتراض نہیں کیا۔ اگر اس کی مرضی نہ ہوتی تو کوئی اسے مجبور تو کر نہیں سکتا تھا۔

''میں ایک اور نکتہ بھی اٹھانا چاہتا ہوں کیونکہ عمدہ نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔ (وہ ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور اپنے گن گانے کا قائل نہیں۔) یہ پورا معاملہ مفادات کے باہمی تبادلے پر مبنی تھا — دراصل یہ ایک اقتصادی لین دین کا معاملہ تھا۔ مصری عمدہ کے بیٹے کی جگہ فوج میں بھرتی

Scanned with CamScanner

ہوا، اور اس کے بدلے میں چوکیدار نے دو چیزیں حاصل کیں۔ ایک تو اسے ایک طے شدہ تنخواہ والی مستقل ملازمت حاصل ہوئی، حالانکہ اسے اپنی سابقہ ملازمت سے پنشن بھی مل رہی تھی۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں، قانون پنشن یافتہ شخص کے تنخواہ لینے کی قطعی ممانعت کرتا ہے ـــ یہ جرم ہے۔ اس معاملے میں عمدہ نے، چوکیدار کے ساتھ حسن سلوک کرتے ہوئے، ایک ایسے شخص کی پردہ پوشی کی ہے جس نے قانون کی خلاف ورزی کی، اور یوں اپنے خلاف تعزیراتِ مصر کے تحت کارروائی کا خطرہ مول لیا؛ اور یہ مت بھولیے کہ عمدہ کے طور پر وہی اس بات کا ذمے دار ہے کہ قانون پر عملدرآمد کو یقینی بنائے، چنانچہ اس کا جرم اور بھی سنگین ٹھہرتا ہے۔

''دوم، چوکیدار نے زرعی زمین کا ایک قطعہ حاصل کیا جس کا رقبہ پانچ فدان سے کم نہ ہوگا۔ مصر میں حال ہی میں جو منصفانہ فیصلہ کیا گیا ہے اس کے تحت یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ زرعی اصلاحات کے محکمے کی طرف سے جو زمین ضبط کی گئی تھی وہ اس کے مالکوں کو لوٹائی جانی ہے۔ اسی فیصلے کے تحت عمدہ کو اس کی زمین واپس مل گئی اور اسے پورا حق حاصل ہے کہ اسے اپنے فائدے کے لیے استعمال کر کے نئے احکامات کے مبنی بر انصاف ہونے اور اس سے پہلے کے اقدام کے غیر منصفانہ ہونے کی تصدیق کرے۔ ذرا اندازہ کیجیے کہ برسوں تک اپنی زمین سے زبردستی اور غیر منصفانہ طور پر محروم رکھے جانے کے بعد اس کا قبضہ واپس ملنے پر عمدہ کی مسرت کا کیا عالم ہوگا! لیکن عمدہ نے اپنے مسرت کے جذبات کو دبا کر، اپنی آزادانہ مرضی سے، چوکیدار کو زمین کا قطعہ اپنے استعمال میں رکھنے کی اجازت دے دی ـــ یہ اس کا ایسا قدم ہے جو حالیہ سرکاری فیصلے سے براہ راست متصادم ہے۔ عمدہ نے زمین کا قطعہ چوکیدار کو اپنے پاس رکھنے کی اجازت اس کے بیٹے کی اس رضاکارانہ پیشکش کے بدلے میں دی جو اس نے اپنی مرضی سے، بلکہ کسی کے کہے بغیر خود درخواست کر کے کی تھی۔

''علاوہ ازیں، چوکیدار کا بیٹا یوں بھی ہمیشہ سے فوج میں جانے کا آرزومند تھا۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس نے خود مجھ سے اس بارے میں بات کی تھی؛ حقیقت یہ ہے کہ اس نے خود رضاکارانہ طور پر بھرتی ہونے کا فیصلہ کیا تھا لیکن اس کی درخواست کسی وجہ سے رد کر دی گئی تھی۔ یہ نوجوان بہت بلند عزائم رکھتا تھا، اور غریبوں کے عزائم ہی ان کی تباہی کا سبب بنتے ہیں۔ اس کی نگاہیں اس مستقبل پر جمی ہوئی تھیں جب وہ ایک اعلیٰ فوجی افسر بن جائے گا، اس کے شانے عقابوں اور ستاروں سے مزین

Scanned with CamScanner

ہوں گے، اور اس کی وردی پر چھڑی اور تلوار آویزاں ہو گی ۔ یہی سبب تھا کہ وہ فوج میں بھرتی ہوا تا کہ اپنے ان ذاتی عزائم کو حاصل کر سکے — اس نے اس کے لیے خود التجا کی تھی ۔

''کیا عمدہ اس لیے مجرم ہے کہ اس نے ایک مصری شہری کو اس کے عزائم حاصل کرنے میں مدد فراہم کی؟ یہ بات ذہن میں رکھیے کہ وہ گاؤں کا عمدہ بھی ہے اور باپ بھی ۔ اپنی ذاتی اور سرکاری دونوں حیثیتوں میں وہ گاؤں کے ان تمام باشندوں کا سرپرست ہے اور اس بات کا ذمے دار کہ ان میں سے ہر باشندے کو اس کے عزائم حاصل ہوں ۔ اس نے چوکیدار کے بیٹے کے ساتھ جو طرزِ عمل اختیار کیا وہ گاؤں کے عمدہ کے طور پر اس کی ذمے داریوں سے قطعی مطابقت رکھتا ہے ۔

''آخری دفاعی دلیل جو میں پیش کرنا چاہتا ہوں — جو اس پورے مقدمے کو تباہ کر کے رکھ دے گی — یہ ہے کہ عمدہ کا باپ بھی عمدہ تھا، اور اس کے دادا کا دادا بھی ۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک اعلیٰ نسب کا حامل انسان ہے ۔ رہا چوکیدار اور اس کا بیٹا، تو وہ اس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جو رات کو بھوکا سونے کا عادی ہے ۔ یہ شخص عمدہ کے کھیتوں پر مزدوری کرتا ہے ۔ عمدہ اس زمین کا بھی مالک ہے اور اس پر رہنے اور کام کرنے والے تمام لوگوں کا بھی، چنانچہ اس لحاظ سے چوکیدار کا بیٹا عمدہ کی ملکیت ہے اور وہ اسے کسی بھی طرح استعمال میں لانے کا اختیار رکھتا ہے ۔ یہ لوگ اس کھیت پر مزدوری کرتے ہیں جو عمدہ کی ملکیت ہے اور وہ اسے اور اس پر موجود ہر چیز کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرنے کا مختار ہے ۔

''مجھے اس تفتیش پر اس بنیاد پر اعتراض ہے کہ یہ اصل مسئلے سے روگردانی کرنے کی کوشش ہے ۔ جس مسئلے پر آپ کو تحقیق کرنی چاہیے وہ یہ ہے: اب جبکہ چوکیدار کا بیٹا عمدہ کے بیٹے کے طور پر لڑتے ہوئے جنگ میں کام آ چکا ہے، تو ان دونوں میں سے کون شہید کہلائے جانے کا مستحق ہے؟ یہ بات واضح ہے کہ اس نکتے پر ہمیں قانونی حکام سے رجوع کرنا ہو گا اور تاریخ کا مطالعہ کر کے یہ دریافت کرنا ہو گا کہ اس کی کوئی نظیر موجود ہے یا نہیں، اور اگر موجود ہے تو اسے کس طرح کام میں لایا جا سکتا ہے ۔ تب ہی ہم اس بابت کسی فیصلے پر پہنچ سکیں گے کہ شہید کون ہے — چوکیدار کا بیٹا جو جسمانی طور پر محاذ پر گیا، یا عمدہ کا بیٹا جس نے اپنے عیوضی کے طور پر اسے شہید ہونے کے لیے بھیجا ۔

''اسی سوال کے جواب میں ایک دوسرے مسئلے کا حل بھی پنہاں ہے جو بہت جلد اٹھنے والا ہے:

Scanned with CamScanner

مرنے والے کا وارث کون ہے؟ عمدہ یا چوکیدار؟ اس وقت جو صورت حال ہے اس کی رو سے تو ان تمام انعامات کا — جو بہت وافر ہیں — عمدہ ہی حقدار قرار پاتا ہے۔ لیکن پھر چوکیدار بیچارے کا کیا ہوگا؟ کیا ہم اس معاملے میں عمدہ کے ضمیر پر اعتماد کرتے ہوئے اس سے یہ تقاضا کر سکتے ہیں کہ وہ یہ رقم — مکمل یا جزوی طور پر — چوکیدار کو دے دے؟ کیا وہ اس سلسلے میں فیصلہ کرنے کے لیے آزاد ہے؟ یا پھر ہمیں یہ رقم ان دونوں کے درمیان خود تقسیم کرنی چاہیے؟

''جو کچھ پیش آیا اسے جرم قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ یہ ایک قانونی سودا تھا۔ کیا انتخابات میں لوگ اپنی جگہ دوسرے کو ووٹ ڈالنے کی اجازت نہیں دیتے؟ انتخابات بھی حب الوطنی پر مبنی سرگرمی ہے، چنانچہ جب انتخابات میں اپنا نمائندہ مقرر کرنا ممکن ہے تو جنگ کے سلسلے میں بھی اس کی اجازت ہونی چاہیے۔ یوں بھی اب سارا معاملہ ختم ہی ہو چکا ہے — گرے ہوئے دودھ پر رونے سے کیا حاصل! جس بات کی تفتیش کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ مرنے والے کا وارث کون ہوگا۔ اصل اہمیت اسی سوال کی ہے۔

''اور پھر، ہر بات کی اتنی باریکی میں کرید کرنے کی ضرورت کیا ہے؟ ایک شخص نے دوسرے شخص کے لیے اپنی جان قربان کرنے کا رضاکارانہ فیصلہ کیا — تو اس معاملے سے حکومت کا کیا لینا دینا؟ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ سرخ فیتے کے دن اب لد گئے؛ اور یہ کہ اب ہم آزادی کے زمانے میں جی رہے ہیں۔ ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ اپنی زندگی کے بارے میں جو چاہے فیصلہ کرے — چاہے تو اپنا خون بہانے کا بھی فیصلہ کر سکتا ہے۔ موجودہ معاملے میں ایک شخص نے دوسرے شخص کے عوضی کے طور پر اپنی جان قربان کر دی۔ اس کا قانون سے کیا تعلق؟ آپ تو بس یہ فیصلہ کیجیے کہ مرنے والے کا وارث کون ہوگا، اللہ آپ کی رہنمائی کرے۔''

میں نے اس کے سامنے یہ بات پیش کی کہ عمدہ نے زمین دراصل چوکیدار کے حوالے نہیں کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نے تین فدان زمین بٹائی کے عارضی ٹھیکے پر چوکیدار کو سونپ کر اس کا استحصال کیا ہے — اور یہ ٹھیکہ قانون کے خلاف ہے۔ اس پر وہ چلّا اٹھا کہ یہ بات درست نہیں ہے۔ اس نے کہا کہ جن لوگوں نے مجھ تک یہ بات پہنچائی ہے وہ سازشی اور جھوٹی باتیں پھیلانے والے ہیں۔

میں نے اسے بتایا کہ یہ بات مجھے میری تفتیش کے دوران معلوم ہوئی ہے، اور خود چوکیدار نے

مجھے بتائی ہے، لیکن اس نے جواب میں کہا کہ عمدہ کے بہت سے دشمن ہیں جو زمین اسے واپس ملنے کے بعد اس کے خلاف سرگرم ہو گئے ہیں۔ وہ ہر بات کو مسخ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اس نے کہا۔

میں نے اس غیر معمولی دلال کو رخصت کیا جو اصل میں عمدہ کا نہیں بلکہ خود اپنا دفاع کر رہا تھا۔ لیکن اس نے مرنے والے کے وارث کے سلسلے میں جو کچھ کہا تھا اس نے مجھے اضطراب میں مبتلا کر دیا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ اگرچہ میرا فرض اس واقعے کے بارے میں فیصلہ کرنا ہے جو ماضی میں پیش آیا تھا، لیکن سب سے دشوار کام اس مسئلے سے نمٹنا ہے جو مستقبل میں سر ابھارے گا۔ اس وقت اس سوال کی اہمیت ہو سکتی ہے: ''وہ کون تھا جو جنگ میں لڑا، مارا گیا اور فتح مند ہوا؟'' لیکن اس سے بھی زیادہ اہمیت اس سوال کی ہے: ''اخلاقی فتح کس کے حصے میں آئی... اور مادّی انعامات کس کو ملیں گے؟'' اس سوال کا طے کرنا انتہائی ضروری تھا۔

اب اس مقدمے کے تمام عناصر میرے سامنے تھے۔ اب مجھے اپنے ذہن میں تمام بکھرے ہوئے سروں کو جمع کرنا تھا اور اپنے اخذ کردہ نتائج کو کاغذ پر تحریر کرنا تھا تاکہ پورا معاملہ سلجھ سکے۔ میں نے تمام دستاویزات کو ترتیب دینا شروع کیا، اور سب سے پہلے دونوں پیدائش کے سرٹیفکیٹ لگائے۔ یہ واحد موقع تھا جہاں عمدہ کے بیٹے اور چوکیدار کے بیٹے کی تفصیلات بالکل یکساں تھیں۔ دونوں ایک ہی گاؤں میں، ایک ہی دن پیدا ہوئے تھے؛ یہ امر نا قابل تردید تھا۔ باقی تمام دستاویزات میں ان کی متعلقہ تفصیلات ایک دوسرے سے بالکل مخالف رخ پر واقع تھیں۔ جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے، چوکیدار کا بیٹا ایک غیر معمولی طور پر کامیاب شاگرد تھا لیکن وہ اپنی تعلیم مکمل نہ کر سکا کیونکہ اس کا باپ اس کے اخراجات اٹھانے سے قاصر تھا۔ اس کے برعکس عمدہ کا بیٹا کئی بار اپنے امتحانوں میں فیل ہوا۔ شناختی کارڈ کے اجرا کے لیے دی جانے والی دونوں درخواستوں میں مختلف اطلاعات اور مختلف تصویریں فراہم کی گئی تھیں: ایک تصویر واضح طور پر عمدہ کے بیٹے کی تھی، دوسری محض ایک چوکیدار کے بیٹے کی۔ لازمی فوجی خدمت کے سلسلے میں بھی ان دونوں کی تفصیلات ایک دوسرے کے بالکل برعکس تھیں۔ چوکیدار کے بیٹے کو فوجی خدمت سے اس بنا پر استثنیٰ حاصل تھا کہ وہ اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا (اس کی کئی بہنیں تھیں لیکن بھائی کوئی نہ تھا) جبکہ عمدہ کے بیٹے کو واقعتاً فوجی خدمت کے لیے طلب کیا گیا تھا۔ اس کے کاغذات میں بھرتی کی تاریخ درج تھی اور یہ بتایا گیا تھا کہ ایک مخصوص نمبر کا سفری

Scanned with CamScanner

اجازت نامہ جاری کیے جانے کے بعد اسے مسلح افواج کے ایک رکن کی نگرانی میں اسکندریہ کے بھرتی کیمپ بھیج دیا گیا تھا۔ کاغذات میں دیے گئے انگوٹھوں کے نشان واضح طور پر دو مختلف آدمیوں کے تھے۔ مقدمہ تیار ہو چکا تھا۔ سب کچھ موجود تھا، سوائے عمدہ کے اعتراف کے، اور اس کی پوزیشن دلال کے بیان کے باعث، جسے اس کا شریک جرم سمجھا جا سکتا تھا، نہایت مخدوش ہو چکی تھی: عمدہ ہی وہ شخص تھا جس نے جرم کا ارتکاب کیا تھا جبکہ دلال نے اس جرم میں اس کی اعانت کی تھی۔

میں نے تمام حقائق، پرانے اور نئے، عمدہ کے سامنے رکھ دیے لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہوا؛ اس نے اعتراف کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر میں نے دلال اور عمدہ کے بیٹے کی گرفتاری کے وارنٹ جاری کیے، اس امید میں کہ اس سے عمدہ پر دباؤ پڑے گا اور وہ جو کچھ پیش آیا تھا اس کا اعتراف کرنے پر رضامند ہو جائے گا۔ وہ اپنے بیٹے کی گرفتاری پر سخت طیش میں آ گیا، لیکن اعتراف کرنے پر تب بھی راضی نہ ہوا۔ مجھے ایک بار پھر احساس ہوا کہ وہ کسی بات کے انتظار میں ہے، کسی نئی بات کے پیش آنے کے انتظار میں جو اسے مصیبت سے نکلنے کا راستہ فراہم کر دے۔

اس موقعے پر میں نے اپنا کام بند کر دیا۔ اب میں کچھ دیر کے لیے سکون کا سانس لینے کا خواہشمند تھا۔ جو کچھ میں نے اب تک کیا تھا وہ نہایت دشوار ثابت ہوا تھا اور جس تفتیش کا میں نے حکم دیا تھا اب مجھے اس کے نتائج کا انتظار کرنا تھا۔

کچھ وقفے کے بعد انٹیلی جنس افسر مجھ سے ملنے آیا۔ مجھے توقع تھی کہ وہ میرے سپرد کرنے کے لیے تحریری رپورٹ لے کر آیا ہو گا جس کو یا تو فائل میں لگا لیا جائے گا یا اگر اس تفتیش کے نتائج پہلے سے معلوم ثابت ہوئے اور تفتیش کے لیے کارآمد نہ سمجھے گئے تو اسے انٹیلی جنس افسر کو لوٹا دیا جائے گا۔ مجھے تعجب ہوا جب اس نے میرے سامنے محض ایک زبانی رپورٹ پیش کی — اور اس کے بیان سے اس پورے واقعے کی تصدیق ہو گئی جو درحقیقت پیش آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ چوکیدار کے بیٹے کو واقعی عمدہ کے بیٹے کی جگہ محاذ پر بھیجا گیا تھا، لیکن اس نے مجھے اس معاملے کو مزید آگے بڑھانے سے باز رہنے کو کہا، کیونکہ اس کے خیال میں آگے چل کر اسے یوں بھی ادھورا چھوڑ دیا جانے والا تھا۔

اس نے بتایا کہ اس کی دو وجہیں ہیں۔ اول، اسے اپنی تفتیش کے دوران معلوم ہوا کہ عمدہ بے پناہ اثر و رسوخ کا حامل شخص ہے؛ اسے، ہر وقت اور ہر صورت حال میں مقتدر لوگوں اور اعلیٰ ترین

سرکاری اہلکاروں تک رسائی حاصل ہے۔ اس نے کہا کہ جونہی تفتیش شروع ہوئی اور مقدمے کی تیاری ہونے لگی، اسے ایک بات کا یقین ہو گیا: چاہے کچھ بھی ہو جائے، تفتیش کو ادھورا چھوڑ دیا جائے گا۔ یہ بات دو میں سے ایک طریقے سے پیش آئے گی: یا تو مرنے والے کا حقیقی باپ خود اس کی درخواست کرے گا اور کہے گا کہ اس کے بیٹے کی گرانقدر یاد اور اس کی مقدس شہادت کے احترام میں اس معاملے کو یہیں روک دیا جائے؛ یا پھر ایسا کرنے کی ہدایات اوپر سے آئیں گی۔ اس نے مجھے یقین دلایا کہ آخر الذکر نتیجہ خود اس کے ذہن کی پیداوار ہے اور یہ بات اسے کسی نے بتائی نہیں ہے — یہ محض اس کا ذاتی خیال ہے۔

میں نے اسے اس کی تفتیش کے نتائج کا خلاصہ اور مختصر سرکاری رپورٹ کی صورت میں تحریر کرنے اور ضلعی پولیس کے مامور کے توسط سے میرے پاس جمع کرانے کی ہدایت کی تاکہ اس کے بعد میں اس رپورٹ میں دی گئی واقعاتی شہادت کی روشنی میں آگے کارروائی کر سکوں۔

عمدہ کا کہیں پتا نہ تھا اور مجھے بتایا گیا کہ وہ آرام کرنے اپنے گاؤں لوٹ گیا ہے، لیکن کسی بھی وقت دوبارہ حاضر ہونے کو تیار ہے۔ اس کے پاس کئی گاڑیاں ہیں اور گھر پر ٹیلیفون بھی ہے، جو دوار پر لگے ہوئے پولیس کی ملکیت والے ٹیلیفون کے علاوہ ہے جس کا براہ راست رابطہ ضلعی انتظامیہ، مرکزی پولیس کے دفتر اور صوبائی دارالحکومت کے تمام ٹیلیفونوں سے قائم ہے۔

گاؤں کے کسانوں کا ایک بڑا وفد عمدہ کی بے حساب ناانصافیوں کی شکایت کرنے میرے پاس آیا۔ میں نے ان پر واضح کر دیا کہ مجھے صرف ایک خاص وقوعے کی تفتیش کا کام سونپا گیا ہے اور میں دوسرے وقوعوں پر اسی صورت میں توجہ دے سکتا ہوں جب ان کا براہ راست تعلق مصری کے اس مخصوص معاملے سے ہو۔ اس پر ان کا جواب یہ تھا کہ یہ معاملہ ان ہزاروں مثالوں میں سے محض ایک ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ عمدہ ان کے ساتھ کس قسم کا سلوک روا رکھتا ہے؛ فرق صرف یہ ہے کہ اس بار اس کا کرتوت ظاہر ہو گیا اور یہ بات ہمارے کانوں تک بھی پہنچ گئی۔ ان میں سے ایک نوجوان بولا کہ عمدہ کے تمام جرائم سیاسی نوعیت کے ہیں۔ اس کا کہنا تھا کہ ان جرائم کے سلسلے میں محض قوانین کے متن سے کام لینا ایک بڑی غلطی ہے کیونکہ قوانین کے متن میں موجود رخنے — جن کی کوئی کمی نہیں — اس کو نکل بھاگنے کی راہ فراہم کر سکتے ہیں۔ عمدہ کے جرائم کی فہرست بہت لمبی ہے، لیکن اس وقت وہ

Scanned with CamScanner

ان کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا ـــ اور یہ کہ اسے یقین ہے کہ عمدہ نے میرے سامنے اپنے بیان میں ان کا ذکر تک نہیں کیا ہوگا۔

بعد میں غور کرنے سے مجھے یوں لگا کہ ان تمام لوگوں کو، بالواسطہ طور پر، اس معاملے میں استغاثہ کے گواہوں کا درجہ حاصل ہونا چاہیے؛ لیکن وہ عمدہ سے خوفزدہ تھے۔ میں نے انھیں یقین دلایا کہ ان کے نام ظاہر نہیں کیے جائیں گے؛ کسی دوسرے شخص کو ان کی شناخت کے بارے میں علم نہیں ہو گا۔ میں انھیں اضافی گواہ خیال کرتا تھا جن کی ضرورت مجھے عمدہ کے خلاف لڑائی میں پڑ سکتی تھی۔

جب محافظہ سے فوجی صلاح کار آیا، جس کے ساتھ فوجی پولیس کا نمائندہ بھی تھا، تو میں نے تصور کیا کہ وہ دونوں حقیقت تک پہنچنے کی کوشش میں میرے ساتھ تعاون کریں گے۔ لیکن فوجی پولیس کے نمائندے نے جو کچھ کہا اس سے مجھے سخت دھکا لگا۔ اس نے مجھ پر اس بنا پر تنقید کی کہ میں نے ایک ایسے معاملے کو جو سو فیصد فوجی نوعیت کا ہے، فوجی پولیس کی موجودگی کے بغیر، بلکہ اس کو کوئی اطلاع دیے بغیر اپنے ہاتھ میں لے کر کارروائی شروع کر دی، جبکہ یہ اختیار مکمل طور پر فوجی پولیس کا تھا۔ اس نے کہا کہ فوج کے جن سپاہیوں اور افسروں نے میرے سامنے شہادتیں دی ہیں ان سے جواب طلب کیا جائے گا، کیونکہ فوجی ضوابط میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ مسلح افواج کے کسی بھی رکن کے سلسلے میں کوئی پوچھ گچھ اس وقت تک نہیں کی جا سکتی جب تک فوجی حکام کی نمائندگی کرنے کے لیے کوئی بااختیار شخص موجود نہ ہو۔ اس نے مزید کہا کہ قانون کی رو سے اس قسم کے کسی بھی معاملے میں تفتیش صرف فوجی پولیس کی نگرانی میں کی جا سکتی ہے۔

میں نے اس کی بات کو تسلیم کرنے سے اس بنا پر انکار کر دیا کہ یہ پورا معاملہ کسی بھی فوجی کیمپ، بلکہ عمومی طور پر فوج سے بہت دور، اس مقام پر پیش آیا تھا؛ چنانچہ تفتیش کو ہر حال میں اس کے منطقی نتیجے تک پہنچنا چاہیے۔

اچانک مجھے اس معاملے کی تفتیش بند کرنے، اس پورے معاملے کو فراموش کرنے اور لاش کو دفن کرانے کے واضح اور غیر مبہم احکام موصول ہوے۔ درحقیقت تدفین کا عمل ان احکام کے جاری ہونے کے ساتھ ہی، میری اجازت کے بغیر، شروع بھی کیا جا چکا تھا۔ مرنے والے کو چوکیدار کے بیٹے کے طور پر نہیں بلکہ عمدہ کے بیٹے کی حیثیت سے دفنایا گیا، اگرچہ اس سے دو سنگین مسائل نے جنم لیا۔

Scanned with CamScanner

اول، اسے عمدہ کے بیٹے کے طور پر دفن کیا جانا مضحکہ خیز تھا جبکہ اس نام اور حلیے کا حامل شخص زندہ اور بخیریت موجود تھا۔ اس کا مطلب یہ نکلتا تھا کہ ایک ہی نام کے دو اشخاص تھے، ایک مر چکا تھا اور ایک اب تک زندہ تھا، جس کے باعث مستقبل میں یہ طے کرنا مشکل ہوتا کہ کون سا شخص اصلی تھا اور کون عیوضی۔ دوسرا مسئلہ مصری سے تعلق رکھتا تھا — اسے کہاں موجود فرض کیا جائے؟ درحقیقت یہ مسئلہ محض تدفین کے باعث نہیں پیدا ہوا تھا۔ یہ اس سے کچھ عرصہ پہلے سے موجود رہا تھا، کیونکہ مصری جب سے عمدہ کے بیٹے کی حیثیت سے فوج میں بھرتی ہوا اسے اپنے وجود کو ثابت کرنے کا مسئلہ درپیش تھا۔ اور اس سب سے بڑھ کر یہ احساس تھا کہ مصری کو — جو گھر چھوڑ کر فوج میں بھرتی ہوا، جنگ میں لڑا اور مارا گیا — شہید کے طور پر یاد رکھے جانے کے حق سے بھی محروم کیا جا رہا تھا۔

میں نے ان سب باتوں کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی، لیکن محافظہ سے آئے ہوئے فوجی صلاح کار نے ایک نہ سنی۔ اس کا کہنا تھا کہ ملک نازک دور سے گزر رہا ہے۔ کیا یہ قدیم، متوسط اور جدید دور کی پوری تاریخ میں پہلا موقع نہیں جب عرب فتح مند ہوئے ہیں؟ مصر اور عرب قوم کو ہزاروں برس کے انتظار کے بعد جو فتح نصیب ہوئی ہے، اس پر یہ مصری والا قصہ تاریک، غمناک سایہ ڈال دے گا۔ اس نے مجھ سے اس بات پر غور کرنے کی درخواست کی کہ اگر اس معاملے کی بھنک مصر کے دشمنوں کو پڑ گئی تو وہ کیا کہیں گے!

''علاوہ ازیں،'' اس نے اپنی بات جاری رکھی، ''یہ پورا معاملہ اتنا اہم ہے ہی نہیں کہ اس پر زیادہ توجہ صرف کی جائے۔ جب قوم اور معاشرہ ترقی کی راہ پر آگے بڑھتا ہے تو ہزاروں افراد کو قوم کے وسیع تر مفاد میں قربانی دینی پڑتی ہے۔ مصری کے لیے یہی بڑی بات ہے کہ اسے وطن کا دفاع کرتے ہوئے اپنی جان قربان کرنے کا موقع ملا۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس نے کس نام سے اپنی جان قربان کی؛ اصل اہمیت اس بات کی ہے کہ اس نے اپنے وطن، اپنے خاندان اور مصری عوام کی خاطر اپنی جان کی قربانی دی۔ یہ ثانوی بات ہے کہ اس نے ایسا اپنے نام سے کیا یا عمدہ کے بیٹے کے نام سے۔

''یہ مت بھولیے کہ اس وقت پورا مصر ایک چھوٹے سے فقرے میں سمٹ آیا ہے: عند ما یصیر الکل فی واحد (جب کُل واحد بن جاتا ہے تو واحد کُل میں وجود رکھتا ہے)۔ کیا آپ کو اندازہ ہے کہ انفرادی خدوخال کے ایک کُل میں ڈھل جانے کی بات کیا معنی رکھتی ہے؟ کاش

Scanned with CamScanner

ہماری یہ نئی نسل حب الوطنی کے حقیقی مفہوم سے آشنا ہو سکے! کاش وہ جان سکے کہ کُل کے واحد میں زندہ رہنے کا مطلب کیا ہے!''

میں نے معاملے کی تفتیش کے بند کیے جانے پر اعتراض کیا۔ میرے لیے یہ بات سمجھنا محال تھا کہ وہ کس طرح یہ فرض کر سکتا ہے کہ یہ وقوعہ کبھی پیش ہی نہیں آیا تھا۔ میں تفتیش کار ہوں اور میرا کام حقیقت تک پہنچنا ہے۔ میرے کام کے دوران اطمینان کے لمحے بھی آتے ہیں اور غصے کے بھی، لیکن یہ میرا ذاتی مسئلہ ہے۔ جہاں تک موجودہ معاملے کا تعلق ہے، یہ کسی تفتیش کار کے لیے کمر توڑ ثابت ہو سکتا تھا— میں حقیقت کے قریب جا پہنچا تھا لیکن پھر اس نے مجھ سے آنکھ مچولی کھیلنا شروع کر دیا۔ یہ بالکل بھول بھلیوں میں بھٹکنے کی طرح تھا۔ حقیقت کو پالینا ہی وہ شے ہے جس سے مجھے مسرت حاصل ہوتی ہے— اس میں ناکامی مجھے شدید مایوسی میں مبتلا کر دیتی ہے اور اس کا بوجھ سیسے کی طرح محسوس ہوتا ہے۔ اب جبکہ میں کہانی کے سب سے سنگین مرحلے تک آ پہنچا ہوں تو پھر یہ کسمسانا اور پہلو بدلنا کس لیے؟ مجھے جو کچھ کہنا ہے صاف صاف کہہ ڈالنا چاہیے۔

میں اس معاملے کی تفصیلات — سوالات، جوابات، کاغذات، دستاویزات — میں کھویا ہوا تھا جب اعلیٰ ترین اہلکاروں میں سے ایک نے مجھے طلب کیا۔ مجھے اس پر بہت خوشی ہوئی، میں نے سوچا کہ ''انھیں'' معاملے کی خبر ہو گئی ہے — کہ آخر کار یہ اطلاع ان لوگوں تک جا پہنچی ہے جو اس سلسلے میں حتمی اختیار رکھتے ہیں۔ یہ اس معاملے کی اہمیت کا ثبوت ہے، میں نے سوچا، اور اس بات کی ضمانت بھی کہ اپنے حق سے محروم کر دیے گئے شخص کو اس کا حق ملے گا اور مجرم کو سزا۔

میں اس اعلیٰ اہلکار کے پاس حاضری کے لیے روانہ ہوا۔ جونہی میں اس لیموزین میں بیٹھا جو مجھے لانے کے لیے بھیجی گئی تھی، شوفر نے ایک بٹن دبایا اور کھڑکیوں کے شیشے اوپر اٹھ گئے۔ میرے سامنے دودھیا سفید رنگ کا ٹیلیفون رکھا تھا اور کار کے اندر کی ہوا ایسی تھی کہ اس قسم کی ہوا میں سانس لینے کا مجھے پہلے کبھی موقع نہ ملا تھا۔ میں نے شوفر سے اس خوشبودار ہوا کا راز جاننے کی کوشش کی، لیکن اس نے جواب دینے کی زحمت کیے بغیر ڈیش بورڈ پر لگے ایک چھوٹے مگر بظاہر پیچیدہ آلے کی طرف اشارہ کر دیا۔ میں نے اپنا سوال دہرایا۔ ''ایر کنڈیشننگ،'' اس نے تیز لہجے میں جواب دے کر بات ختم کر دی۔

Scanned with CamScanner

تو گویا یہ کار ایر کنڈیشنڈ تھی۔ اس تسکین بخش فضا میں بیٹھے ہوئے میں اس معاملے میں اپنے کردار پر غور کرنے لگا۔ میں خوش تھا۔ میں نے سوچا، ہم یقیناً ایک سنہرے دور میں جی رہے ہیں— اتنے اونچے سرکاری اہلکار اس قسم کے معاملے میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ عوام کی سب سے نچلی سطح تک انصاف کی فراہمی کو یقینی بنانا ہی وہ اہم ترین چیز ہے جو کوئی حاکم کرسکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ أن العدل أساس الملك (عدل حاکمیت کی بنیاد ہے)، کہ حاکمِ عادل وہ ہے جو اس وقت تک آرام نہیں کرتا جب تک اس کا ایک بھی محکوم بھوکا، ننگا یا بے گھر ہو؛ جس کسی کا بھی یہ قول ہے اسے یقیناً حاکم عادل اور حاکم غیر عادل کے درمیان فرق اچھی طرح معلوم تھا۔ اس بات پر غور کرتے ہوئے میں نے خود سے کہا، ''میں اس وقت جس معاملے کی تفتیش کر رہا ہوں وہ پہاڑوں کو ان کی جڑوں تک ہلا کر رکھ دے گا!'' ہمارے سامنے اس خون کا سوال تھا جو وطن کے دفاع میں بہایا گیا، اس خون کی مہک صحرا کی ریت میں مل گئی تھی اور ہوا میں تیر رہی تھی۔

جب میں اس اعلیٰ اہلکار کے دفتر پہنچا تو مجھے احساس ہوا کہ جس کار میں بیٹھ کر میں آیا ہوں وہ اس کے دفتر کی ایک متحرک توسیع کے سوا کچھ نہیں، یا پھر اس کا دفتر اس کار کی ساکن توسیع تھا۔ وہاں کی فضا گرم اور خوشبودار تھی، ایسے رنگ بکھرے ہوئے تھے کہ ان کو دیکھ کر قوس قزح کا گمان ہوتا تھا۔ اس کے علیک سلیک کے انداز میں نیم دلی تھی؛ معلوم نہیں یہ اس کا لوگوں کا خیر مقدم کرنے کا معمول کا انداز تھا یا اسے اس نے خاص میرے لیے اختیار کیا تھا۔

میں کچھ نہ بولا؛ میں اس کی طرف سے سوالات کا منتظر تھا تا کہ جواب میں بتا سکوں کہ میں اپنی تفتیش کے اختتام کے قریب ہوں، بس عمدہ کی طرف سے اعتراف باقی رہ گیا ہے جس کے بعد مقدمہ مکمل ہو جائے گا۔ میں اسے یہ بھی بتاؤں گا کہ دراصل یہ اعتراف اتنا زیادہ اہم بھی نہیں، کیونکہ تمام گواہوں کے بیانات ایک ہی سمت میں اشارہ کر رہے ہیں۔ دلال کا بیان اس کی ایک مثال ہے۔ وہ اس جرم میں شروع سے آخر تک عمدہ کا معاون رہا، اور اس کا دفاعی بیان قریب قریب مکمل اعتراف کا درجہ رکھتا ہے کیونکہ قانونی زاویۂ نگاہ سے وہ اعانت جرم کرنے والا بڑا مجرم ہے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ جب اعلیٰ اہلکار مجھے بولنے کا موقع دے گا تو میں ایک تیز رفتار اور فیصلہ کن مقدمہ چلائے جانے کی سفارش کروں گا، جس کا فیصلہ دس دن کے اندر اندر صادر ہو جائے، کیونکہ اس مقدمے کا تعلق قومی

دفاع کے سوال سے ہے۔

اعلیٰ اہلکار اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور اپنی عالیشان میز کے عقب سے باہر نکل آیا۔ وہ کمرے کی ایک کھڑکی کے پاس گیا، اس کے پردے کھولے اور میری طرف پیٹھ کر کے نیچے چھوٹے سے چوک کا نظارہ کرنے لگا۔ جاڑوں کے پہلے تنبیہی اشاروں کے فوراً بعد لوگوں کا واسطہ ایک ایسے سرد موسم سے آ پڑا تھا جس کے وہ قطعاً عادی نہ تھے۔ اعلیٰ اہلکار مسکرایا، پھر اس کی مسکراہٹ پھیل کر ہنسی میں تبدیل ہو گئی، اور اس کے بعد وہ یکایک سنجیدہ ہو کر میری طرف مڑا اور پوچھنے لگا: ''اس وقت تمھارے ذمے جو کام ہے اسے کب تک پورا کر لو گے؟''

میں سیدھا ہو بیٹھا، گہرا سانس بھرا اور تھوک نگلا، لیکن میرے کچھ جواب دینے سے پہلے ہی وہ بولا، ''تقریر کرنے کی ضرورت نہیں، بس میرے سوال کا جواب دو۔ پہلی بات: کیا تمھاری تفتیش مکمل ہو گئی؟''

''ایک آخری جز ابھی باقی ہے،'' میں نے صورت حال کا تناؤ کم کرنے کی کوشش میں کہا، ''ملزم کا اعتراف، اصل آدمی کا جس نے جرم کا ارتکاب کیا ہے، لیکن وہ آج حاصل ہو جائے گا، یا زیادہ سے زیادہ کل تک۔''

''کیا وجہ ہے کہ وہ آج اعترافی بیان نہیں دے سکتا؟''

''وہ اعترافی بیان دینے سے انکار کر رہا ہے، استغاثہ کے تمام گواہوں کے بیانات کے باوجود۔''

''ایسی صورت میں اس کا بیان کتنی اہمیت رکھتا ہے؟''

''میں جس تیز رفتار مقدمے کی سفارش کر رہا ہوں، اس میں اعترافی بیان کی غیر موجودگی کو طریق کار کی خامی تصور کیا جائے گا، اور ممکن ہے جج نئے سرے سے تفتیش کرنے کا حکم جاری کرے؛ یا وہ خود معاملے کی تفتیش کرنے کا فیصلہ کرے، جس سے معاملہ تاخیر کا شکار ہو سکتا ہے۔''

''تم نے کیا کہا، مقدمہ؟'' اعلیٰ اہلکار نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''بے شک،'' میں نے کچھ سوچے بغیر کہا۔ ''تفتیش کار کی رپورٹ مکمل ہونے کے بعد مقدمہ عدالت میں تو جائے گا ہی۔''

Scanned with CamScanner

''کون سا مقدمہ؟''

''وہی جس کی میں تفتیش کر رہا ہوں، اس شخص کا معاملہ جو محاذ جنگ پر مارا گیا۔''

''محاذ جنگ پر کون مارا گیا؟''

''مصری، چوکیدار کا بیٹا۔''

''کس چوکیدار کا بیٹا؟''

''وہی جو عمدہ کے بیٹے کی جگہ فوج میں بھرتی ہوا تھا۔''

''عمدہ کون؟''

''گاؤں کا عمدہ۔ کہا جاتا ہے وہ بہت اثر ورسوخ والا شخص ہے، لیکن اس کا جرم بالکل ثابت ہے۔''

''ثابت سے تمھارا کیا مطلب ہے؟''

''میرا مطلب یہ ہے کہ جرم کے بنیادی عناصر پوری طرح واضح ہیں: مجرم، گواہ، مادّی شہادتیں، جرم کا شکار ہونے والا... ''

''شکار ہونے والا کون؟''

''مجھے کہنا چاہیے تھا، شکار ہونے والے... ''

''تم کیا باتیں کر رہے ہو؟'' اس بار اس کی آواز اونچی تھی۔

میں نے جواب نہ دینے کا فیصلہ کیا۔ پوری بات مضحکہ خیز ہوتی چلی جارہی تھی اور میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس کی باتوں کا کیا مطلب ہے۔ کیا اس نے واقعی مجھے طلب کیا تھا یا کسی اور کو؟ اچانک بے بسی کا احساس مجھ پر سر سے پیر تک چھا گیا؛ معلوم ہوتا تھا میں ایک نہایت دشوار صورت حال میں ہوں۔ میرے ذہن میں چیخنے چلانے، بھاگنے، اس پر جھپٹ پڑنے کے خیالات آئے، لیکن بہت سی چیزوں نے مجھے باز رکھا: دفتر کی وسعت، حفاظتی انتظامات جن سے مجھے اس کی خدمت میں حاضر ہونے کا اعزاز حاصل کرنے سے پہلے گزرنا پڑا تھا، حفاظتی چوکیاں اور چیک پوائنٹ، وہ کار جو مجھے یہاں لے کر آئی تھی، اس شخص کا غیر شخصی پن... اس کے سامنے حاضر کیے جانے سے پہلے میں نے سوال کیا تھا کہ مجھے کس اہلکار کے سامنے پیش کیا جانے والا ہے۔ جواب نہایت مختصر تھا: ''ایک بہت

اعلیٰ اہلکار کے سامنے۔''

''کون؟'' میں نے پوچھا تھا۔ ''کس حکومتی شعبے کا سربراہ؟'' اس بار بھی مختصر جواب ملا: ''ایک بہت اعلیٰ اہلکار۔''

''سنو!'' اب وہ بولا، میری طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے۔ ''کوئی مقدمہ نہیں ہے، کچھ نہیں ہے۔ یہ سب گاؤں کے کسانوں کا گھڑا ہوا قصہ ہے۔ انھوں نے جرم کا ایسا تانابانا تیار کیا ہے جیسا جاسوسی ناولوں میں ہوتا ہے۔ چوکیدار کا بیٹا فوج میں بھرتی ہوا، اور اپنی پست اصل کو دیکھتے ہوئے، وہ اپنا رشتہ کسی ممتاز، اعلیٰ نسل کے خاندان سے جوڑنا چاہتا تھا۔ اس نے پہلے دن سے جھوٹے بیانات دیے اور خود کو عمدہ کا رشتے دار ظاہر کیا، جس کا عہدہ موروثی ہے، کہا کہ وہ اس کا بیٹا ہے۔ چنانچہ جب وہ مارا گیا تو وہ اس نام کے ساتھ شہید ہوا جو اس نے اپنی آزادانہ مرضی سے اختیار کیا تھا۔ اور بس، قصہ ختم! لہٰذا اس کی شہادت اسی نام کے ساتھ درج کی جائے گی، اور اسے عمدہ کے بیٹے کی حیثیت سے ہی دفنایا جائے گا۔

''کوئی مقدمہ نہیں ہے، سمجھے تم؟ ایک نوجوان شہادت کے مقام پر فائز ہوا۔ بہت خوب ہوا۔ اس کا جنت میں جگہ پانا یقینی ہے۔ اور اگر شہادت سے پہلے اس سے کوئی غلطی سرزد ہوئی تھی، اگر اس نے اپنے بلند عزائم کے زیر اثر ایک بلند رتبہ خاندان کا نام اختیار کر لیا تھا تو اس معاملے کا ہم سے کچھ تعلق نہیں۔

''اس سے قطع نظر، تمھیں یہ تفتیش اپنے ہاتھ میں لینے کا حکم کس نے دیا تھا؟ میں جانتا ہوں تم جواب میں کیا کہو گے — ایک شہری نے پولیس کو کسی چیز کی اطلاع دی، پولیس نے ابتدائی تفتیش کی اور پھر معاملے کو سرکاری تفتیش کار کے سپرد کر دیا۔ طریق کار کے حساب سے یہ سب بالکل ٹھیک ہے، لیکن تم سے کئی اہم غلطیاں سرزد ہوئیں۔

''اول، تمھیں شروع سے معلوم تھا کہ یہ کوئی سویلین معاملہ نہیں ہے۔ کم سے کم نوے فیصد فوجی معاملہ ہے؛ بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ یہ سراسر فوجی معاملہ ہے۔ اور فوج کا اپنا طے شدہ دائرۂ کار ہے — اپنی پولیس، اپنے تفتیش کار، اپنی عدالتیں۔ کیا تمھیں معلوم نہیں کہ فوج کے اپنے الگ قوانین ہیں، جو سول عدالتوں کے قوانین سے مختلف ہیں؟ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود، تم نے متعلقہ فوجی

Scanned with CamScanner

حکام سے رابطہ قائم کیے بغیر، اپنے طور پر تفتیش شروع کر دی۔ وہ کچھ زیادہ فاصلے پر نہیں تھے، تم جانتے ہو، اور اطلاع ملتے ہی وہ پورا معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیتے۔

''دوم، میں سمجھتا ہوں تم حب الوطنی اور پیشہ ورانہ کارکردگی دکھانے کے جوش میں اس تفتیش میں لگ گئے۔ تم نے خیال کیا، اور تم اب تک اسی خیال میں ہو، کہ تمھارا واسطہ کسی جرم کے وقوعے سے پڑا ہے، چنانچہ اس کی تفتیش کرنا تمھاری ذمے داری ہے۔ ایسا سوچنے میں بھی کوئی حرج نہیں — لیکن کیا ہر تفتیش کھلی تفتیش ہوتی ہے؟ کہ معاملے کے سارے فریقوں کو ساری باتوں کا علم ہو؟ میں ایسا نہیں سمجھتا؛ میری رائے اس کے بالکل برعکس ہے۔ کچھ معاملات کی تفتیش خفیہ طور پر کی جانی ضروری ہوتی ہے، اور یہ معاملہ اس کی واضح مثال ہے۔ جس جنگ میں مصری مارا گیا وہ ختم نہیں ہوئی، اب بھی جاری ہے، اس وقت بھی جب ہم یہاں بیٹھے بات کر رہے ہیں۔ درست ہے کہ ہم نے فائر بندی قبول کر لی، لیکن صرف محدود مدت کے لیے۔ آخرکار ہمیں اپنے تمام مقبوضہ علاقے کو آزاد کرانا ہے، جس کا مطلب ہے ہم اپنے قومی دشمنوں کے خلاف اب بھی حالت جنگ میں ہیں۔ پورے ملک میں ہنگامی حالت نافذ ہے۔ چنانچہ تفتیش کو خفیہ رکھا جانا چاہیے تھا۔

''تم جانتے ہو کہ مصر کے ہر خاندان کا فرزند اس آزادی کی جنگ میں شریک ہے۔ میں تم سے کہتا ہوں، پورے خلوص کے ساتھ، تصور کرو ان تمام خاندانوں کے کیا احساسات ہوں گے، جبکہ جنگ ابھی جاری ہے، اگر وہ جنگ میں شہادت پانے والے ایک نوجوان کی لاش کو ملک بھر میں گھسیٹے جاتے ہوئے دیکھیں اور یہ دیکھیں کہ کوئی اس شہید کو دفن کرنے کو تیار نہیں، محض اس لیے کہ کوئی تفتیش چل رہی ہے، یہ طے کرنے کے لیے کہ اس کی شناخت کیا ہے اور اس کا وارث کون ہوگا؟ اس تفتیش کا خفیہ رکھا جانا حب الوطنی کا معاملہ ہے، اس کی اہمیت جنگ سے کم نہیں۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ جنگ آخری ثابت ہوگی؟ تم کہہ سکتے ہو؟ کوئی کہہ سکتا ہے؟ یقیناً ہم بہت جلد دوبارہ لڑ رہے ہوں گے — اور مستقبل بعید میں بھی۔

''اگر کوئی نئی جنگ چھڑ جائے تو تمھاری تفتیش بہت نقصان دہ ثابت ہوگی۔ کیا تم تصور کر سکتے ہو کہ اگر لوگوں کو اس کی سن گن مل جائے تو ملک کے اندر اور باہر کی رائے عامہ پر اس کے کیا اثرات ہوں گے؟ ہماری جنگ، ہماری فتح، ہمارے سورما، سب پر اس کا سایہ پڑ جائے گا، اور اس کا فائدہ کس

Scanned with CamScanner

کو ہوگا؟ چوکیدار اور اس کے بیٹے کو؟ ہر مصری باشندے سے تقاضا کیا گیا تھا کہ کوئی نہ کوئی قربانی دے، اور چوکیدار نے اپنے بیٹے کی قربانی پیش کی، جس کے لیے وہ ہمارے شکریے کا مستحق ہے۔

''ہم نے معاملے پر تفصیل سے غور کیا ہے، اور اس بات کے حق میں مضبوط رائے سامنے آئی ہے کہ جو غلطیاں تم نے کی ہیں ان کے سلسلے میں تمھاری سرزنش کی جانی چاہیے، لیکن میں نے اس رائے کی مخالفت کی ہے، صرف اس وجہ سے کہ مجھے تمھاری نیک نیتی کا پورا یقین ہے، اور تم سے جو غلطیاں سرزد ہوئیں ان میں کسی دانستہ بدنیتی کا کوئی دخل نہیں۔ میرا فیصلہ یہ ہے: تم اپنی تفتیش کو بھول جاؤ۔ سرکاری رپورٹ مکمل کرو اور تمام کاغذات میرے پاس لے آؤ۔ میں نے تمام متعلقہ فریقوں کو ضروری اقدامات کرنے کے احکام جاری کر دیے ہیں۔''

اس نے تھیٹری انداز میں اپنا ہاتھ بلند کر کے لہرایا اور اونچی آواز میں کہا،''بات ختم ہوئی۔''

غیر مرئی ہاتھوں نے دروازے کو باہر سے کھول دیا اور اعلیٰ اہلکار نے کھلے دروازے کی طرف اشارہ کر کے واضح کر دیا کہ وہ مجھے رخصت کرنے کا خواہشمند ہے۔ میں جذبات سے لرزتا ہوا اپنے دفتر واپس پہنچا جہاں مجھے معلوم ہوا کہ سخت احکام پہلے ہی پہنچ چکے ہیں اور یہ اسی اعلیٰ اہلکار کے جاری کیے ہوئے ہیں جس کا نام، عہدہ اور شناخت میرے لیے ایک راز کی حیثیت رکھتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ جو پیغام رساں مجھے لینے آیا تھا وہ یہ حتمی ہدایات اپنے ساتھ لایا تھا۔

میں نے پایا کہ مامور نے ملزمین، جرم کا شکار ہونے والے اور گواہان، سب کو رخصت کر دیا ہے اور عمدہ کے بیٹے کو بھی رہا کر دیا ہے۔ اب میرے پاس صرف تفتیش کے کاغذات تھے جنھیں میں نے تالے میں بند کر رکھا تھا۔ میں نے ان تمام کاغذات کو جمع کیا اور انھیں کسی ایسی جگہ رکھنے کا فیصلہ کیا جہاں سے یہ گم نہ ہو سکیں، اس وقت تک جب تک میں اپنے افسرانِ بالا سے مل کر معاملہ ان کے سپرد نہ کر دوں۔

میرا اپنا موقف وہی تھا کہ تفتیش کو ہر حالت میں اس کے قدرتی نتیجے تک پہنچایا جانا چاہیے؛ میرا احساس تھا کہ جرم کی واضح نوعیت کے باعث ایسا کرنا لازمی ہے۔ مسئلہ صرف اس لفظ ''چاہیے'' کا تھا۔ کوئی اور چاہے اس لفظ کو روزمرہ زندگی میں استعمال کرنے کا حق رکھتا ہو، مجھے یہ حق یقیناً حاصل نہیں۔ میں نے کبھی مصری ''چاہیے'' پارٹی کی رکنیت کا فارم نہیں بھرا، اور ظاہر ہے میں اس پارٹی کی

رکنیت کی شرائط پوری نہیں کرتا۔ اپنے دفتر سے روانہ ہونے سے پہلے — اپنے افسران بالا سے ملاقات کو اگلے دن پر ملتوی کرتے ہوئے — میں نے تفتیش کے کاغذات کو اپنے بریف کیس میں رکھ لیا۔ میں نے انھیں اپنے ساتھ ساتھ لیے پھرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔

اچانک مرنے والے کا حقیقی باپ، چوکیدار، کہیں سے میرے سامنے آ گیا۔ وہ ایک بالکل مختلف آدمی تھا، جب میں نے اسے آخری بار دیکھا تھا تب سے اب تک کے مختصر وقفے میں وہ مکمل طور پر منقلب ہو چکا تھا۔ اس نے کہا وہ بہت اچھی طرح جانتا ہے کہ ہم عمدہ کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے۔ میں نے کہا کہ ایسی بات نہیں ہے، انصاف اپنی کارروائی مکمل کر کے رہے گا؛ اب اس ملک میں کوئی شخص قانون سے بالاتر نہیں۔ پھر میں یہ سوچ کر خود ہی ہنس پڑا کہ اس بیچارے کی کیا سمجھ میں آئے گا کہ میں کیا بات کر رہا ہوں۔ میں نے اس سے یونہی عام سے لہجے میں دریافت کیا کہ اسے کس نے بتایا کہ ہم عمدہ کے خلاف کچھ نہیں کر سکے۔ اس نے کہا کہ یہ بات بتانے والا کوئی ایک شخص نہیں؛ ہر شخص نے اسے اس بات کا یقین دلایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ، عزت مآب مامور کی ہدایات کی خلاف ورزی کرتے ہوئے جنھوں نے اسے کسی بھی حالت میں گاؤں سے باہر قدم نہ رکھنے اور کسی بھی صورت میں ضلعی انتظامیہ سے رابطہ قائم نہ کرنے کا حکم دیا تھا، وہ مجھ سے ملنے آیا ہے۔

چوکیدار نے بس دو باتوں کی التجا کی۔ اول، مرنے والے کے حقیقی باپ کی حیثیت سے وہ اس بات کا حقدار ہے کہ لاش اس کے حوالے کی جائے تاکہ وہ اسے دفن کر سکے؛ تب اسے معلوم رہے گا کہ اس کے بیٹے کا آخری مقام کہاں ہے اور مستقبل میں وہ مذہبی رسوم کی ادائیگی کر سکے گا۔ دوم، وہ رقم جو مرنے والے کے وارث کو ملنے والی ہے، اسے دی جائے۔ اس کے سوا اسے کچھ اور نہیں چاہیے، وہ صرف اتنے پر ہی مطمئن ہو جائے گا۔

مجھے اس شخص کی درخواستوں کے مبنی بر انصاف ہونے کا یقین تھا اور اس بارے میں ہدایات جاری کرنے میں مجھے کوئی رکاوٹ محسوس نہ ہوتی تھی، لیکن پھر بھی میں نے یہ مناسب سمجھا کہ مامور اور دیگر ذمے دار افسران کی رضامندی حاصل کر لوں۔ چنانچہ میں مامور کے پاس گیا، لیکن وہ اس موضوع کا ذکر آتے ہی بھڑک اٹھا؛ اسے ایک ایسے معاملے سے میرا دلچسپی لینا قطعاً پسند نہ آیا جو بند کیا جا چکا تھا۔ اس نے میری بات بڑھتی ہوئی بے صبری کے ساتھ سنی۔

Scanned with CamScanner

''میں نے سوچا تھا،'' آخرکار وہ بولا، ''کہ تم اب تک اس عجیب معاملے کو ختم کر چکے ہو گے جس نے جہاں تک میرا تعلق ہے ہمارے وطن کی فتح کا ذائقہ تلخ کر دیا ہے۔ رہا لاش کا معاملہ، تو یہ بات درست ہے کہ قانون کے مطابق وہ مرنے والے کے خاندان کے حوالے کی جانی چاہیے، لیکن یہ ایک ایسی غیر معمولی صورت حال ہے کہ اس میں قانون کی لفظی تعبیر پر اٹکے رہنا ضروری نہیں۔

''ہم لاش کس کے حوالے کریں؟ اگر عمدہ کے حوالے کریں تو چوکیدار احتجاج کرے گا — اس کے پاس ثبوت موجود ہے کہ مرنے والا اس کا بیٹا تھا۔ اور وہ اکیلا نہیں، پورا گاؤں اس کے ساتھ احتجاج میں اٹھ کھڑا ہو گا اور پھر حالات پر قابو پانا نہایت دشوار ہو گا۔

''دوسری طرف اگر ہم لاش چوکیدار کے حوالے کر دیں تو پھر عمدہ اور اس کے بیٹے کے خلاف اقدامات کرنا ضروری ہو جائے گا؛ اور اُس سے وہ معاملہ پھر سے کھل جائے گا جسے بالکل واضح اور غیر مبہم احکام کے تحت بند کر کے داخل دفتر کیا جا چکا ہے۔

''ان تمام باتوں کے مدنظر، فی الحال محفوظ ترین راستہ یہی ہے کہ لاش کسی فریق کے حوالے نہ کی جائے — کم از کم اس وقت تک جب تک لوگ ٹھنڈے ہو کر اس پورے قصے کو بھول بھال نہ جائیں۔ تب ہم لاش اس فریق کے حوالے کر دیں گے جو اپنی ملکیت ثابت کر دے گا۔ اس وقت تک لاش ہماری تحویل میں رہے گی۔ ہم نے اسے ایک محفوظ مقام پر دفن کر دیا ہے اور اس کی پوری طرح حفاظت کی جا رہی ہے۔ میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ اس وقت لاش کو سرکانے سے سوائے گڑبڑ کے اور کچھ حاصل نہ ہو گا، اور یہ خاصی خطرناک بھی ہو سکتی ہے۔ علاوہ اس کے، میں لاش کے ساتھ گاؤں میں داخل نہیں ہو سکتا — ایسی صورت میں خدا ہی جانے کیا ہو جائے۔ جہاں تک دوسری درخواست کا تعلق ہے میں اعلیٰ حکام سے رابطے میں ہوں اور ہدایات ملنے پر مناسب کارروائی کروں گا۔''

اس نے اپنے پاس رکھا ہوا سرکاری ٹیلیفون اٹھایا اور ایسی سرگوشی میں جو مجھے صاف سنائی دی، کسی اعلیٰ اہلکار کے سیکرٹری سے رابطہ قائم کرانے کی ہدایت کی۔ رابطہ جلد ہی قائم ہو گیا اور اس نے اپنی بات معذرتوں اور یقین دہانیوں سے شروع کی کہ اس معاملے میں یہ اس کا آخری استفسار ہے۔

''کون سا معاملہ؟'' ٹیلیفون کے دوسرے سرے سے سوال کیا گیا۔

''وہی چوکیدار کے جھوٹے دعوے کا معاملہ،'' اس نے جواب دیا، ''کہ اس کا بیٹا عمدہ کے بیٹے

کی عیوضی میں فوج میں بھرتی ہوا تھا اور جنگ میں مارا گیا۔''

میں نے منھ کھولا کہ معاملے کی وضاحت کروں لیکن اس نے مجھے اشارے سے چپ کرادیا۔ کچھ لمحوں تک وہ کچھ نہ بولا، بس دوسری طرف سے کی جانے والی متواتر بات سنتا رہا؛ اس کے بعد اس نے ایک بار پھر یقین دلایا کہ آئندہ اس کی طرف سے اس سلسلے میں کوئی استفسار نہیں ہوگا۔

ٹیلیفون رکھ کر اس نے اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھا۔ ''میں نے اعلیٰ ترین حکام سے بات کی ہے،'' وہ بولا، ''اور ان کو اس بات پر تعجب ہے کہ یہ سوال اٹھایا کیسے گیا۔ انھیں اس بات پر بھی تعجب ہے کہ ہم اب تک اس معاملے پر توجہ دے رہے ہیں، جبکہ اب تک ہمیں اس تمام تفتیش کو بھول جانا چاہیے تھا۔ سرکاری دستاویزات کے مطابق مرنے والے کا باپ عمدہ ہے، اور اس طرح وہی اس کو ملنے والی انعامی رقم کا وارث ہے۔

''چوکیدار کو اس وقت تک اس رقم میں سے ایک پائی بھی نہیں مل سکتی جب تک عمدہ اس کے لیے تیار نہ ہو؛ جب عمدہ کو رقم ملے تو وہ چاہے تو اسے چوکیدار کے حوالے کر سکتا ہے۔ یا وہ مختار نامہ تحریر کر کے رقم کی وصولی کے لیے اپنی جگہ چوکیدار کو نامزد کر سکتا ہے۔''

میں نے بحث کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے کہا کہ یہ اوپر سے آنے والے احکام ہیں اور ان پر چوں چرا کی گنجائش نہیں۔ ہم نے عمدہ سے رابطہ قائم کیا اور اس سے معاوضے کی رقم کی بابت دریافت کیا — کیا وہ اس رقم کے ایک حصے سے چوکیدار کے حق میں دستبردار ہونے کو تیار ہوگا؟ مجھے بہت تعجب ہوا جب اس نے صاف انکار کر دیا۔ کہنے لگا، یہ بہت معمولی رقم ہے، اس کی کل دولت کے مقابلے میں چند ٹکوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی، لیکن وہ اس کے ذرا سے حصے سے بھی دستبردار ہونے کو ہرگز تیار نہیں کیونکہ وہ اس جال میں پھنسنا نہیں چاہتا جو ہم اس کے لیے بچھا رہے ہیں۔ اگر وہ اس رقم سے دستبردار ہوا تو اس سے اشارہ ملے گا کہ اس نے واقعی کسی جرم کا ارتکاب کیا ہے؛ یہ ایک طرح کا اعتراف ہوگا جسے اس کے خلاف استعمال کیا جا سکے گا۔ اس نے ہمیں یقین دلایا کہ جب اسے یہ رقم مل جائے گی تو وہ خیرات کی مد میں چوکیدار کو کچھ نہ کچھ دے دے گا، لیکن صرف اس اکیلے کو نہیں۔ وہ تمام ضرورت مندوں اور غریبوں کی مدد کرے گا، لیکن اپنے پیسے سے، مرنے والے کی رقم سے نہیں، اور جہاں تک اس کا تعلق ہے یہ معاملہ یہیں ختم سمجھا جانا چاہیے۔

Scanned with CamScanner

میں نے مامور سے پوچھا کہ کیا میں جا کر چوکیدار کو اس فیصلے کی اطلاع دے سکتا ہوں، لیکن اس نے مجھے وہیں ٹھہرنے کی ہدایت کی۔ پھر اس نے چوکیدار کو طلب کیا جس نے اندر داخل ہوتے ہی اسے یوں سلام کیا جیسے وہ اس دنیا کی اہم ترین ہستی ہو۔ مامور نے اسے صاف لفظوں میں جو فیصلہ ہوا تھا سنا دیا۔ لاش کی حوالگی میں تاخیر ہوگی اور وہ فی الحال مامور ہی کی تحویل میں رہے گی۔ رہی معاوضے کی رقم کی بات، تو ہم نے عمدہ سے طے کر لیا ہے کہ اس سلسلے میں وہ اپنے ضمیر کے مطابق عمل کرے گا۔ عمدہ اسے خالی ہاتھ نہیں لوٹائے گا؛ چوکیدار کو صرف جا کر اس سے درخواست کرنی ہوگی۔ عمدہ ایک طویل تاریخ رکھنے والے عزت دار گھرانے سے تعلق رکھتا ہے، اور اس سے کبھی ناانصافی نہیں کرے گا۔

سابق چوکیدار نے ایڑیاں جوڑ کر سلیوٹ کیا اور غلو آمیز احترام کے لہجے میں کہا، ''مامور بے کے حکم کی تعمیل ہوگی۔''

چوکیدار وسیع و عریض دفتر سے باہر نکل گیا۔ الٹے پیر چلتے ہوئے وہ ایک اسکرین سے ٹکرا گیا اور اسے گراتے گراتے بچا۔ اس نے لپک کر گرتی ہوئی اسکرین کو سنبھال کر کھڑا کر دیا اور باہر چلا گیا۔

جب میں اپنے دفتر واپس پہنچا تو میں نے اسے دروازے کے باہر انتظار کرتے ہوئے پایا۔ اس نے مجھ سے قسم کھا کر یقین دلانے کو کہا کہ اس کے بیٹے کی لاش محفوظ مقام پر ہے۔ میں نے اسے یہ کہہ کر تسلی دی کہ حالات ٹھیک ہو جانے پر لاش اس کے حوالے کر دی جائے گی۔ یہ سب کچھ کہتے ہوئے مجھے ذرا بھی اندازہ نہ تھا کہ لاش کہاں دفن کی گئی ہے — یہ مصر کے بے شمار قبرستانوں میں کہیں بھی ہو سکتی تھی۔ اس نے کہا اسے خوف ہے کہ عمدہ اسے ایک پائی بھی نہیں دے گا، اور اپنی میز کے پیچھے کھڑے کھڑے مجھے اپنے گلے سے ایک اجنبی آواز نکلتی ہوئی سنائی دی، گزشتہ دنوں کی آواز جو اس وقت تک میرے پاس نہیں لوٹے گی جب تک میرے دل کا درد ختم نہیں جاتا۔ میں نے اسے آہستہ آہستہ سمجھایا کہ عمدہ انعام کے طور پر ملنے والی پوری رقم اس کے حوالے کر دے گا، اور اگر ایسا نہ ہو تو وہ مجھ سے شکایت کرے اور میں معاملے سے نمٹ لوں گا۔ میں نے کہا کہ میرے پاس اس بات کا اختیار موجود ہے کہ عمدہ کو رقم اس کے حوالے پر مجبور کر سکوں۔

اس آدمی نے مجھے دعائیں دیں، دل سے نکلنے والی پُرخلوص دعائیں۔ مجھے خوشی تھی کہ میں نے اسے تسکین پہنچائی ہے، جبکہ مجھے یہ وعدہ پورا کرنے کی اپنی صلاحیت پر ذرا بھی اعتماد نہ تھا۔ وہ مجھے

سیلوٹ کر کے رخصت ہوا، میری تسلیاں اس نے یوں پہن رکھی تھیں جیسے کسی گرتے ہوئے مکان پر کی جانے والی سفیدی۔

اپنی کرسی پر بیٹھ کر میں سوچنے لگا کہ اگر مجھے اس معاملے میں مرکزی مجرم قرار نہ بھی دیا جائے تو کیا میں اس میں شریک جرم نہیں ہوں۔ مجھے کسی اور کی دخل اندازی کے بغیر اپنا حکم جاری کر دینا چاہیے تھا، اور اس معاملے کو مصر میں موجود صورت حال سے الگ رکھا جانا چاہیے تھا۔ لیجیے، میں نے پھر ''چاہیے'' کا لفظ استعمال کرنے کی غلطی کی، یہ بھول کر کہ مجھے اس کے استعمال کا اختیار نہیں۔ اگر میں اپنا حکم جاری کر بھی دیتا تو کیا اس پر عمل درآمد ہوتا؟ مجھے اس پر شبہ ہے — لیکن اپنے اس عمل سے مجھے آنے والے دنوں میں کچھ دلی سکون اور عزت نفس تو حاصل رہتی۔

گھر واپس جاتے ہوئے میں نے خود کو پرسکون محسوس کیا۔ کم از کم کاغذات، دستاویزات اور قانونی شہادتیں تو میرے پاس ہیں۔ اور میں انھیں اپنے پاس ہی رکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں؛ کچھ بھی ہو جائے میں انھیں کبھی خود سے جدا نہیں کروں گا۔ میرے خاموش پیدل سفر اور شام کے سناٹے نے مجھے اس سکون کی یاد دلا دی جو مجھے ایسی راتوں کو محسوس ہوتا ہے جب میں نے کسی معاملے کی تفتیش مکمل کر لی ہو۔ میں خالی گلیوں میں چلتے ہوئے سرگوشی میں وہی جملہ دہراتا تھا جو میری ماں بہت پہلے میرے بچپن میں ادا کیا کرتی تھیں: ''اور یوں کہانی ختم ہوئی۔''

میں نے اس وقت بھی خود سے یہی سرگوشی کرنے کی کوشش کی: ''اور یوں کہانی ختم ہوئی۔'' پھر میں رک گیا اور اس فقرے کو دہرایا۔ پھر میں نے خود سے سوال کیا: ''کیا سچ مچ کہانی یہاں ختم ہوگئی؟''

میں نے ایک سوال کیا تھا، اور یہ سوال اس کا مستحق ہے کہ اس کا تسلی بخش، مکمل، حتمی اور قابل یقین جواب دیا جائے۔ چونکہ فی الوقت مجھے اس جواب کا علم نہیں، مجھے اس کی تلاش شروع کرنی ہو گی۔ اگر میں اپنی تلاش میں ناکام رہا تو اسے اپنے دل سے نکال کر مصر کی سرزمین کے طول و عرض میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دوں گا تاکہ وہ اپنا جواب خود تلاش کر سکے۔ اور جس وقت یہ سوال اپنے سفر پر روانہ ہو رہا ہوگا تو میں ایک اور سوال کو دسراہت کے لیے اس کے ساتھ کر دوں گا: ''کیا اسے اپنا جواب کبھی ملے گا؟''

❋❋

ناول

بیس سو گیارہ
محمد خالد اختر
Rs.70

گنگا جمنی میدان
اختر حامد خاں
Rs.120

دائرہ
محمد عاصم بٹ
Rs.100

نمبردار کا نیلا
سیّد محمد اشرف
Rs.60

تمَس
(ہندی ناول)
بھیشم ساہنی
ترجمہ: شہلا نقوی
Rs.180

قلبِ ظلمات
(انگریزی سے ترجمہ)
جوزف کونریڈ
ترجمہ: محمد سلیم الرحمٰن
Rs.80

بوف کور
(فارسی ناول)
صادق ہدایت
ترجمہ: اجمل کمال

دیمک
(بنگلہ ناول)
شرشیندو مکھوپادھیائے
ترجمہ: رفعت سروش
Rs.70

خیمہ
(عربی ناول)
میرال طحاوی
انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال
Rs.75

ہوئنیں بھر جا پاندیڑا
(اردو سے ترجمہ)
قرۃ العین حیدر
اردو سے ترجمہ: ولی رام ولبھ
Rs.240

پہلی بارش
(ہسپانوی ناول)
خولیو لیاما زاریس
انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال
Rs.95

نوکر کی قمیض
(ہندی ناول)
ونود کمار شکل
ہندی سے ترجمہ: عامر انصاری، اجمل کمال
Rs.100

سرزمینِ مصر میں جنگ
(عربی ناول)
یوسف القعید
انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال
(زیرِ طبع)

درخت نشیں
(اطالوی ناول)
اتالو کلوینو
ترجمہ: راشد مفتی
(زیرِ طبع)

شہنشاہ
(فارسی ناول)
ریشارد کاپوشنسکی
انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال
(زیرِ طبع)

Scanned with CamScanner

ارجمند آرا

بے خطر جیتے ہیں اربابِ ریا میرے بعد
رشید حسن خاں کی شخصیت کے چند پہلو

میرا یہ منصب نہیں کہ محقق، نقاد اور بہترین استاد، رشید حسن خاں کی علمی بصیرت اور ادبی فتوحات پر مضمون لکھوں۔ البتہ اپنے طالب علمی کے دور میں اور بعد میں بھی، ان سے جو رہنمائی، توجہ اور شفقت ملی اس کی طرف کچھ واقعات اور کچھ خطوط کی مدد سے اشارہ کر کے ان کی شخصیت کے چند پہلوؤں کا عکس اتارنے کی کوشش کروں گی۔ اس کے علاوہ میں نے ان کے تئیں اپنے شعبے کے رفقائے کار کے جو رویے دیکھے، اور دوسرے لوگوں سے ان کے بارے میں جو کچھ سنا، اس کی بنیاد پر یہ دیکھنے کی بھی کوشش کروں گی کہ اردو دنیا کے اُس 'علمی' حلقے میں خاں صاحب کی امیج کیا ہے جسے یونیورسٹی کی دنیا کہتے ہیں۔ خاں صاحب کے ساتھ میرا رشتہ استاد شاگرد کا سا رہا ہے، حالانکہ رسمی طور پر وہ میرے استاد نہیں تھے۔ لیکن یہ رشتہ اس سے بھی بڑھ کر تھا اور وہ میرا اتنا ہی خیال کرتے تھے جتنا اپنے بچوں کا کرتے رہے ہوں گے۔ اس لیے یہ میرا فرض بھی ہے اور مجھ پر ان کا قرض بھی کہ خاں صاحب کی شخصیت کے بارے میں اپنے محسوسات اور تاثرات میں ان کے مداحوں کو بھی شریک کروں۔ اس کوشش میں اگر کوئی کمی رہے تو اس کو میرا عجزِ بیان سمجھا جائے، خاں صاحب کی شخصیت کا سقم نہیں۔

اس عالم رنگ و بو سے رشید حسن خاں کو رخصت ہوئے ایک سال سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا (جس میں انھوں نے اپنے محدود وسائل کے ساتھ، اپنی زندگی میں بھرپور دلچسپی لی اور اسی طرح بسر کی جس طرح غالب نے کی تھی) لیکن ان کے دبدبے کا آج بھی یہ عالم ہے کہ ہر ہر لفظ پر قلم رک رہا ہے

Scanned with CamScanner

کہ اب گرفت ہوئی، بس اب گرفت ہوئی۔ اچھی طرح معلوم ہے کہ خاں صاحب کا نہ تو اب کوئی خط آنے والا ہے، نہ فون پر رابطے کا امکان ہے اور نہ ہی ملاقات کا ـــــ اور یوں میرا ہر لفظ ان کی گرفت سے آزاد ہے، مگر پھر بھی...!

خاں صاحب سے ملاقات سے پہلے میں نے ان کی چند کتابیں پڑھ رکھی تھیں۔ ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ لفظ بہ لفظ، تلاش و تعبیر کے چند مضامین، باغ و بہار اور فسانۂ عجائب کا ان کا مرتب کردہ پورا متن۔ حواشی اور ضمیمے لغت کی طرح سے حسب ضرورت دیکھے تھے۔ ان کی علمی بحثوں کو مکمل طور پر پڑھنے اور سمجھنے کا نہ تو مجھ میں صبر تھا اور نہ استطاعت۔ ۱۹۹۲ء میں جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں ایم اے کی طالب علم کے طور پر داخلے سے پہلے میں ان کی کئی کتابیں پڑھ چکی تھی۔ غالباً دوسرے سمسٹر میں ہم کو ایک ٹرم پیپر لکھنے کے لیے دیا گیا تھا جس میں سبھی طالب علموں کو فیض کے مجموعۂ کلام سرِ وادیِ سینا پر تبصرہ لکھنا تھا۔ فیض کی شاعری مجھے یوں تو بہت پسند تھی لیکن شاعری پر لکھنے کے لیے اس کا صرف پسند یا ناپسند ہونا کافی نہیں ہوتا، چنانچہ ضروری تھا کہ میرے پاس شاعری کو پرکھنے کے کچھ اصول اور کچھ معقول دلیلیں ہوں۔ لہٰذا تبصرہ کرنے سے پہلے سوچا کہ فیض کی شاعری پر چند مضامین پڑھ لیے جائیں تاکہ ذہن میں ایک خاکہ مرتب کیا جا سکے۔ اب یہ تو یاد نہیں کہ کون کون سے مضامین پڑھے تھے لیکن ان میں خاں صاحب کا وہ مضمون بھی شامل تھا جس میں انھوں نے فیض پر بڑھ بڑھ کر حملے کیے ہیں۔ یہ مضمون میرے نزدیک جرأت مندانہ بھی تھا اور مدلل بھی۔ اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں۔ میرے ذہن میں مضمون نویسی کا جو ایک دقیانوسی تصور تھا کہ پہلے خوبیاں گنواؤ، پھر خامیوں کی طرف اشارہ کرو، اس کے لیے مجھے لائن مل گئی۔ میں نے خاں صاحب سے تحریک پا کر انھی کے سے انداز میں سرِ وادیِ سینا میں نامانوس الفاظ، اجنبی تراکیب، دور از کار تشبیہوں اور استعاروں کی فہرست بنا ڈالی اور فیض کی زبان میں خوب مین میخ نکالی۔ ٹرم پیپر خورشید انور نے چیک کیا جو اُن دنوں جے این یو میں عارضی طور پر اسسٹنٹ پروفیسر تھے۔ خورشید نے جے این یو ہی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی تھی، ڈاکٹر اسلم پرویز کی نگرانی میں۔ وہ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا (CPI) کی طلبہ تنظیم آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے بڑے سرگرم رکن تھے اور پارٹی ممبر بھی تھے۔ یوں ان کی بنیادی تربیت میں طلبہ سے فاصلہ بنانا شامل ہی نہیں تھا اور ہم

طالب علموں کے ساتھ وہ اور ان کی بیگم، مینا کشی سوندریال، خاصے گھل مل کر رہتے تھے (میناکشی جے این یو ہی میں ہسپانوی زبان پڑھاتی ہیں)۔ ایک دن گوداوری ہوسٹل کے بس اسٹاپ سے 615 روٹ نمبر کی بس میں چڑھتے ہی خورشید سے ملاقات ہوگئی۔ ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد پوچھنے لگے، ''فیض کی شاعری پر کس کس کے مضمون پڑھے تھے؟'' میں ان کا منشا سمجھ گئی اور پہلے ہی جملے میں اقرار کرلیا کہ رشید حسن خاں صاحب کا مضمون بھی پڑھا تھا۔ ''ہوں!'' ایک لمبی سی ہنکار، اور پھر، ''اتنی damaging چیزیں پڑھنے کی ابھی تمھاری عمر نہیں ہے، اور اتنی قطعیت کے ساتھ دعوے کرنا تو بالکل مناسب نہیں۔'' میں شرمندہ سی ہوگئی۔ واقعی رشید حسن خاں کی نقل کرنا، جو علم کا سمندر ہیں، مجھ ایسی طالب علم کو کہاں زیب دیتا تھا۔ میں نے پڑھا ہی کیا تھا؟

انھی دنوں (ایم اے کے دوسرے سال میں) ہمارے شعبے (ہندستانی زبانوں کا مرکز) نے خاں صاحب کے تین خصوصی لیکچر علمِ بیان پر رکھے۔ اس سے قبل میں ان سے ان کی رہائش گاہ پر مل چکی تھی، اپنے دوست اطہر فاروقی کی وساطت سے۔ اطہر کا ان کے ساتھ نیازمندانہ رشتہ برسوں پرانا تھا۔ خیر، جے این یو میں ان کے لیکچر ہوے۔ تین دن میں تین گھنٹے کی یہ کلاسیں مجھے کم از کم تین برسوں کے مطالعے کا نچوڑ لگیں۔ ایم فل کے زمانے میں بھی انھوں نے تحقیق اور تدوین متن پر بھی لیکچر دیے۔ ان کے یہ لیکچر میرے ذہن پر ایک ایسے استاد کا نقش مرتسم کر گئے جس سے تعلیم حاصل کرنے کی بس حسرت ہی رہ جاتی ہے۔ بہت تھوڑے عرصے کے لیے ہی سہی، ان کی تدریس سے فیض اٹھانے والے طلبہ زندگی بھر ان کے ممنونِ کرم رہیں گے۔

ایک بار جو خاں صاحب سے شاگردی کا رشتہ استوار ہوا تو گویا عمر بھر کے لیے میں ان کی دست نگر ہوگئی۔ ایم فل کا موضوع انھوں نے طے کرایا اور بنیادی مواد فراہم کیا۔ میرے نگراں، مشفق استاد ڈاکٹر اسلم پرویز تھے۔ ان دونوں نے مل کر گویا طے کر دیا کہ مجھے کس موضوع پر اور کن خطوط پر کام کرنا ہے۔ یہی طریقہ پی ایچ ڈی کے لیے بھی اختیار کیا گیا۔ کون کون سی کتابیں پڑھنی ہیں، کون کون سی لائبریریاں مفید ہوں گی، نوٹس کس طرح لینے ہیں۔ مہینے دو مہینے میں خاں صاحب سے ضرور ملتی۔ وہ کام کی رفتار کا جائزہ لیتے اور مشورے دیتے۔ اچھا کام کرنے کے لیے حوصلہ بڑھاتے اور نصیحتیں کرتے۔ میں ان سے ملنے کے لیے اکثر دہلی یونیورسٹی کے گائر ہال جاتی تھی۔ گائر ہال ویسے تو ریسرچ

کے طالب علموں کا ہوسٹل ہے لیکن اس کا ایک حصہ انیکسی کی طرح ہے جس کے دس کمرے اساتذہ اور ریسرچ ایسوسی ایٹس کے لیے مخصوص ہیں۔ یہ حصہ 'ٹیچرز کورٹ' کہلاتا ہے۔ جن دنوں میں نے گائر ہال جانا شروع کیا، خاں صاحب اسی کے نو نمبر کمرے میں رہتے تھے۔ بعد میں (غالباً ۱۹۹۵ء میں) جب وہ اپنے آبائی وطن شاہجہاں پور چلے گئے تو ایک عرصے تک یہ سلسلہ رہا کہ وہ جب بھی دہلی آتے، اسی کمرے میں ٹھہرتے رہے۔ ان دنوں یہ کمرہ دہلی یونیورسٹی میں تاریخ کے استاد سید ظہیر حسین جعفری کے تصرف میں تھا۔ وہ روایت کے ایسے پاسدار تھے اور اس قدر محتاط رہتے کہ خاں صاحب کے پرانے معمولات میں کسی طرح سے مخل نہ ہوتے۔ خاں صاحب کے آنے کے بعد جعفری صاحب اپنے ہی گھر سے ایسے غائب ہو جاتے گویا وہ عارضی منتظم خانہ ہوں اور اب صاحب خانہ کے آنے کے بعد وہاں ان کا کوئی عمل دخل نہ رہا ہو۔ اس طرح خاں صاحب غالباً سنہ ۱۹۹۹ء یا ۲۰۰۰ء تک گائر ہال ہی میں ٹھہرتے رہے۔ جب اسلم پرویز صاحب نے اپنے مکان میں ایک مہمان خانہ تعمیر کرا لیا تو خاں صاحب ان کے مکان واقع ترکمان گیٹ میں ٹھہرنے لگے۔ اسلم صاحب نے یہ مہمان خانہ بطور خاص، خاں صاحب کی پریشانیوں اور سہولتوں کے مدنظر بنوایا تھا۔

خیر، یہ تفصیلات ضمنی تو تھیں لیکن بتانی بھی ضروری تھیں۔ ذکر تھا گائر ہال کا۔ خاں صاحب عموماً صبح کے وقت ملاقات کے لیے بلاتے تھے۔ اکثر اطہر فاروقی کو بھی بلاتے۔ ہم دونوں نو بجے تک وہاں پہنچ جاتے۔ خاں صاحب نہائے دھوئے، پینٹ بش شرٹ میں ملبوس، سینڈل یا جوتا پہنے، بالکل تیار ملتے۔ ناشتے کے لیے اپنے ساتھ میس میں لے جاتے۔ میس میں ان کی کرسی پر کوئی نہیں بیٹھتا تھا۔ وہ اپنی مخصوص جگہ جا بیٹھتے اور بیرر فوراً ہی پورے احترام کے ساتھ آ موجود ہوتا۔ جتنی دیر تک خاں صاحب میس میں ہوتے، مجھ کو ایک مخصوص رعبیلی فضا کا احساس رہتا۔ ناشتے سے لوٹ کر کام کی باتیں ہوتیں۔ اسی ملاقات میں اگلی ملاقات کا وقت بھی طے کر دیتے یا پھر کبھی اسلم صاحب کی وساطت سے یا اطہر فاروقی کے ذریعے کہلوا دیتے کہ آئندہ فلاں تاریخ کو فلاں وقت ملو اور کام دکھاؤ۔ گویا مقالہ لکھنا میری ذمے داری نہ ہو بلکہ خاں صاحب خود ریسرچ کر رہے ہوں۔

خاں صاحب کا کام کرنے کا اپنا انداز اور مزاج، بلکہ سخت ڈسپلن اور محنت شاقہ کے عادی، اور میں عام سی طالب علم جس کی ریسرچ میں بس واجبی ہی سی دلچسپی تھی — سو جھمیلے جو تھے زندگی کے۔

مجھے کیمپس کی اسٹوڈنٹس پالیٹکس میں بھی دلچسپی تھی، احتجاجی اور سیاسی مظاہروں میں نعرے بھی لگانے ہوتے تھے، سیاسی جلسوں میں شرکت بھی ضروری سمجھتی تھی، یونین کے الیکشن میں پوسٹر بھی چپکانے ہوتے تھے، اپنی تنظیم کے امیدواروں کے لیے ہر ہوسٹل اور ہر میس میں جا کر ووٹ بھی مانگنے ہوتے تھے اور دوستوں اور دوستیوں کے مطالبات بھی اپنی جگہ تھے۔ ایسے میں ریسرچ ویسرچ کا کام کتنی سنجیدگی سے ہوسکتا تھا، اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ حال یہ تھا کہ خاں صاحب میرے پیچھے پیچھے — کبھی یاد دہانی، کبھی تنبیہ، کبھی حوصلہ افزائی، کبھی ناراضگی۔ خاں صاحب جب شاہجہاں پور چلے گئے تو ان سے ملاقاتیں تو کم ہوگئیں لیکن اب باقاعدہ خط وکتابت کے ذریعے وہ میری رہنمائی کرنے لگے، بلکہ گارجین کی طرح ہر وقت میرے کام کا حساب رکھنے لگے۔ چنانچہ اس زمانے کے ان کے جو خطوط میرے پاس محفوظ ہیں (جو تعداد میں کم از کم پچاس ساٹھ ہیں)، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ کام کے معقول رفتار سے آگے نہ بڑھنے کے نئے نئے جواز میں ان کو لکھتی رہتی تھی۔ وہ کچھ دن صبر کرتے، برداشت سے کام لیتے اور پھر سخت جھلا جاتے۔ لیکن پھر سنبھلتے اور سمجھاتے کہ دیکھو، ہانڈی چولھا تمھارے بس کا رہا نہیں، اس کے مقابلے میں تحقیق آسان کام ہے، سو وقت گنوائے بغیر کر ڈالو۔ میں سعادت مندی سے اور سچے دل سے ڈسپلن قائم کرنے کا وعدہ کرتی، اس پر مضبوطی سے عمل پیرا ہونے کا عزم بھی کرتی، لیکن غالباً کوئی گڑبڑ ہو جاتی ہوگی جو گاڑی پھر سے پٹری سے اتر جاتی تھی۔ اب یہ تو یاد نہیں کہ مسلسل کام نہ کرنے کی کیا وجہیں میں ان کو لکھتی تھی لیکن ان کے خطوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ میں نے ان کو پریشان بہت کیا۔ پھر سچ یہ ہے کہ وہ جس رفتار سے مجھ سے کام لینا چاہتے تھے، وہ ہماری نسل کے طالب علموں کی استطاعت سے باہر تھا۔ اس ضمن میں چند خطوط سے کچھ اقتباسات پیش کروں گی جن سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جس کسی طالب علم میں وہ ذرا بھی صلاحیت محسوس کرتے، اس کو پڑھنے لکھنے کی راہ پر لگانے کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے۔ علم وادب کے فروغ سے ایسی دلچسپی رکھنے والا استاد اور اردو کے سرمائے کو محفوظ کرنے کی ایسی لگن اور اردو کی بقا کے لیے ایسا درد رکھنے والا مجاہد اب شاید ہی کوئی پیدا ہو۔ ۱۱ر ستمبر ۱۹۹۶ء کے خط میں لکھتے ہیں:

> تمھارا خط ملا تھا، جس سے معلوم ہوا کہ اب تک بہت کچھ کرتی رہی ہو، یعنی کچھ کام نہیں کیا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تم کو کام نہ کرنا آتا ہے۔ یہ بڑی صفت ہے، سب کو نہیں

ملتی.... میں ۱۶ ستمبر کو دہلی میں ہوں گا مگر اسی دن بمبئی روانہ ہو جاؤں گا.... بمبئی سے واپس آکر اپنے حاضری کے رجسٹر سے تمھارا نام کاٹنے پر غور کروں گا۔ اسلم صاحب سے دہلی میں میں نے ۶ ستمبر کو فون پر بات کی تھی۔ انھوں نے بتایا کہ تمھارا خانہ اب تک خالی ہے کام کے لحاظ سے۔ یوں مجھے صورتِ حال کا زیادہ علم ہو سکا۔

میں نے اس خط کا جواب گھبرا کر لشتم پشتم دیا ہوگا، بمبئی کے پتے پر؛ ڈسپلن میں رہنے کا وعدہ بھی کیا ہوگا اور کچھ مجبوریاں بھی بتائی ہوں گی کیونکہ اس کے جواب میں جو خط انھوں نے بمبئی سے ۳۰ ستمبر کو بھیجا اس کا موڈ مختلف ہے۔ اس میں انھوں نے پی ایچ ڈی کے ایک باب کے لیے بہت سی کتب کے حوالے لکھے، اس کی نہج کا تعین کیا اور وقت بھی طے کر دیا کہ ایک مہینے میں یہ باب ختم کر لو۔ مگر میرے مزاج کو جتنا جانتے تھے، اسی حساب سے آخر میں نصیحتیں بھی کر ڈالیں:

ایک بات سمجھ لو۔ اس بار کاہلی یا مصروفیت کا کوئی عذر قابل قبول نہیں ہو سکے گا۔ رات تھوڑی ہے اور سوانگ بہت۔ دل لگا کر کام کرو اور پیر توڑ کر بیٹھو۔ آنکھوں کا تیل ٹپکائے بغیر کچھ نہیں ہوتا۔ باقی فرائض ادا کرنے کو عمر پڑی ہے۔ مثل مشہور ہے: موچی کو عرش پر بھی بیگار ہی کرنا ہوگی۔ وہی احوال ان سب مسلمان لڑکیوں کا ہے جن کا تعلق چھوٹے شہروں یا علاقوں سے ہے: مشقِ سخن بھی اور چکی کی مشقت بھی؛ اس لیے اس سلسلے میں مناجاتِ بیوہ قسم کی فریاد بیکار ہے۔ اس کا کچھ حاصل نہیں۔

اس کے جواب میں میں نے ان کو مقالے کا خاکہ اور غالباً کچھ صفحات روانہ کر دیے تھے۔ خاں صاحب بمبئی سے ۲۵ اکتوبر کو دہلی لوٹے تھے اور ۲۶ کی صبح انھوں نے مجھے گائر ہال بلایا تھا۔ اس کے بعد ان سے اگلی ملاقات ۵ دسمبر کو اردو گھر میں ہوئی اور پھر دسمبر ہی کے آخری عشرے میں بھی جب وہ غالب سیمینار کے موقعے پر غالب انسٹی ٹیوٹ آئے۔ اس دوران میں نے کچھ نہ کچھ کام ضرور کیا ہوگا کیونکہ اپریل ۱۹۹۷ء تک ان کا کوئی تنبیہی خط مجھے نہیں ملا۔ ان دنوں ویسے خاں صاحب بھی بیمار تھے اور میرے والد بھی، جس کی وجہ سے میں تقریباً ہر ہفتے یا دو ہفتے میں، دو دن کے لیے گھر چلی جاتی تھی۔ خاں صاحب کے ٹیسٹ بمبئی میں ہو رہے تھے اور علاج بھی، جس کے لیے انھیں بار بار بمبئی جانا پڑتا تھا۔ جولائی ۱۹۹۶ء میں وہ بمبئی میں تھے، پھر ستمبر میں گئے اور اکتوبر میں لوٹے۔ ڈاکٹر نے دواؤں کا چھ

Scanned with CamScanner

مہینے کا کورس تجویز کیا تھا۔ مئی یا جون ۱۹۹۷ء میں ان کو پھر جانا پڑا۔ فروری، مارچ ۱۹۹۸ء کا عرصہ انھوں نے بمبئی میں گزارا اور پھر اگست، ستمبر ۱۹۹۸ء میں ایک بار پھر ان کے بہت سے چیک اپ ہوئے۔ ریڈیوگرافی، سی اے ٹی اسکین، خون کے کئی طرح کے ٹسٹ اور نہ جانے کیا کیا الم غلم جس میں ان کے ہزاروں روپے خرچ ہوئے۔ ۱۹ راپریل ۱۹۹۷ء کو شاہجہاں پور سے لکھا:

...تمھاری قدر تمھاری ذہانت کی بنا پر کرتا ہوں۔ تمھاری جذباتیت کی یوں قدر کرتا ہوں کہ ایسا شخص اور جو بھی ہو، منافق نہیں ہو سکتا اور یہ صفت اب کم یاب ہے...بس ذرا سی بات یہ ہے کہ تم میں استقامت کی کمی ہے۔ اگر تم ایک بار اس صفت کو پیدا کرلو تو تمھارا کام بہ آسانی ہو سکتا ہے۔ عارضی طور پر ہی، دل کو ذرا سخت کرلو اور آنکھوں کو بے نم۔ رونا محرم زدہ لوگوں کو راس آتا ہے، تم کو کیوں راس آئے.... میرا دہلی آنا اب ذرا سا وقت طلب ہے۔ آؤں گا تو ضرور مگر ایک دو ماہ کے بعد، جب تم یہ لکھو گی کہ تم نے سو صفحے مکمل کر لیے ہیں۔ جب تک یہ نہیں لکھو گی، ادھر کا رخ نہیں کروں گا۔ اگر آؤں گا بھی تو تم کو مطلع نہیں کروں گا۔ جب تم میری بات نہیں مانتی ہو تو میں تمھاری بات کیوں سنوں اور کیوں مانوں۔ جب تم خط لکھو گی، تو خواہ وہاں کوئی کام ہو یا نہ ہو، میں دو چار دن کے لیے آجاؤں گا، ضرور آؤں گا....تم اگر یہ چاہتی ہو کہ مجھے تمھاری طرف سے تکلیف پہنچے اور میرا دل دکھے، تو ٹھیک ہے کام نہ کرو۔ اگر نہیں چاہتی ہو تو کام میں لگ جاؤ۔

یہ وہ دن تھے جب میرے والد زیادہ ہی بیمار تھے، چنانچہ کام پھر رکا رہا۔ کچھ اپنی الجھنوں کے سبب اور کچھ خوف کے مارے میں نے خاں صاحب کو خط لکھنا بھی چھوڑ دیا۔ غالباً اسی سے پریشان ہو کر انھوں نے ۳۰ رجون ۱۹۹۷ء کو لکھا: ''تم کہاں کھو گئی ہو؟ کیا پولیس میں گم شدگی کی رپورٹ لکھانا ہی ہوگی؟ کام نہ کرو، خط تو لکھو۔'' خدا خدا کر کے اپریل ۱۹۹۸ء تک میں نے دیوانِ بیان کی تدوین کا خاصا کام نمٹا لیا اور مقدمے کے تین ابواب خاں صاحب کے ملاحظے کے لیے بھیج دیے۔ دیوانِ بیان کا تصحیح شدہ متن بھی اگست تک بھیج دیا جو چار خطی نسخوں کی مدد سے تیار کیا گیا تھا۔ ایک بہت ہی ناقص مطبوعہ نسخہ بھی عبرت کے لیے میرے سامنے تھا۔ ثاقب رضوی کا مرتبہ یہ نسخہ تدوین متن کی بدترین مثال تھا اور رشید صاحب کا خیال تھا، اگر یہ کام سوویت یونین میں ہوا ہوتا تو اس کے مرتب کو ضرور

سائبیریا بھیج دیا جاتا۔ اگست میں خاں صاحب بمبئی میں قیام پذیر تھے۔ وہیں انھوں نے یہ تمام کام چیک کیا اور ستمبر کے پہلے ہفتے میں واپس بھیج دیا۔ لیکن انھی دنوں ایک بڑا سانحہ یہ ہوا کہ میرے والد ۱۷ ستمبر ۱۹۹۸ء کو فوت کر گئے اور اس غم نے پھر سے میرے دل کو ریسرچ کے کام سے اچاٹ دیا۔ والد کے انتقال کے چند مہینے بعد، فروری ۱۹۹۹ء میں مجھے قومی اردو کونسل میں ماہنامہ اردو دنیا کی ادارت کا کام مل گیا اور ایک بار پھر زندگی معمول کی طرف لوٹنے لگی۔ میں نے نوکری کی اطلاع دیتے ہوئے خاں صاحب کو دفتر کے کام کاج میں زیادہ مصروف ہو جانے کے بارے میں ضرور لکھا ہوگا کیونکہ ۲۵ فروری ۱۹۹۹ء کے اپنے خط میں انھوں لکھا: ''آج ہی تمھارا خط ملا۔ یہ پڑھ کر اطمینان ہوا اور مسرت بھی کہ تم کو زیادہ کام دیا گیا ہے۔ یہ قاعدہ ہے سدا کا کہ گریز پا قیدی کو ہتکڑیوں کے ساتھ بیڑیاں بھی پنھائی جاتی ہیں۔'' بہرحال خاں صاحب نے مزید ابواب کا تقاضا نہیں کیا۔ میں بھی دفتری کام کاج سیکھنے میں بے طرح مصروف ہوگئی۔ مارچ میں خاں صاحب نے دو خط لکھے، میں نے جواب نہیں دیا، وجہ یاد نہیں۔ انھوں نے پریشان ہو کر تیسرا خط لکھا ۲۵ مارچ کو۔ ان کا اگلا خط یکم مئی کو بمبئی سے ملا جس میں ۲۱ مئی کو دہلی پہنچنے کی اطلاع دی گئی تھی۔ اسی دن ان کو شاہجہاں پور کے لیے دوسری ٹرین سے روانہ ہونا تھا۔ میں ملنے کے لیے ضرور گئی ہوں گی کیونکہ یہ معمول بن گیا تھا کہ اگر خاں صاحب دہلی سے گزریں اور چند گھنٹے کا وقت ان کے پاس ریلوے اسٹیشن پر گزارنے کے لیے ہو تو میں ان سے ملنے ضرور چلی جاتی تھی، اپنے آنے کی اطلاع وہ خواہ اطہر کو دیں یا مجھے۔ خیر پی ایچ ڈی کے کچھ ابواب میں نے ان کو ستمبر ۱۹۹۹ء میں، کچھ جنوری ۲۰۰۰ء میں اور آخری باب جون تک بھیج دیا۔ ۲۴ جنوری کے اپنے خط میں انھوں نے لکھا: ''آج تمھارا پیکٹ ملا۔ تم نے بہت اچھی عبارت لکھی ہے۔ میرا جی خوش ہوا۔ سب کام کی باتیں ہیں، فضول بات کوئی نہیں۔ حوالے بھی سب مناسب ہیں۔ اب جلدی سے اس کا دوسرا حصہ بھیجو، جو آخری حصہ ہوگا۔'' ۲۸ جنوری تک ان کو دوسرا پیکٹ بھی مل چکا تھا۔ انھوں نے خوش ہو کر لکھا: ''تم تو اب واقعی کام کرنے لگی ہو۔ خدا برکت دے اور مزید توفیق بھی کہ تم 'اپنے چندنامہ' بھی اسی طرح مکمل کر لو۔ تین بار آمین کہو۔'' اور اس طرح خدا خدا کر کے پی ایچ ڈی کا کام ختم ہوا۔ سارا کام ٹائپ کرا کے ہی بھیجتی تھی، یوں تصحیح کرا کے اسلم صاحب کو دکھانے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ کام میں جو کمزوری اور کمیاں رہ گئی تھیں انھیں اسلم صاحب کے مشوروں کے مطابق

Scanned with CamScanner

درست کر کے ڈگری کے لیے جمع کر دیا۔

اس کے بعد میں نے تدوین کے کسی کام کو ہاتھ لگانے کی ہمت نہیں کی۔ خاں صاحب مشورے دیتے رہے کہ فلاں کام کرلو یا پھر فلاں کام، آسانی سے ہو جائے گا، سارے سورسز لکھ بھیجوں گا، وغیرہ۔ مگر اب میں کہاں ان کے جھانسے میں آنے والی تھی، سو نسبتاً آسان کام پکڑ لیا، یعنی ترجموں کی طرف متوجہ ہوئی۔ خط و کتابت بھی بس واجبی سی رہ گئی کیونکہ اس کی جگہ اب فون لے چکا تھا۔ فون کا کوئی ریکارڈ تو ہوتا نہیں، باتیں بھی یاد نہیں رہتیں، سو ان دنوں کی یادیں بڑی دھندلی سی ہیں۔ اردو کونسل کی نوکری چھوڑ کر جب نومبر ۲۰۰۲ء میں دہلی یونیورسٹی میں اردو پڑھانے کا کام ملا تو اس کی اطلاع بھی فون پر ہی دی۔ جے این یو کے اپنے سابق استاد، ڈاکٹر اشفاق محمد خاں کی عیادت کے لیے جب دسمبر میں لکھنؤ گئی تو پھر خاں صاحب سے ملنے کے لیے شاہجہاں پور کا بھی پروگرام بنا لیا۔ ان دنوں خاں صاحب زٹل نامہ (کلیاتِ جعفر زٹلی) مرتب کر رہے تھے اور غالب کی فرہنگ پر بھی کام کر رہے تھے۔ ان کے گھر پر دو دن کے قیام کی یادیں آج بھی میرے ذہن میں تازہ ہیں۔ ان کی دونوں بہویں بے حد محبت سے ملیں۔ انھوں نے ہر طرح سے آرام کا خیال رکھا۔ شام کو ہم لوگ خاں صاحب کی اجازت سے شاہجہاں پور کے ایک معروف پارک (نام تھا غالباً شہید پارک) گھومنے گئے۔ اجازت لینے کا کام ان کے پوتے سعود کو سونپا گیا جو اس وقت چھ سات برس کا بڑا ہی شریر قسم کا پیارا سا بچہ تھا۔ خوب چاٹ پکوڑے کھائے گئے۔ بچے اپنے جیب خرچ سے میری تواضع کرنا چاہتے تھے، سو کی۔ بڑا لطف آیا، اور یہ سوچ کر اور زیادہ مزہ آیا کہ خاں صاحب نے بچوں پر بھی ویسے ہی رعب جما رکھا ہے جیسے وہ ہم جیسے نیازمندوں پر جماتے ہیں۔ لیکن میں نے گھر میں دیکھا کہ وہ اپنی بیٹھک میں بیٹھ کر کام کرتے ہوئے ہر بات سے بے نیاز ہونے کا بہانہ ضرور کرتے ہیں، بچوں کی شرارتوں سے چشم پوشی کرتے نظر آتے ہیں اور یہ تاثر دیتے ہیں کہ انھیں اپنے علمی کاموں کے علاوہ کسی چیز سے کوئی دلچسپی نہیں؛ لیکن اپنی بے نیازی اور لاپروائی کے پیچھے میں نے ان کو چپکے سے مسکراتے ہوئے دیکھا، اپنی پوتیوں اور پوتے کے لیے ان کی آنکھوں میں بے پناہ محبت دیکھی اور فخر اور خوشی کا احساس۔ تب میری سمجھ میں آیا کہ سعدیہ اور صدف اپنے دادا کی اس قدر کیوں گرویدہ ہیں، سعود کیوں اس قدر خودسر اور شرارتی ہے اور ساری ضدیں دادا سے پوری کراتا ہے، ان کی بہویں کیوں پاپا کے

Scanned with CamScanner

آگے پیچھے گھومتی ہیں اور ان کی خدمت میں ہر وقت حاضر رہنا چاہتی ہیں۔ مجھے اندازہ تو تھا کہ اپنی آل اولاد سے خاں صاحب کو بہت محبت ہے لیکن اس کی شدت اور رشتوں کی مضبوطی کا احساس ان کے گھر میں رہ کر ہی ہوا۔ خیر، شاہجہاں پور سے بہت سی محبتیں سمیٹ کر میں دہلی واپس لوٹی۔ خاں صاحب سے زٹل نامہ کے پروف بھی لے کر آگئی کہ پہلا پروف میں پڑھ دوں گی تاکہ وہ اتنے دنوں میں کوئی دوسرا کام کر لیں۔ ان دنوں خاں صاحب غالب کی فرہنگ پر کام کر رہے تھے۔ ہزار ہا کارڈ تیار تھے۔ یہ سب کام بھی انھوں نے مجھے دکھایا۔ ان کے سامنے جتنے منصوبے تھے، اتنی عمر نہیں تھی، اور اس کا انھیں اچھی طرح احساس تھا، اس لیے وہ اپنے وقت کا ہر لمحہ صرف اور صرف اہم ترین کاموں کے لیے وقف کرنا چاہتے تھے۔ شاہجہاں پور سے میرے واپس آنے کے کچھ دن بعد خاں صاحب نے ۱۴؍جنوری ۲۰۰۳ء کو جو خط بھیجا اس میں لکھا: ''یہاں بچے بڑے سب تم کو پوچھ رہے ہیں۔ تم خوب آئیں کہ دن بھر میں سب کو جادو کی چھڑی سے اپنا والہ وشیدا بنالیا۔ یہ کام تو میں ستر برس میں نہیں کر سکا۔ جیتی رہو اور خوش رہو اور فون کرتی رہو۔'' میں واقعی بھابھیوں اور بچوں کے ساتھ ایک انوٹ رشتے میں بندھ گئی تھی۔ آج خاں صاحب نہیں ہیں، لیکن اس چھوٹی سی ملاقات کے سبب ان کا گھر آج بھی میرا اپنا گھر ہے، اس کی یادوں میں آج بھی محبت کی وہی پرانی حرارت ہے۔

اس سفر کے بعد کے خاں صاحب کے صرف چھ خط میرے پاس محفوظ ہیں۔ زیادہ تر باتیں فون پر ہی طے ہو جاتی تھیں۔ جب میں رالف رسل کی آپ بیتی کے ترجمے کو فائنل کر کے جولائی ۲۰۰۴ء میں لندن سے لوٹی تو خاں صاحب کو طویل خط لکھا تھا ۲۱؍جولائی کو، پورے پانچ صفحے، فل اسکیپ۔ اس میں رالف کے ساتھ قیام کی تفصیلات لکھی تھیں۔ خط کے خاتمے تک آتے آتے مجھے اپنی محنت کا خیال آیا اور خط کو فوٹو کاپی کرالیا۔ یوں یہ خط محفوظ رہ گیا۔ اسی کی بنیاد پر میں نے رالف رسل پر ایک مضمون لکھا جو ان کی آپ بیتی کے ترجمے جو ئندہ یابندہ کے ساتھ کراچی سے اجمل کمال نے شائع کیا ہے۔ خاں صاحب بہت خوش ہوئے تھے خط پڑھ کر اور ۲۶؍جولائی کو جواب میں لکھا تھا کہ پچھلا کفارہ ادا ہو گیا۔ ساتھ ہی یہ بھی اطلاع دی تھی کہ وائرل نے بری طرح پکڑ لیا تھا، ساری طاقت نچوڑ لی اور نقاہت بیان سے باہر ہے۔ خاں صاحب کا ۱۰؍اگست ۲۰۰۵ء کا خط ایسا تھا جس نے مجھے اداس کر دیا تھا اور مضطرب بھی۔ شاید دل کے کسی گوشے میں کسی خدشے نے سر ابھارا تھا۔ انھوں نے

Scanned with CamScanner

لکھا تھا:

عزیزہ ارجمند! دن ہو گئے کہ نہ تمھاری آواز سنی اور نہ تحریر دیکھی؛ یعنی کان بھی محروم اور آنکھیں بھی شکوہ گزار۔ میں بھی ان دنوں بس یوں ہی سا رہا اور مرزا صاحب کے اس شعر کو دہراتا رہا:

اب اپنے ختمِ سفر میں کچھ ایسی دیر نہیں
جو دیر ہے تو فقط تھک کے بیٹھ جانے کی

مگر قلم ہے کہ کسی آواز کو سنتا ہی نہیں، چلے جاتا ہے۔

تم کیسی ہو؟ آج کے دونوں شمارے مل گئے تھے، رسید نہیں بھیج سکا، اس کی معذرت۔ ترجمہ (رالف رسل کی آپ بیتی کا) دیکھ کر جی خوش ہو گیا اور دل سے دعائیں نکلیں۔ جیتی رہو اور خوش رہو۔

اس کے بعد کا خط ۸ رستمبر کا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بیماری اپنی جگہ، موسم کی زیادتی، شدید گرمی اور بجلی کی کٹوتی نے خاں صاحب کو بے حال کر رکھا تھا، لیکن پریشانیوں کے باوجود خاں صاحب کی شگفتگی ویسے ہی برقرار تھی۔ پورا خط نقل کرتی ہوں:

شاہ جہاں پور، ۸ ستمبر (ستمگر) ۲۰۰۵ء

ارجمند! دعائیں (با اثر ہوں گی یا بے اثر، اس کا احوال مجھے نہیں معلوم)۔

فارم اور پاس بک بھیج رہا ہوں۔ انھیں احتیاط سے رکھ لو اور اکتوبر میں فارم جمع کر دینا اور تبھی پاس بک مکمل کرا لینا اور رجسٹری سے موٹے لفافے میں رکھ کر بھیجنا۔

۱۴ گھنٹے کی بجلی کی کٹوتی نے چین آرام کو حرام بنا دیا ہے۔ کس کو کیا کہا جائے، سبھی اللہ میاں کے بندے ہیں اور انھی کی طرح بے نیاز۔ یہ دن بھی یاد رہیں گے۔ کسی دن فون کر لینا تو اطمینان ہو جائے گا کہ میرا لفافہ تم کو مل گیا — رشید حسن خاں

اپنی پنشن کے سلسلے میں ایک فارم ہر سال اکتوبر کے مہینے میں بینک میں جمع کرانا ہوتا تھا جو اس بات کا ثبوت ہوتا تھا کہ پنشنر ابھی زندہ ہے۔ مندرجہ بالا خط میں اسی فارم کا ذکر ہے۔ پاس بک جب پُر کرا کے بھیجی تو گھبرا کر انھوں نے فون کیا کہ شاید کوئی غلط اینٹری ہو گئی ہے۔ ں میں تقریباً تیرہ ہزار

Scanned with CamScanner

روپے زیادہ جمع ہو گئے ہیں، اور اتنے روپے تو میرے کھاتے میں کبھی جمع نہیں رہے۔ مجھے ہنسی بھی آئی اور دکھ بھی ہوا۔ تیرہ ہزار روپے کیا واقعی اتنی بڑی رقم ہے کہ یکمشت ان کے ہاتھ میں نہ رہے۔ میں نے یونیورسٹی جا کر معلوم کیا تو پتا چلا کہ arrears جمع ہو گئے تھے۔ خاں صاحب کو بتایا تو بڑے خوش ہوئے کہ روپوں کی بڑی ضرورت تھی، اور یہ غیبی مدد کی طرح پہنچے۔

خاں صاحب کو دہلی سے اپنا کھاتہ چلانے میں بڑی دقت ہوتی تھی۔ پنشن اسٹیٹ بینک آف انڈیا کی دہلی یونیورسٹی شاخ میں آتی تھی۔ اگر خاں صاحب ہر مہینے شاہجہاں پور کے اپنے بینک میں چیک ڈالتے تو اس کے کلیئر ہونے میں ہفتہ بھر سے زیادہ لگ جاتا اور گھر کا نظام بگڑ جاتا۔ گزشتہ کئی برسوں سے اس کا علاج یہ کیا گیا تھا کہ میں مہینے کے آخر تک تین ہزار روپے کا ڈرافٹ ان کو بھیج دیتی تھی تاکہ پہلی تاریخ تک انھیں پیسہ مل جائے، خاں صاحب سال بھر کے ایڈوانس چیک مجھے بھیج دیتے تھے اور میں ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو یا اس کے بعد ایک چیک اپنے کھاتے میں جمع کرا دیتی تھی۔ اس سے پہلے ان کے لیے یہ کام حبیب خاں کرتے تھے جو انجمن ترقی اردو ہند میں کتاب دار تھے۔ ان کے انتقال کے بعد انھوں نے اپنی پریشانی کا ذکر کیا تھا تو میں بخوشی اس خدمت کے لیے تیار ہو گئی تھی۔ غالباً ۲۰۰۱ء تک یہ سلسلہ چلا تھا، پھر انھوں نے کوئی اور انتظام کر لیا۔ کچھ عرصے سے میں نے انھیں اس بات پر آمادہ کر لیا تھا کہ وہ اے ٹی ایم کارڈ بنوالیں تاکہ بینک جانے کی جھنجھٹ سے نجات ملے۔ ویسے بھی اے ٹی ایم مشینیں اب سب شہروں اور قصبوں میں آتی جا رہی تھیں۔ آخری خط جو انھوں نے مجھے ۱۷ فروری ۲۰۰۶ء کو لکھا، انھی سب معاملات سے متعلق ہے۔ لیکن یہ چونکہ ان کا آخری خط ہے اس لیے تبرک کے طور پر پورا نقل کرتی ہوں:

عزیزہ ارجمند! بہت سی دعائیں۔

ATM کے کاغذ اور کارڈ بھیج رہا ہوں۔ احتیاطاً انھیں متعلقہ فرد کو دے دینا۔ بنک کی پاس بک اکتوبر میں بھیجوں گا، اسی وقت "ابھی زندہ ہوں" والا فارم بھی بھیجوں گا۔ مگر وہ فارم میرے پاس نہیں: جلدی نہیں، اکتوبر تک کسی وقت بھیج دینا۔ ہاں بس یہ ضرور کرنا کہ بیلنس معلوم کر کے مجھے فون پر بتا دینا۔ DA کی کوئی زائد قسط شاید ملی ہو مجھے بھی۔ اگر ملی ہو گی تو کام آجائے گی۔

کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ تم وہاں نہ ہوتیں تو میرا کیا احوال ہوتا! کبھی ماننا ہی پڑتا ہے کہ کوئی ان دیکھی طاقت کہیں ہے ضرور جو مجھ جیسے ناکارہ لوگوں کے کام بنانے کے لیے ایسے وسیلے پیدا کر دیتی ہے۔ ہائے یگانہ، کیا بات کہی ہے:

شش جہت میں ہے ترے جلوۂ بے فیض کی دھوم
کان مجرم ہیں مگر آنکھ گنہ گار نہیں

جیتی رہو اور شاد کام رہو ــــ رشید حسن خاں

یہ خط مجھے غالباً بائیس تئیس فروری کو ملا ہوگا۔ چھبیس فروری کی صبح پانچ بجے خاں صاحب کے بیٹے، خالد حسن خاں کا فون آ گیا کہ پاپا نہیں رہے، رات کے تیسرے پہر، دو بجے ان کا انتقال ہو گیا۔ ایک دن پہلے تک ٹھیک تھے، بلکہ اس دن، دن میں اطہر فاروقی سے دیر تک فون پر بات چیت بھی ہوئی تھی۔

دہلی یونیورسٹی کے اردو شعبے میں تعزیتی جلسہ ہوا، مجھ سے بھی اظہارِ خیال کے لیے کہا گیا۔ مجھے یاد آیا کہ ہفتہ بھر ہی گزرا ہوگا جب خاں صاحب سے فون پر بات ہوئی تھی اور وہ اپنے بینک کے کھاتے میں تیرہ ہزار کی اس رقم پر بوکھلائے ہوئے تھے جو ان کے خیال میں غلطی سے کہیں سے آ گئی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ ان کی باتوں میں جو کھرا پن تھا، جو عالمانہ دبدبہ تھا، جو قطعیت تھی، جو اعتماد تھا وہ بس ایسے ہی ذی علم اور اپنے کام سے ایسے ہی والہانہ وابستگی رکھنے والے شخص میں ہو سکتا تھا جیسے خاں صاحب تھے۔ علم کی دیوی جس کے قدموں کی باندی ہو، اسے بھلا روپوں سے کیا غرض اور کیوں غرض ہو؟ میں نے اس جلسے میں ان کی شخصیت کے حوالے سے تھوڑی سی باتیں کیں، ان کی نوازشوں اور شفقتوں کا ذکر کیا اور فون پر ان سے آخری بات چیت کا ذکر کر کے بیٹھ گئی۔ جتنی باتیں کیں ان سے زیادہ پر غور کرتی رہی، دیر تک غور کرتی رہی۔ کیسی ستم ظریفی تھی ہمارے سماجی نظام کی، تہذیبی قدروں کے زوال کی ــــ ایک پروفیسر ہر مہینے چالیس ہزار کی تنخواہ اپنے ضمیر پر شمہ بھر یہ بوجھ ڈالے بغیر اٹھا سکتا ہے کہ اس نے اس مہینے میں کوئی ایک کلاس بھی پڑھائی، کوئی ایک مضمون لکھا، یا کوئی اور علمی کام کیا یا نہیں۔ ترتیب دی ہوئی غیر معیاری کتابوں کے ڈھیر، سیمیناروں میں بے سر پیر کی تقریریں اور کئی کئی سال پرانے پرچے اسے علم و فضل کے منصب پر بٹھا دیتے ہیں۔ اس کا عہدہ، اس کی پوزیشن، اس کی تنخواہ اسے ہر قسم کے احتساب سے مبرا کر دیتی ہے۔ اس کے مقابلے میں رشید حسن خاں جیسے آدمی کی کیا

حیثیت؟ ان 'اعلا حیثیت' لوگوں کے درمیان ایک حقیر سا شخص، اردو شعبے کا ایک معمولی سا ریسرچ اسسٹنٹ۔ پروفیسر صاحبان کے ساتھ بھلا ایسے شخص کا نام کیسے لیا جا سکتا ہے؟ مجھے یاد آیا کہ اردو شعبے کے کئی لوگ ان کا نام تحقیر سے لیتے ہیں اور ان کا ذکر آنے پر ہمیشہ یاد دلاتے ہیں کہ وہ یہاں ایک معمولی عہدے پر تھے، ہم میں سے نہیں تھے۔ میں دل میں سوچتی ہوں، خوش قسمت تھے جو ان میں سے نہیں تھے۔ اگر ان میں سے ہوتے تو سارے برصغیر میں ان کی علمیت کا ڈنکا نہ بج رہا ہوتا۔

اس جلسے میں شعبے کے ایک سابق استاد ڈاکٹر شریف احمد بھی تشریف لائے تھے۔ اپنی تقریر میں انھوں نے اس زمانے کی بہت سی یادوں کا ذکر کیا جب وہ شعبے میں ساتھ ساتھ تھے، ان کی دوٹوک رائے سے شعبے کے بہت سے لوگ انھیں ناپسند کرنے لگے تھے اور یہ بھی افسوس کے ساتھ بتایا کہ جب خاں صاحب ریٹائر ہوئے تو ان سے گارڈ ہال والا کمرہ خالی کرانے کے لیے باقاعدہ محاذ بن گیا، ان کے خلاف یونیورسٹی انتظامیہ کو خطوط بھیجے گئے تاکہ کمرہ خالی کرایا جا سکے۔ یہ بغض غالباً اس لیے تھا کہ خاں صاحب ان کی علمیت کا صحیح صحیح تجزیہ اکثر علی الاعلان کر دیتے تھے۔ علی گڑھ تاریخ ادب اردو کے پروجیکٹ کو اپنے تبصرے کے سبب ضبط کرا دینے والے خاں صاحب سے اب یہ توقع تو نہیں کی جا سکتی تھی کہ اپنے شعبے کے معاملے میں منافقانہ رویہ اختیار کرتے۔ ایسے میں اگر ان سے اکثر اساتذہ کو شکایت پیدا ہو گئی تھی تو وہ اس میں حق بجانب تھے۔ قصور تو خاں صاحب ہی کا تھا کہ اپنی 'حیثیت' سے بڑھ کر وہ 'باحیثیت' لوگوں کے ساتھ جھگڑے مول لیتے تھے۔ اس کے بعد خاں صاحب کو اپنے شعبے کا افتخار سمجھنے کے بجائے یہ صاحبان اگر ان کو نکلوانے کے درپے تھے، اور اس طرح ذلت اور کم نصیبی کا داغ یہاں کے اساتذہ کو ملنا تھا تو اس کو وقت کی ستم ظریفی ہی کہیں گے۔ بھلا فرعون کو اور نمرود کو کب معلوم تھا کہ خدائی کے تمام تر دعووں کے باوجود تاریخ ان کے نصیب میں ذلت اور رسوائی کے سوا کچھ نہیں لکھے گی!

جولائی ۲۰۰۴ء میں کراچی سے اجمل کمال کا ایک ای میل مجھے ملا تھا جس میں انھوں نے پوچھا تھا کہ خاں صاحب کا ای میل ایڈریس لکھ بھیجوں تاکہ ان سے مراسلت کا کچھ سلسلہ چل نکلے۔ اجمل کمال اچھے لکھنے والوں کے قدردان ہیں اور کوشش کرتے ہیں کسی نہ کسی طور ان سے رابطہ رکھیں اور ان کی تحریریں اپنے سہ ماہی جریدے آج میں چھاپیں۔ اجمل کے استفسار پر مجھے ہنسی آ گئی۔ خاں صاحب

Scanned with CamScanner

جیسا صوفی منش آدمی جس نے اپنی پوری زندگی ہوسٹل کے ایک کمرے میں کتابوں کی رفاقت میں گزار دی، نہ وہاں فون لگوایا نہ گھر پر شاہ جہاں پور میں۔ اتنی آمدنی بھی نہیں تھی، ہوتی بھی تو دوسری ضرورتوں کو ترجیح حاصل ہوتی۔ ایسا بے نیاز بوریا نشین اور ای میل؟ میں نے اجمل کو جواب میں حقیقتِ حال سے واقف کرایا تو انھوں نے حیرت کا اظہار کیا۔ وہ ان حالات سے بالکل بھی واقف نہیں تھے، خاں صاحب کے علمی کاموں کے قدر دان تھے، بس۔ میرا خط پڑھ کر لکھا کہ اب میرے دل میں ان کی قدر و منزلت اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔

رشید حسن خاں نے خود تو بے نیازی کی زندگی گزاری لیکن اپنے نیاز مند طالب علموں کے روزگار کی فکر میں خوب گھلتے تھے۔ یہ ضرور تھا کہ ان کے روزگار کے لیے کوئی جوڑ توڑ کرنے کے بجائے ہمیشہ یہی تلقین کرتے کہ محنت سے پڑھو لکھو اور اپنے لیے مقام بناؤ۔ غالباً اپنی زندگی کو اپنے نیاز مندوں کے لیے بھی آئیڈیل مانتے تھے۔ ریٹائرمنٹ تک وہ گائر ہال کے دو کمروں پر مشتمل TC-9 میں رہے۔ ان کی بنیادی ضرورتوں کی اشیا تھیں — دیوار سے دیوار تک لگے کتابوں کے شیلف، پڑھنے لکھنے کے لیے ایک میز کرسی، ملاقاتیوں کے لیے چند کرسیاں۔ اندر والے کمرے میں ایک بستر اور چائے بنانے کے لیے ایک پرکولیٹر۔ اس سادہ سی زندگی کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ زندگی سے خاں صاحب کے کچھ مطالبات ہی نہ تھے۔ اچھے معیارِ زندگی کا ان کا تصور تھا جس پر وہ کوئی مفاہمت نہیں کر سکتے تھے۔ آپ کو ان کی میز پر کوئی عام فاؤنٹین پین یا کوئی بال پین نظر نہ آ سکتا تھا۔ وہ ہمیشہ شیفر یا پارکر سے لکھتے تھے۔ خصوصاً ان دو برانڈوں کے پین ان کے پاس اچھی خاصی تعداد میں تھے۔ ان کے تمام دوستوں اور نیاز مندوں کی ان کے شوق معلوم تھے۔ چنانچہ جو کوئی بھی یورپ و امریکہ کے سفر سے لوٹتا، ایک اچھا پین خاں صاحب کے لیے خریدنا نہ بھولتا۔ خراب پینوں کی مرمت فتح پوری کی مسجد کے پاس، چاندنی چوک میں واقع کورونیشن والے کی دکان پر کراتے تھے۔ غیر ملکی برانڈ کے پینوں کی مرمت کے لیے بس یہی ایک مشہور دکان تھی۔

ایسا ہی شوق اچھی چائے پینے کا بھی تھا۔ ہمیشہ گولڈن اورنج پیکو استعمال کرتے۔ اگر یہ برانڈ نہ ملے تو اورنج پیکو سے کام چلاتے۔ اس کے سوا کوئی دوسری چائے نہیں پیتے تھے۔ کناٹ پلیس میں پالیکا بازار سے بائیں جانب والے ونگ میں واقع جانکی داس ڈپارٹمنٹل اسٹور میں یہ چائے ملتی تھی۔

Scanned with CamScanner

ایک ہی دکان تھی۔ جب بھی دہلی آنا ہوتا اور وقت کم ہوتا تو پہلے ہی خط لکھ دیتے کہ چائے بھی خریدنی ہے، جب ملنے کے لیے آؤ تو خریدتی ہوئی آؤ، آدھا دن بچ جائے گا۔ آدھا کلو کا پیکٹ ۴۴اروپے کا ملے گا، فوراً ہی قیمت ادا کردوں گا۔

خاں صاحب لباس کے معاملے میں بھی بڑے خوش مذاق تھے۔ نہایت سادہ مگر خوش وضع، اور رنگوں کے انتخاب میں بھی باذوق۔ یہی سلیقہ ان کی زندگی کے ہر پہلو میں دیکھنے کو ملتا تھا۔ سچے اسپورٹس مین کی طرح بڑے ڈسپلن میں رہتے۔ فٹ بال کے اچھے کھلاڑی اور میچ دیکھنے کے شوقین تھے۔ یہی ذوق وشوق اور سخت ضابطہ ان کی زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی نظر آتا تھا۔ اسی لیے وقت لیے بغیر، بلا اجازت اور بلا ضرورت ان سے ملنے کوئی نہیں آتا تھا۔ خاں صاحب کتنے بجے ناشتے کی میز پر ہوں گے، کب سے کب تک ٹیوٹوریل بلڈنگ میں اپنے آفس میں ہوں گے، کتنے بجے کافی پینے ملیں گے، کتنے بجے کھانا کھائیں گے، کب سے کب تک آرام کریں گے، کب کافی ہاؤس جائیں گے، غرض ہر بات کا وقت مقرر تھا۔ آپ انھیں دیکھ کر گھڑی ملا سکتے تھے۔ خوشامد پسندی طبیعت میں نام کو نہ تھی۔ انھیں بالکل پسند نہیں تھا کہ کوئی بلا وجہ بات چیت کے لیے تعریفیں شروع کردے، جیسا کہ اکثر ادبی محفلوں اور سیمناروں میں ہوتا ہے۔ مجھے ایک بار کا واقعہ یاد ہے کہ غالب انسٹی ٹیوٹ کے غالب سیمنار میں اپنا پرچہ پڑھ کر خاں صاحب نے اپنے چند احباب کے ساتھ کافی پینے جانے کا پلان بنایا۔ طے ہوا کہ بہادر شاہ ظفر مارگ پر اخباروں کے دفاتر کے سامنے والی سڑک پر جو سب وے ہے، اس میں واقع ریستوراں میں کافی پی جائے۔ جب باہر آکر رکشہ پر سوار ہونے کو تھے تو ایک صاحب آگے بڑھ کر ان سے بڑی نیازمندی سے ملے اور پوچھ بیٹھے کہ حضرت اب دوبارہ کب دہلی تشریف لائیں گے۔ خاں صاحب نے پوچھا، کیوں؟ فرمانے لگے کہ اگر معلوم ہو جایا کرے کہ آپ تشریف لانے والے ہیں تو ہم ایسے طالب علم استفادے کے لیے حاضر ہو جایا کریں۔ خاں صاحب کے چہرے پر درشتی ظاہر ہوئی۔ کہنے لگے، میں ساری زندگی گائر ہال میں مقیم رہا، آپ کتنی بار استفادے کے لیے گائر ہال تشریف لائے؟ اس پر وہ صاحب سٹپٹا گئے اور خاں صاحب نے رکشہ والے کو آگے بڑھنے کا اشارہ کردیا۔ ایسا کئی بار ہوا جب خاں صاحب کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ ان کو جو بات کہنی ہوتی ہے کمال سادگی اور صاف گوئی سے کہہ دیتے ہیں۔ چاہے بات کتنی ہی کڑوی کیوں

Scanned with CamScanner

نہ ہو، ان کے لہجے میں معمولی سی بھی لغزش نہیں آتی، ان کے تیور ذرا نہیں بدلتے۔ جس طرح ان کے لکھے ہوئے الفاظ حق وصداقت کا اعلان کرتے ہیں، اسی طرح وہ آمنے سامنے کی گفتگو میں بھی بے باک تھے۔ یہ ایسا وصف ہے جو بہت کم لوگوں میں ہوتا ہے، خصوصاً اردو کی دنیا میں تو اس کی مثال شاذ ہی ملے گی۔

اب سوچتی ہوں کہ مجھ ایسی کاہل الوجود، کام چوروں کی سچی جانشین نے خاں صاحب پر مضمون کیوں لکھا۔ پلان ایک سال سے کررہی تھی لیکن پریشر کوئی نہیں تھا اس لیے قلم اٹھاتی ہی نہیں تھی۔ اب جاوید رحمانی نے (جو خاں صاحب پر کوئی کتاب مرتب کررہے ہیں) ہر ہفتے دو ہفتے میں یاد دلانے کی ذمے داری لے لی تو بس دوسرے غیر ضروری کاموں کو پس پشت ڈالنا پڑا۔ اس سے قبل ایک مضمون رالف رسل پر لکھا تھا۔ سوچتی ہوں کیسا عجیب اتفاق ہے کہ یہ دونوں حضرات جن پر قلم اٹھانے کو میں نے اپنے دل کو آمادہ پایا، کچھ نہ کچھ ایسی مشترک قدروں کے حامل ہیں جن کو میں بھی سب سے زیادہ اہمیت دیتی ہوں۔ یہ مشترک اقدار ہیں — ان کا کھرا پن، بغیر لاگ لپیٹ کے سیاہ کو سیاہ اور سفید کو سفید کہنے کا حوصلہ، اپنے کام کے لیے بے پناہ لگن، زندگی پر اعتماد اور انسان دوستی پر کامل یقین۔ کاش ان جوہروں کا عشر عشیر ہی ہماری سرشت کا حصہ بن جائے تاکہ اردو دنیا سانس لینے کی ایک بہتر جگہ بن سکے۔

❁❁

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے مستند بنیادی مآخذ

سالِ رواں ۲۰۰۷ء میں جنگِ آزادی کے ۱۵۰ برس مکمل ہونے پر پیش کی جا رہی ہیں

(1) The Mutiny Records	Edward H. Hilton	Rs.500
(2) The History of Indian Mutiny	Sir John Kaye	Rs.900
(3) The Indian Mutiny of 1857	C.G.B.Malleson	Rs.600
(4) The Punjab and Delhi in 1857	J.Cave-Browne	Rs.1200
(5) The History of the Indian Mutiny *(2 Vols)*	Charles Ball	Rs.4000
(6) The Indian Mutiny (4 Vols.)	Ed. G.W.Forrest	Rs.4500
(7) Punjab and the Indian Revolt of 1857	Ihsan H. Nadiem	Rs.400
(8) Notes on the Revolt in the North-Western Provinces of India	Charles Raikes	Rs.450
(9) The Crisis in the Punjab	A Punjab Employee	Rs.350
(10)Mutiny Records: Reports *(2 parts in 1 Vol.)*		Rs.1500
(11)Mutiny Records—Correspondence *(2 parts in 1 Vol.)*		Rs.1800
(12)The Delhi Residency and Agency Records		Rs.900
(13) Records of the Ludhiana Agency		Rs.900
(14) Punjab Mutiny Report, *Selections from the Public Correspondence*		Rs.400
(15) Political Diaries of Lieut. H.B.Edwards		Rs.750
(16) Political Diaries of the Agent to the Governor-General		Rs.800
(17) Political Diaries of Lieut. Reynell G. Taylor		Rs.900
(18) Journals and Diaries of the Asst. to the Agent		Rs.900

(۱۹) تاریخ بغاوتِ ہند ۱۸۵۷ء (محاربۂ عظیم)	پنڈت کنہیالال	۳۰۰ روپے
(۲۰) ۱۸۵۷ء (مجموعہ خواجہ حسن نظامی)	مرتبہ: محمد اکرام چغتائی	۱۲۰۰ روپے
(۲۱) ۱۸۵۷ء "خیال نمبر"	ناصر کاظمی، انتظار حسین	۶۰۰ روپے

Scanned with CamScanner

نیر مسعود

نسخۂ کیمیا

میرے بڑے ماموں شہر کے مشہور سنکی لوگوں میں تھے۔ مدتوں تک ان کو کیمیا بنانے کا شوق رہا۔ انھوں نے کیمیا کے بہت سے نسخے فراہم کر لیے تھے اور ہر جگہ اپنی کیمیا گری کا ذکر کرتے رہتے تھے۔ البتہ جب وہ کسی نئے نسخے کا تجربہ کرنے لگتے تو پھر ملنے والوں میں کیمیا کا بالکل ذکر نہیں کرتے تھے اور اگر کوئی اُن کے سامنے یہ ذکر چھیڑ بھی دیتا تو اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگتے تھے۔ ہر کیمیا گر کی طرح ان کو بھی یقین تھا کہ کبھی نہ کبھی وہ جستے، پیتل یا کسی اور دھات یا مرکب دھاتوں کو سونے میں تبدیل کر لیں گے اور ہر کیمیا گر کی طرح ان کی کیمیا میں بھی 'ایک آنچ کی کسر' رہ جاتی تھی۔ پھر وہ کوئی اور نسخہ آزماتے اور پھر وہی ایک آنچ کی کسر۔ یہ کسر ان کے خیال میں اس وجہ سے رہ جاتی تھی کہ کبھی نسخے کا کوئی جز خالص نہ ہوتا، کبھی اس کے وزن درست نہ ہوتے اور کبھی برتن کے نیچے مناسب طور پر اور مناسب وقت تک آنچ نہ پہنچ پاتی — یعنی واقعی ایک آنچ کی کسر رہ جاتی۔ وہ ایک نسخے کو بار بار تیار کرتے، پھر اس سے مایوس ہو کر کوئی دوسرا نسخہ اٹھاتے اور دن رات طرح طرح کے برتنوں کے نیچے طرح طرح کی چیزوں کی آگ جلاتے، طرح طرح کے نسخوں کا سامان پگھلاتے رہتے اور اپنے خیال میں کامیابی کے بالکل قریب پہنچ جاتے، لیکن جب کیمیا تیار کر کے اسے کسی دھات پر آزماتے تو پتا چلتا کہ کامیابی اب بھی ان سے دور ہے۔

کیمیا کا شوق مہنگا ہوتا ہے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ ماموں اس کے پھیر میں پڑ کر مفلس ہوتے

Scanned with CamScanner

جا رہے ہیں۔ میں نے اماں سے ان کی شکایت کی تو انھوں نے کہا:

''بیٹے، وہ سنک گئے ہیں۔ اس شوق کا یہی حشر ہوتا ہے۔ تم ان سے مت الجھا کرو۔'' پھر بولیں، ''اگر ان کے یہاں تمھیں پریشانی ہے تو یہیں واپس چلے آؤ۔''

اس پر میں تیار نہیں ہوا کیوں کہ میں ماموں کے ساتھ آرام سے تھا۔ ان کا شان دار مکان ہمارے چھوٹے سے مکان سے متصل تھا جس میں ایک چھوٹی کھڑکی ہمارے گھر میں کھلتی تھی۔ میری والدہ میرے بھائی بہنوں کے ساتھ اسی چھوٹے سے مکان میں رہتی تھیں۔ میں پڑھ رہا تھا اور اپنے گھر میں پڑھائی ٹھیک سے نہیں ہو پاتی تھی اس لیے ماموں نے اپنے یہاں ایک کمرہ میرے لیے الگ کر دیا تھا۔ کھانا میں اپنے گھر میں کھاتا تھا۔ ماموں کا کھانا بھی ہمارے ہی یہاں پکتا تھا۔

زیادہ تر میں ماموں کے یہاں سکون سے پڑھتا رہتا تھا۔ انھوں نے شادی نہیں کی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ بیوی بچوں کے جھنجھٹ میں پڑ کر وہ یکسوئی کے ساتھ اپنا کام نہیں کر سکیں گے اور کام ان کا بس یہ تھا کہ کیمیا کے نسخے آزماتے رہیں یا اپنی پالی ہوئی مرغیوں کو دانہ پانی دے دیا کریں۔ یہ کیمیا گری کے بعد ان کا دوسرا شوق تھا۔

وہ اپنی کیمیا سازی میں مجھ سے کام نہیں لیتے تھے، البتہ کبھی کبھی مجھ سے کچھ دھاتوں کے ٹکڑے اور سب سے زیادہ پارہ منگواتے تھے جس سے مجھے چڑ ہو گئی تھی۔ میری تعلیم اچھی خاصی ہو گئی تھی اور اب میں ان سے بحث کرنے لگا تھا۔ ایک دن میں نے ان سے کہا:

''ماموں! دھاتوں کی ماہیت نہیں بدل سکتی۔ کسی بھی دھات کو کوئی اور دھات بنا دینا ممکن نہیں ہے۔ اس کے علاوہ سونا...''

''تم سائنس پڑھ کر سائنس والوں کی سی باتیں کرنے لگے ہو،'' ماموں نے مجھے بیچ ہی میں ٹوک دیا۔ ''کتنے لوگ دھاتوں سے سونا بنا چکے ہیں۔''

اس کے بعد انھوں نے کیمیا گروں کے قصے بیان کرنا شروع کر دیے۔ یہ قصے وہ پہلے بھی سنا چکے تھے اور میں ان کو بہت دلچسپی سے سنتا تھا لیکن آخر میں یہ ضرور پوچھتا تھا:

''آپ کے سامنے کسی نے سونا بنایا ہے؟''

اس بار بھی میں نے یہی پوچھا۔

Scanned with CamScanner

''سونا سب کے سامنے نہیں بنایا جاتا،'' انھوں نے جواب دیا، ''لیکن بہت سے لوگ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے فقیر سے رئیس ہو گئے—پتا لگا تو معلوم ہوا...''

''کہ ان کو کیمیا کا نسخہ ہاتھ لگ گیا تھا۔ اگر زیادہ پتا لگایا جاتا تو معلوم ہوتا کہ ان کو کسی طرح سونا مل گیا تھا، جس طرح ملا تھا اس کو چھپانے کے لیے انھوں نے مشہور کر دیا کہ...''

''تم سے بحث کرنا بے کار ہے،'' انھوں نے جھلا کر کہا۔

میں نے ان سے بحث کرنا چھوڑ دیا۔ لیکن ماموں اب قرض لے کر اپنا شوق پورا کر رہے تھے۔ آخر قرض کے جال سے نکلنے کے لیے انھیں اپنا مکان بیچنا پڑا۔ ان کے مکان سے ملا ہوا ایک ٹوٹا پھوٹا سا مکان خالی پڑا ہوا تھا جس کے مالکوں کا پتا نہیں تھا، لیکن ماموں نے معلوم نہیں کہاں سے ایک فرسودہ وارث ڈھونڈھ نکالا تھا۔ اس سے معاملت کرنے کے بعد انھوں نے مجھ کو بتایا کہ وہ اپنا مکان فروخت کر چکے ہیں۔ ہم اسی دن اس نئے مکان میں اٹھ آئے۔ یہ مکان، جو ہم لوگوں کے لیے نیا تھا، معلوم نہیں کب کا بنا ہوا تھا۔ ماموں کے کشادہ درجوں والے مکان میں رہنے کے بعد اس نئے مکان میں میرا دم گھٹتا تھا۔ اس میں بس ایک خوبی تھی کہ اس کی بھی ایک دیوار میرے اپنے چھوٹے سے مکان سے ملتی تھی اور اس میں بھی ایک صحن تھا جو مجھے چند بالشت سے زیادہ نہیں معلوم ہوا۔ میری ماں نے ایک مستری بلوایا جس نے دونوں مکانوں کے بیچ کی دیوار میں ایک چھوٹی سی کھڑکی پھوڑ دی تھی، اس میں سے گذر کر ہم لوگ دونوں مکانوں میں آجا سکتے تھے۔ مجھے اس مکان میں وحشت ہوتی تھی لیکن میں اب بھی ماموں کے ساتھ رہتا تھا کیوں کہ یہ میری پڑھائی کا آخری سال تھا۔ ماموں اس مکان میں بھی خوش تھے۔ انھیں شاید کیمیا کا کوئی نیا نسخہ مل گیا تھا اور وہ اس کی تیاری میں لگ گئے تھے۔

اس کے بعد بہت دن تک وہ مختلف نسخے آزماتے اور سونا بنانے میں ناکام ہوتے رہے۔ تب جا کر انھیں یقین آیا کہ اس شوق نے انھیں کھوکھلا کر دیا ہے۔ ان کے سر سے کیمیا کا بھوت اتر گیا۔ لیکن اب بھی کسی کسی رات کو سوتے سوتے میری آنکھ کاغذوں کے الٹنے پلٹنے کی آواز سے کھل جاتی تو دیکھتا کہ ماموں کچھ پڑھ رہے ہیں۔ اب میں اتنا بڑا اور ماموں اتنے بوڑھے ہو گئے تھے کہ وہ میری بات سننے اور کبھی کبھی ماننے لگے تھے۔ ایک رات میں نے ان کو کچھ پرانے کاغذ پڑھتے دیکھا تو ٹوک دیا:

''ماموں! کیمیا کا خیال آپ کے دل سے نہیں نکلا ہے۔''

Scanned with CamScanner

"بالکل نکل گیا ہے،" انھوں نے لمبی سانس لے کر کہا۔

"پھر یہ نسخے کیوں پڑھتے رہتے ہیں؟"

"بس یونہی۔"

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"لائیے، یہ سب نسخے مجھے دیجیے۔"

"تم کیا کرو گے؟"

"انھیں کل گومتی میں ڈبو دوں گا۔"

"ایسا غضب بھی نہ کرنا،" انھوں نے خوف زدہ ہو کر کہا، "بڑے قیمتی نسخے ہیں۔"

"جی ہاں!" میں نے کہا، "اتنے قیمتی کہ آپ کا خاندانی مکان ان کی بھینٹ چڑھ گیا۔"

"نسخوں کو کیوں دوش دیتے ہو، میں ہی کہیں چوک جاتا ہوں،" انھوں نے کہا اور کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

اس کے بعد وہ کئی دن تک سوچ میں ڈوبے رہے۔ میں سمجھ رہا تھا کہ اپنی حالت پر غور کر رہے ہیں لیکن ایک دن سویرے سویرے انھوں نے مجھے جگا دیا اور ابھی میری آنکھ ٹھیک سے کھلی بھی نہیں تھی کہ ان کی آواز سنائی دی:

"بس ایک بار۔"

فقیروں کا سا لہجہ تھا۔ میں ہوشیار ہو کر بیٹھ گیا۔

"ماموں، کیا بات ہے؟"

"بالکل سادہ سا نسخہ ہے۔ خرچ کچھ نہیں۔ بس تھوڑی سی مٹی اور ذرا سا جستہ اور پارہ..."

"پارہ؟" میں بھڑک اٹھا، "پھر وہی پارہ؟"

"بالکل ذرا سا، وہ میرے پاس بچا ہوا رکھا ہے، جستہ بھی ہے، گندھک بھی ہے، تمھیں بازار نہیں جانا پڑے گا۔"

ان کا لہجہ اور زیادہ فقیروں والا ہو گیا۔ مجھے ان پر ترس آنے لگا اور میں ان کی مدد کرنے پر تیار ہو گیا۔

Scanned with CamScanner

''بس جستہ، پارہ اور مٹی؟'' میں نے پوچھا، ''مٹی کون سی، ملتانی؟''

''نہیں نہیں،'' انھوں نے لہک کر کہا، ''یہی چار پانچ قسم کے جنگلی پودوں کے نیچے کی مٹی۔''

''جنگلی پودے؟ اور جنگل کہاں سے لائیے گا؟''

''جنگل کی ضرورت نہیں۔ نالوں، بیہڑوں کے کنارے مل جائیں گے۔''

''آپ پھر مجھے دوڑا رہے ہیں۔''

''بہت دور نہیں، یہی آس پاس کے نالے بیہڑ...''

میں مجبور ہو گیا، بولا:

''کب چلیے گا؟''

''ابھی کیوں نہ چلے چلیں۔ سناٹا ہوگا۔ واپس آ کر ناشتہ وغیرہ کر لیں گے۔''

''چلیے،'' میں نے قمیص پہنتے ہوئے کہا۔

ماموں میرے اتنی آسانی سے راضی ہو جانے پر خوش ہو گئے۔ وہ باہر جانے کا سامان پہلے ہی سے تیار کیے ہوئے تھے۔ مختلف قسم کی چھوٹی تھیلیاں، کئی کھرپے وغیرہ ایک تلی سے بندھے ہوئے ان کے ہاتھ میں تھے۔

سورج ابھی ٹھیک سے نہیں نکلا تھا کہ ہم گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ ایک بڑا نالہ ہمارے مکان سے قریب ہی تھا۔ اس کے کنارے کنارے بہت سے پودے اور جھاڑیاں تھیں۔ لیکن ان تک پہنچنے کے لیے ہمیں سڑک سے نشیب میں اترنا پڑا۔ ماموں کے لیے یہ مشکل کام تھا۔ میں ان کو سہارا دیے رہا، پھر بھی کئی جگہ وہ گرتے گرتے بچے۔ نیچے پہنچ کر انھوں نے کنارے پر اُگے ہوئے جھاڑ جھنکاڑ کو کچھ دیر تک غور سے دیکھا۔ پھر تقریباً گنگناتے ہوئے بولے:

''سارا مال یہیں موجود ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ سب چیزیں سر کٹے نالے پر مل جائیں گی۔ خوب چیز ہے سر کٹا نالہ بھی۔''

''سر کٹا نالہ؟'' میں نے حیرت سے کہا، ''سر کٹا نالہ یہاں کہاں؟''

''یہی نالہ آگے بڑھ کر سر کٹا نالہ کہلاتا ہے، تمھیں یہ بھی نہیں معلوم؟'' انھوں نے کچھ آزردہ ہو کر کہا، ''خیر، چلو شروع کرتے ہیں۔''

Scanned with CamScanner

اس کے بعد دیر تک ہم پودوں کے نیچے کی مٹی جمع کرتے رہے۔ میں نے محسوس کیا کہ ہر قسم کے پودے کی مٹی کی خوشبو الگ ہے۔ میں نے ماموں کو یہ بات بتانا چاہی لیکن وہ اپنے کام میں محو تھے اور ظاہر ہے یہ بات انھیں پہلے سے معلوم تھی، اس لیے میں خاموشی کے ساتھ ان کی مدد کرتا رہا۔

ماموں ہر مٹی کو الگ تھیلی میں بھر رہے تھے اور اس کے ساتھ پودے کی کچھ پتیاں بھی تھیلی میں رکھ رہے تھے۔ اب ایک کے سوا سب تھیلیاں بھر چکی تھیں۔ ماموں اس خالی تھیلی کو ہاتھ میں لیے دیر تک سوچتے رہے، پھر اپنے آپ سے بولے:

''کوئی ایک مٹی رہ گئی ہے۔''

انھوں نے ہر تھیلی کا منھ کھول کر پتیاں دیکھیں۔ وہ خاصے پریشان نظر آ رہے تھے۔ آخر میں نے کہا:

''ماموں! معلوم ہوتا ہے ایک تھیلی آپ فاضل لے آئے ہیں۔''

''نہیں جی،'' وہ بولے، ''تھیلیاں حساب سے رکھی ہیں۔''

اس کے بعد وہ دماغ پر اتنی دیر تک زور دیتے رہے کہ میں جھنجھلا گیا اور بولا:

''آپ کو فہرست لکھ کر لانا چاہیے تھی۔''

وہ پھر سوچنے لگے، یہاں تک کہ ہر طرف دھوپ پھیل گئی۔ میں نے ماموں کو مزید ٹوکنا بے کار سمجھا اور صبر کے ساتھ انتظار کرتا رہا۔ آخر کار وہ چونک کر بولے:

''اوہو، اونٹ کٹارا رہ گیا۔ یہاں دکھائی بھی نہیں دے رہا ہے۔''

''اونٹ کٹارا؟'' میں نے پوچھا، ''یہ کیا چیز ہے؟''

''تمھیں یہ بھی نہیں معلوم؟'' انھوں نے مایوسی کے ساتھ کہا اور نالے کے کنارے کنارے چلنے لگے۔ آخر ایک جگہ رُکے۔

''اچھا، یہاں چھپے ہوئے ہو؟''

یہ چھوٹے چھوٹے کانٹوں والی ایک جھاڑی تھی۔ ماموں اسے دیکھ کر خوش ہو گئے۔ جھاڑی بدوضع تھی لیکن میں نے سوچا، اگر اس کے پودوں کو الگ الگ کر کے گملوں میں لگا یا جائے تو اچھے معلوم ہوں گے۔ ماموں کے کہنے پر میں نے اس کے نیچے کی مٹی کھودنا شروع کی اور ماموں نے اسے خالی

تھیلی میں بھر لیا۔

میں اپنے ہاتھ جھاڑ رہا تھا کہ ماموں بولے:

''کچھ دن سے آنکھ ٹھیک سے کام نہیں کر رہی ہے۔ دیکھنا منڈی بھی شاید یہاں کہیں لگی ہو،'' اور میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی مایوسی کے ساتھ بولے،''تم منڈی بھی نہیں جانتے ہوگے؟''

میں واقعی نہیں جانتا تھا، لیکن کچھ بولا نہیں۔ ماموں کو بھی منڈی کی زیادہ فکر نہیں تھی اور ہم اسے تلاش کیے بغیر واپس آ گئے۔

اسی دن سے ماموں نے تیاریاں شروع کر دیں۔ ہر مٹی کو چھان کر الگ الگ برتنوں میں رکھا اور ہر برتن پر مٹی کا نام اور وزن لکھا۔ اس کے بعد وہ اپنے کمرے میں بند ہو گئے اور کئی دن تک میری ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔ چوتھے پانچویں دن سے انھوں نے تھوڑی تھوڑی دیر کو باہر نکلنا شروع کر دیا۔ کبھی کبھی میں ان سے کیمیا کا حال پوچھتا لیکن وہ سرسری جواب دے کر ٹال جاتے۔ اسی طرح بہت دن گذر گئے اور میں نے سمجھ لیا کہ اس بار بھی ایک آنچ کی کسر رہ گئی۔ لیکن اس نسخے میں انھوں نے آگ سے کام نہیں لیا تھا۔ بس مٹی پر تھوڑا تھوڑا پانی چھڑکتے تھے۔ پھر سب برتنوں کی مٹی ملا کر ایک اُتھلے برتن میں رکھی اور اسے ڈھانک دیا۔ اس دوران انھوں نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ البتہ کبھی کبھی پوچھ لیتے تھے کہ ہم نالے کے کنارے کس دن گئے تھے۔ لیکن ان کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ اب وہ دن رات میں کئی کئی بار اُتھلے برتن کا ڈھکنا ہٹا کر مٹی کو دیر تک غور سے دیکھتے رہتے۔

آخر ایک دن انھوں نے نعرہ لگایا:

''ہو گئے! پیدا ہو گئے!''

میں لپک کر ان کے قریب پہنچا۔ وہ برتن کی مٹی کو ایک تنکے سے کرید رہے تھے۔ میں ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ مجھے دیکھ کر وہ بولے:

''دیکھو، سنہرے کیڑے پیدا ہو گئے۔''

انھوں نے کیمیا کی اصطلاح میں کیڑوں کا کوئی نام بھی لیا۔ میں نے برتن میں دیکھا۔ واقعی اس کی مٹی میں کیڑے کلبلا رہے تھے۔ مجھے ان میں کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔

''ماموں، یہ سنہرے تو نہیں ہیں۔''

Scanned with CamScanner

انھوں نے ایک کیڑے کو تنکے سے اٹھا کر اپنی ہتھیلی پر رکھا اور بولے: ''ٹھیک سے دیکھو۔''
میں نے ٹھیک سے دیکھا۔ کیڑوں کی جلد کہیں کہیں پر شفاف تھی۔ میں انھیں غور سے دیکھ رہا تھا کہ ماموں کی آواز سنائی دی:

''روشنی کے رخ کر کے دیکھو، ادھر میری طرف آؤ۔''

میں اٹھ کر ان کے پاس بیٹھ گیا۔ انھوں نے ہتھیلی میرے سامنے کر دی اور بولے:

''اب دیکھو۔''

میں نے دیکھا، واقعی اس کے شفاف حصے کے اندر سنہرے رنگ کی ایک بوند نظر آ رہی تھی۔ ماموں بالکل معتدل انداز میں باتیں کر رہے تھے لیکن ان کا بدن دھیرے دھیرے لرز رہا تھا۔

میں نے پوچھا: ''اب کیا کرنا ہے؟''

''جوہر تیار ہو گیا ہے، آخر کار...'' انھوں نے کیڑے کو برتن میں ڈال دیا۔ اس کے پیٹ کی سنہری بوند اب کچھ اور بڑی ہو گئی تھی۔ اس طرح کے کیڑے میں نے اب تک نہیں دیکھے تھے لیکن یوں بھی میں نے کیڑے کم دیکھے تھے۔

ماموں میں عجب پھرتی آ گئی تھی۔ وہ کمرے سے دالان میں گئے۔ وہاں سے کچھ دیر بعد انھوں نے مجھے بھی آواز دے کر بلا لیا۔ اتنی دیر میں وہ بھٹی تیار کر کے سلگا چکے تھے۔ جستہ اور پارہ وغیرہ بھی اس کے قریب رکھا ہوا تھا ــــ انھوں نے ایک نظر اس سارے سامان کو دیکھا اور پھر بولے:

''تم ذرا آنچ تیز کرو، میں انھیں لا رہا ہوں۔'' یہ کہتے کہتے وہ واپس کمرے میں چلے گئے۔

میں نے بھٹی کو دھونکنا شروع ہی کیا تھا کہ کمرے سے کچھ عجیب سی آوازیں آنے لگیں اور میں بھٹی چھوڑ کر لپکتا ہوا کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہاں اب سناٹا تھا۔ ماموں ایک کونے میں پتھر کے بت کی طرح کھڑے تھے۔ برتن کی مٹی باہر بکھری ہوئی تھی اور ماموں کی پالی ہوئی تین مرغیاں اسے کرید رہی تھیں۔ میں نے جلدی سے مرغیوں کو کمرے سے باہر ہنکا دیا اور مٹی کو غور سے دیکھا۔ سنہرے کیڑے سب غائب ہو چکے تھے۔

''ماموں، کیڑا تو ایک بھی نہیں ہے۔''

ماموں اسی طرح کھڑے رہے۔ میں نے پوچھا:

Scanned with CamScanner

''سب کو مرغیاں کھا گئیں؟''

ماموں پھر بھی چپ رہے۔ میں ان کے پاس خاموش کھڑا ہو گیا۔ بہت دیر بعد وہ آہستہ آہستہ کمرے سے باہر آئے۔ بھٹی کی آگ پر انھوں نے پانی ڈال دیا، جستے اور پارے وغیرہ کو ایک کونے میں لگی الماری میں رکھ دیا۔ بجھی ہوئی بھٹی سے کچھ دیر تک بھاپ اٹھتی رہی، پھر غائب ہو گئی۔ میں نے کئی بار کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن سمجھ میں نہیں آیا کیا کہوں۔ میں نے کمرے میں جا کر مٹی کو سمیٹ کر اُتھلے برتن میں رکھ دیا اور پھر ماموں کے پاس واپس آ گیا۔

اس کے بعد ماموں نے کسی سے بات نہیں کی۔ میری ماں ان کے لیے کھانا ناشتہ لاتیں تو چپ چاپ کھا لیتے۔ قریب ایک ہفتے تک ان کی یہی حالت رہی۔ چوتھے یا پانچویں دن میں ان کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا کہ مجھے شبہ ہوا کیڑوں والے برتن کی مٹی میں کچھ حرکت پیدا ہو گئی ہے۔ پھر مجھے اس میں دو تین جگہ چمک سی نظر آئی۔ میں نے قریب جا کر دیکھا مٹی میں دو تین سنہرے کیڑے رینگ رہے تھے۔

میرے دیکھتے دیکھتے ان کی سنہری چمک کچھ اور تیز ہو گئی۔ مجھ میں خواہ مخواہ ایک جوش پیدا ہوا اور میں کمرے سے نکل کر دالان میں آیا جہاں ماموں خاموش بیٹھے سامنے دیکھ رہے تھے۔ میں نے اپنے معمول سے زیادہ تیز آواز میں کہا:

''پھر پیدا ہو گئے، ماموں، سنہرے کیڑے پھر پیدا ہو گئے!''

انھوں نے خاموش نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ بولے کچھ نہیں۔ میں کچھ دیر اُن کے بولنے کا انتظار کرتا رہا، پھر دوڑ کر کمرے میں آیا اور ایک کیڑے کو ہتھیلی پر رکھ کر دوڑتا ہوا باہر آیا۔

''یہ دیکھیے، وہی کیڑے ہیں نا؟''

ماموں نے کیڑے کو دیکھا۔ لمحے بھر کو ان کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوئی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ پھر خالی خالی نظروں سے سامنے دیکھنے لگے۔

میری ماں کھانے کی سینی لیے ہوئے گھر میں داخل ہوئیں۔

''بھائی! کھانا کھا لو،'' انھوں نے کہا۔

''کیا پکایا ہے؟'' ماموں نے پوچھا۔

Scanned with CamScanner

ماں نے کوئی جواب دیے بغیر سینی اُن کے آگے رکھ دی۔ میرا کھانا بھی اسی سینی میں تھا۔ کھانے کے دوران اور اس کے بعد بھی میں نے کئی بار سنہرے کیڑوں کا ذکر چھیڑا مگر وہ اسی طرح بیٹھے رہے جیسے میں نے کچھ کہا ہی نہ ہو۔

اسی طرح کئی روز گذر گئے۔ اب ماموں ہم لوگوں سے معتدل انداز میں گفتگو کرنے لگے تھے۔ لیکن کیمیا کا ذکر آتے ہی گم سم ہو جاتے۔ آخر ہم نے ان کے سامنے کیمیا کا نام لینا ہی چھوڑ دیا۔

ایک دن اماں کھانا لائیں تو بولے:

''کیا ہم نے ابھی کھانا نہیں کھایا ہے؟''

اس کے بعد روز یہی ہونے لگا کہ ان کو خیال ہوتا تھا وہ کھانا کھا چکے ہیں یا پانی پی چکے ہیں۔ اماں کو بار بار اصرار کر کے انھیں کھلانا پلانا پڑتا تھا۔ یہاں تک کہ مجھے جھنجھلاہٹ محسوس ہونے لگی، اس لیے کہ میں ان کے ساتھ ہی کھاتا تھا اور جب تک وہ کھانا شروع نہ کرتے، میں بھی بھوکا بیٹھا رہتا تھا۔ جب میں اماں کے سامنے جھنجھلاہٹ ظاہر کرتا تو وہ ایک ہی بات کہتی تھیں:

''بیٹے! وہ مر چکے ہیں۔''

ظاہر ہے یہ بات وہ محاورے کے طور پر کہتی تھیں، لیکن ایک بار آدھی رات کو جب ان کے رونے سے میری آنکھ کھلی تب مجھے یقین آیا کہ ماموں واقعی مر چکے ہیں۔ ہم نے انھیں دفن کر دیا۔

وہ مٹی ابھی یوں ہی رکھی ہوئی ہے۔ سنہرے کیڑے اس میں پیدا ہوتے اور مرتے رہتے ہیں۔ مرنے سے پہلے ان کی سنہری رنگت اور بڑھ جاتی ہے لیکن مرنے کے بعد ان کا سنہرا رنگ ختم ہو جاتا ہے اور وہ معمولی بدرنگ کیڑے رہ جاتے ہیں۔ پھر انھیں مرغیاں کھا جاتی ہیں۔

❊❊

محمد انور خالد

اداس لڑکیاں

اداس لڑکیاں
اجل دریدہ وسحر زدہ ستم نصیب آئنے کے آس پاس لڑکیاں
اداس لڑکیاں
تمام رات آفتاب ان کے انتظار میں رکا رہا
کہ سو سکیں
تمام دن خزاں کی دھوپ ان کے گھر سے دور
خیمہ زن رہی
کہ تیز روشنی سے مضطرب نہ ہوں
نہیں گری کسی شجر سے کوئی شاخ ٹوٹ کر
اداس لڑکیوں کے صحن میں نہیں گری
کہیں سے ایک اینٹ بھی نہیں ہلی
سیاہ و سرخ بام و در
سفید پتھروں پہ زرد پانیوں کا عکس
اور آئنے کے آس پاس لڑکیاں
اداس لڑکیاں

Scanned with CamScanner

اب ان کو ان کے گھر روانہ کیجیے
نشانِ راہ خود ہی چل پڑے تو پھر نشانِ راہ کس طرح بنے
یہ خانہ زاد عورتیں
اب ان کو ان کے گھر ترنت بھیجیے
یہ زندگی کی سِل پہ پس چکیں تو رنگ آئے گا
عدم نصیب عورتیں عدم کا راستہ بتائیں گی
یہ آئنے کے اُس طرف گئیں تو آئنے کا ماجرا سنائیں گی
اداس عورتیں سفر کے راز لے کے آئیں گی
سفر نصیب عورتیں، اجل نشان عورتیں، عدم نژاد عورتیں
سو ایسا کیا ضرور ہے کہ ان کے قتل کی سزا بھی قتل عمد ہو

مفاہمت ایک ویران راستہ ہے

ندیم ورّاق خطِ طومار میں لکھے تھا
کہ کھنچ گئی ہے، بہت کہانی
اگرچہ انجام سامنے تھا
بحق سرکار ضبط میری متاعِ ہستی
ندیم ورّاق خطِ گل میں یہ لکھ رہا تھا
کہ بجھ گئی لالٹین
بارش بھی آنے والی ہے
رات کی نیند کے پرندے سیاہ جنگل میں چیختے ہیں
میں رنگ برساؤں گا زمیں پر

Scanned with CamScanner

میں بادلوں کا سیاہ آندھی کا سرخ
بجلی کا نقرئی رنگ برساؤں گا زمیں پر
زمین پر آبلے پڑیں گے کہ پانیوں کے محل بنیں گے
میں خطِ عارض میں اپنے چہرے کے نیل لکھوں گا آسمانی عبارتوں میں
میں وہ کہانی لکھوں گا جس کا انجام میں نے پہلے ہی لکھ دیا ہے
میں بے حسی کی زباں میں
لمس کو باصرہ پہ حاوی نہیں لکھوں گا
میں نیند لکھوں تو لوگ خوابوں میں ڈر کے اٹھیں
میں خطِ معکوس میں لکھا ہوا حرفِ ربط
جو آئنہ پڑھے تو غبار ہو جائے
خطِ معکوس میں لکھے تھا ندیم ورّاق
خطِ معکوس میں لکھے تھا
مفاہمت زندگی کا ویران راستہ ہے
کہ میز کرسی کے ساتھ اک اور میز کرسی
یہ میں ہوں یہ میرا دوست جس پر بہت بھروسا

جان کہانی بند کرو

جان کہانی بند کرو دروازہ گرنے والا ہے
کچی بیل نے تھام رکھا ہے چیڑ کے بھاری دروازے کو
زرد گلاب نے روک رکھا ہے جنگل کو دیوار کے ساتھ
اتنے سارے زرد گلاب

Scanned with CamScanner

یہ گھر ہے ایسا بھی گھر ہوتا ہے
کوہِ سفید پر جست کی خالی مسجد
ڈھیروں برف کے پھول
شہزادی کو تکلے کا اک گھاؤ بہت تھا
سو گیا سارا شہر
کہانی کا در کھلا ہوا ہے
کوٹ کشن میں رادھا روز اک شو کرتی ہے
جان کہانی بند کرو
جب شہزادے قتل ہوئے تھے
تم نے پھول نہیں بھیجے تھے
اک تصویر روانہ کی تھی
اور پھر رقص میں شرکت کرنے چلے گئے تھے
اب آئے ہو
پوچھتے ہو قصہ اس گھر کا جس میں زرد گلاب تھے
اور دروازہ گرنے والا تھا
جان کہانی بند کرو

گلابی لڑکیاں

گلابی لڑکیاں جاڑوں کی لہریں
بدن کامل جہانِ آرزو ہے
بہت کھوئے گئے لوگ اس نگر میں

گلابی لڑکیاں نیلے گھروں میں شوخ رنگوں سے
ہدایت نامۂ آوارگی تحریر کرتی ہیں
بہت سنسان راتوں میں بہت انجان سوتی ہیں
گلابی لڑکیاں جاتی نہیں گھر سے
مگر دو چار گھر دو چار گلیاں
چند زیریں راستے
ناپختہ دیواروں کی میلی اوٹ میں
اپنے کیے پر مطمئن
گوری گلابی لڑکیاں
کچے مکانوں میں بہت آسودہ رہتی ہیں
اب ان کے ساتھ چلیے اور سو رہیے
محبت گھر گرہستی کے پرانے چوکھٹے میں دیر تک محفوظ رہتی ہے

وصل قسمت میں نہیں

صاحب الزنج امیر الامرا شیخ حزیں
وصل قسمت میں نہیں
میاں مسکین کے کوچے میں کہیں
عشق کا نام نہیں
ہجر کو لوگ ملاقات کا ڈر کہتے ہیں
وصل سے بھاگتے ہیں
یہ اماوس کی پہر رات سے جاگی ہوئی رات

Scanned with CamScanner

خود کو ہم پایۂ مہتاب کہا چاہتی ہے
اور سرِ شام ہی سو جاتی ہے
گھر کا گھر جانتا ہے آمدِ باراں کے طفیل
ایک سیلابِ بلا ابرِ گہربار میں ہے
پھر بھی دل ساعتِ باراں میں بہت روتا ہے
صاحب الزنج امیر الامرا شیخ حزیں
کچھ علاج اس کا بھی اے چارہ گراں ہے کہ نہیں
وصل قسمت میں نہیں
اور دل ساعتِ باراں میں بہت روتا ہے

Scanned with CamScanner

پاکستانی اردو کتابیں

شناسائیاں رسوائیاں (یادیں)
کشور ناہید
قیمت:300روپے

یہ خانۂ آب وگل (شاعری)
(رومی کے منتخب کلام کا اردو ترجمہ)
فہمیدہ ریاض
قیمت:200روپے

اردو کے ضرب المثل اشعار
محمد شمس الحق
قیمت:300روپے

کئی چاند تھے سرِ آسماں (ناول)
شمس الرحمٰن فاروقی
قیمت:600روپے

العاصفہ (ناول)
حسن منظر
قیمت:180روپے

دلّی کی خواتین کی کہاوتیں اور محاورے
شائستہ سہروردی اکرام اللہ
قیمت:195روپے

زندگی کی یادیں
(ریاست رامپور کا نوابی دور)
جہاں آرا حبیب اللہ
قیمت:300روپے

اردو افسانے کے فروغ میں ساقی کا کردار (تحقیق وتنقید)
ڈاکٹر سجاد حیدر پرویز
قیمت:350روپے

دلّی جو ایک شہر تھا
ملّا واحدی
قیمت:295روپے

تاریخ سے کچھ نہیں سیکھا
(تاریخ وسیاست)
محمد اصغر خان
قیمت:300روپے

Scanned with CamScanner

آج کا آئندہ گوشہ ہندی کی پانچ ایسی کہانیوں پر مشتمل ہے جن کے مرکزی کرداروں میں عورت کے مختلف روپ دکھائی دیتے ہیں، اور اس طرح ہندوستانی سماج کے مختلف طبقاتی اور ثقافتی پہلو، زندگی میں آنے والی تبدیلیاں اور ان کے نتیجے میں متاثر ہونے والے انسانوں کی صورت حال نت نئے انداز سے سامنے آتی ہے۔ رمیش بخشی نے اپنی کہانی ''شبری'' میں اور شیلیش مٹیانی نے ''اردھانگنی'' میں ہندوستانی دیومالا کی دو تصورات کو نئے زمانے کے مطابق نیا روپ دے کر دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کی ہے۔ دھیریندر استھانا کی کہانی ''مانسی'' اور گیتانجلی شری کی کہانی ''پرائیویٹ لائف'' کے مرکزی کردار ایسی عورتیں ہیں جنھیں ہندوستان کے جدید سماج نے پیدا کیا ہے، اور ان کے ساتھ ہی ایسے مسائل بھی پیدا ہوئے ہیں جن کا حل ڈھونڈنا، یعنی تبدیلی کو اپنے اندر سمونا، سماج کے آگے بڑھنے کے لیے ضروری ہے۔ معروف ہندی ادیب کملیشور کی کہانی ''ماس کا دریا'' ایک بے حد منفرد کہانی ہے اور ایک طوائف کی زندگی کی اذیت، خالی پن اور سفاکی کو پیش کرتی ہے۔ اس موضوع پر اردو میں بھی بہت سی کہانیاں لکھی گئی ہیں اور اس پس منظر میں پڑھنے سے کملیشور کی کہانی کی انفرادیت اور زیادہ ابھرتی ہے۔

Scanned with CamScanner

رمیش بخشی

ہندی سے ترجمہ: بشیر عنوان

شبری

میں کر ہی کیا سکتا ہوں سوائے اس کے کہ کہیں اکیلے میں بیٹھ کر اپنے ہاتھ اور آنکھیں بند کر سوچتا... سوچتا ہی چلا جاؤں۔ لیکن ایسا بھی کہاں کر سکتا ہوں؟ نہیں کر سکتا، کیونکہ میرے ایک ہاتھ میں پلیٹ ہے اور دوسرے میں چمچ۔ بوفے کے لیے ہم سب لوگ لان میں سجائی گئی چیزوں کے آس پاس کھڑے ہیں۔ لوگ آگے بڑھ بڑھ کر اپنی اپنی پلیٹ میں پسند کی چیزیں رکھ رہے ہیں اور میں سب کی طرف دیکھ رہا ہوں۔ دیکھ اس طرح رہا ہوں جیسے کسی کی طرف بھی نہیں دیکھ رہا ہوں۔ مجھے تو آگے بڑھ کر لوگوں کا سواگت کرنا چاہیے، مہمان داری کرنی چاہیے، مگر میں ہوں کہ ایسا ہو گیا ہوں جیسے جسم کا کوئی حصہ رہ گیا ہو۔ دائیں ہاتھ کا چمچ جانے کیسے میرے بائیں ہاتھ کی نیلی پلیٹ پر بج جاتا ہے،

---

[1] شبری: ہندوستانی دیومالا کا ایک کردار۔ قصے کے مطابق یہ ایک نچلی ذات یا قبیلے سے تعلق رکھنے والی عورت تھی، جو رام کے بن باس کے دوران ان کے انتظار میں ان کو نذر کرنے کے لیے بیر اکٹھے کیے بیٹھی رہی تھی، اور ان میں سے ہر بیر کو اس نے چکھ لیا تھا کہ دیوتا کو پیش کیا جانے والا کوئی بیر کھٹا تو نہیں۔ رسم کے مطابق نذر کی کسی چیز کو چکھنا اسے نذر کے قابل نہیں رہنے دیتا، لیکن رام نے ان بیروں کی نذر قبول کر لی۔ اس قصے کی مختلف انداز سے تعبیریں کی جاتی رہی ہیں۔ معروف مورخ ڈی ڈی کوسمبی کے مطابق یہ قصہ اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ کس طرح فاتح آریا قدیم ہندوستان کے مختلف مذاہب رکھنے والے مفتوح قبیلوں کو اپنے ذات پات کے نظام میں جذب کرتے چلے گئے تھے۔

Scanned with CamScanner

جیسے میں نوبت بجانے والا ہوں۔ نہیں، مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے، مجھے آگے جا کر اپنی پلیٹ میں کچھ لے لینا چاہیے۔ نہیں لوں گا تو ایک دم سب کی نظروں میں آ جاؤں گا اور وہ دیکھ لیں گے تو ایٹ ہوم کا مزہ ہی جاتا رہے گا۔ میری صحت کے بارے میں ہزاروں جواب طلب کیے جائیں گے اور میں ہکلانے لگوں گا؛ کچھ بول ہی نہیں پاؤں گا۔ اس سب سے بہتر یہ ہے کہ میں کسی کی نظر میں نہ آؤں۔ مجھے اس وقت خوش دکھائی دینا چاہیے۔ میں اپنے آپ کو جھٹک دیتا ہوں، آگے بڑھتا ہوں اور ایک رس گلّا اپنی نیلی پلیٹ میں رکھ لیتا ہوں — شام کے نیلے کچ آسمان میں چاند کی طرح۔ لیکن مجھے کھاتے وقت تشبیہیں نہیں سوچنی چاہئیں۔ مجھے صرف کھانا چاہیے۔ میں چمچ میں رس گلّا رکھ لیتا ہوں اور میرا ہاتھ اوپر اٹھتا ہے۔ مجھے لگتا ہے جیسے کوئی اور ہاتھ میرے منھ کی جانب وہ چمچ لا رہا ہے اور میں کھانا نہیں چاہتا۔ رس گلّا میری پسند کی چیز ہے اور اسی کا ٹکڑا اگر بتیسی پر بھٹکتا رہا، تو بے چارہ اپنے گھر میں بیگانہ ہوگا۔ میری انگلیاں رس گلّے کا چمچ پکڑے اُدھر میں لٹکی ہیں — میں کھا بھی سکتا ہوں اور نہیں بھی...

''میں جا بھی سکتا ہوں اور نہیں بھی!'' یہ چھٹو نے کہا تھا۔

یہ بات سن کر میں ناراض ہو گیا تھا۔ ڈانٹ کر بولا تھا، ''جاؤ گے کیوں نہیں؟ تم ایم ایس سی ہوئے۔ تمھیں اچھی نوکری ملی۔ وہ جگہ چھوٹی ہے تو کیا ہوا؟ وہاں ڈگری کالج ہے تو بالکل گاؤں تو ہوگا نہیں وہ۔''

چھٹو کچھ نہیں بولا تھا۔ وہ ٹھیک کہتا ہے۔ اندور چھوڑ کر کہیں گیا نہیں نا، اس لیے ڈرتا ہے۔ مگر ایسا چانس چھوڑ دیا تو ہمیشہ کارپوریشن میں کلرکی کرتا رہے گا۔ میں شام کو اسے اپنے ساتھ کافی ہاؤس لے گیا تھا اور کڑوی کافی کے ایک پیالے پر تب تک بھاشن دیتا رہا تھا جب تک وہ جانے کو تیار نہیں ہو گیا تھا۔ چھٹو تھوڑا ضدی ہے، بالکل موجی رام۔ ہم دونوں بھائیوں کی عمر میں کافی فرق ہے، مگر دونوں بھائی سے زیادہ دوست ہیں۔ میں نے اسے پھر یہ بھی کہا تھا، ''میں تمھاری جگہ ہوتا، چھٹو، اور ایسی نوکری ملتی تو دوڑ لگاتا ہوا جاتا اور فوراً جوائن کر لیتا۔ کالج میں تو پانچوں انگلیاں گھی میں رہتی ہیں۔''

''اور سر کڑاہی میں!''

''اور کامیابی چرن چھوتی ہے وہاں!''

''اور چپلیں سر؟''

''چپلیں دشمنوں کا سر چومیں!'' میں نظر ٹیڑھی کر کے ہنس دیا تھا۔

''کیوں، بڑکے؟'' وہ تھوڑا گمبھیر ہو کر بولا تھا، ''میری تو نظر پھینکنے کی عادت ہے یار، اور وہاں کلاس میں رہیں گی لڑکیاں!''

میں نے اسے ایک دھپ لگا دیا تھا۔ ''کلاس کی لڑکیاں تو اپنی بیٹیوں کی طرح ہوتی ہیں۔'' اور ہم دونوں کی ہنسی کافی ہاؤس میں یوں تیرنے لگی تھی، جیسے دیے رکھی ناویں ہوں۔

چھٹو کی تیاری شروع ہو گئی۔ اس نے میرے بھی آدھے کپڑے ساتھ لے جانے کو رکھ لیے۔

''بات یہ ہے کہ بڑکے، کہ وہاں ذرا رعب قائم کرنا پڑے گا۔''

پھر شام کو اس کے لیے ٹائیاں اور موزے خریدتے رہے ہم، جیسے نوکری کرنے نہیں، لڑکی دیکھنے جا رہے ہوں۔

''مگر بڑکے، تم تو اس قصبے میں چھ مہینے رہے ہو۔''

''اس بات کو تو برسوں ہو گئے۔''

''کیا چھ مہینے تک اس ایگریکلچر فارم پر ہی الکھ جگاتے رہے؟ ٹریننگ میں گئے تھے یا تپسیا کرنے؟''

مجھے اچانک یاد آیا تھا، ''ہاں، چھٹو، ایک موشائے تھے وہاں، میں انھیں کے کمرے میں رہتا تھا۔ کوئی جی تھے وہ— چٹر جی، مکھر جی یا بنر جی، یاد نہیں۔ یار چھٹو، بڑی موج سے دن کٹے تھے وہاں۔ ان کے نام ایک چٹھی لکھ دیتا ہوں۔''

دو دنوں بعد چھٹو کے جانے کا دن آ گیا۔ وہ ہمارے بھرے گھر کو چھوڑ چلا گیا۔ میں نے خود اسے زور دے کر بھیجا تھا، لیکن اس کی بس جب ملی تو مجھے رونا آ گیا تھا۔

اِس وقت آرکسٹرا جم کر بجایا جا رہا ہے۔ وِمٹو پیتے لوگوں کے پاؤں تال دے رہے ہیں۔ چیری پنگ کی دھن میں ایسی کچھ مستی ہے کہ میز پر رکھی ہوئی بوتلیں بھی آپس میں ٹکرانے لگتی ہیں۔ پھر زندہ آدمی کیسے نہ جھومے؟ لوگ سب کھا چکے ہیں اور میرے پیچ میں رس گلا رکھا کا رکھا ہی ہے۔ میری

انگلیاں چمچ کو پکڑے ہیں سو پکڑے ہی ہیں۔ ٹیڑھا بھی نہیں ہوتا میرا ہاتھ کہ رس گلّا نیچے گر جائے۔ اس دھن کے ساتھ تو رس گلّا اُچھل کر کھایا جا سکتا ہے۔ جی ہوتا ہے کہ مستی میں آ کر کوئی جنگلی آواز اپنی زبان پر سے پھسل جانے دیں۔ ہاتھ اُدھر میں چمچ لیے ڈُکھ سا آیا ہے۔ میں پلیٹ نیچے رکھ کر رس گلّے والا چمچ اس میں بہت آہستہ سے رکھ دیتا ہوں۔ چمچ ٹیڑھا ہو جاتا ہے اور رس گلّے کا گولہ اس کی گود میں سے لڑھک کر پلیٹ کے نیلے بستر ے پر لڑھک جاتا ہے۔ میں اس کی طرف دیکھتا رہتا ہوں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ یہ رس گلّا پلیٹ میں سے بھی لڑھکے اور میز کے سفید کریپ پر آ جائے، پھر وہاں سے بھی لڑھکے اور ہرے لان پر گر جائے۔

چھٹو نے پہلے خط میں ہی بہت ساری باتیں لکھ بھیجی تھیں۔

ایک— کل رات میں تخت پر سے نیچے گر گیا۔ مجھے تخت پر سونے کی عادت نہیں اور تمھارے ان موشائے نے اس پر سُلا دیا تھا۔ تھکا ہوا تھا، سو ایسی نیند آئی کہ نیچے گر گیا۔ سر پر تمھارے ان موشائے نے ہی پٹی باندھی۔ بڑکے، بوڑھے آدمی اتنے پیارے ہوتے ہیں، یہ مجھے نہیں معلوم تھا۔

دو— میں اب رس گلّے کھانے لگا ہوں۔ پہلے مجھے ان کا جھک سفید رنگ بہت بور لگتا تھا، اب وہی پیارا لگتا ہے۔

تین— پانچوں انگلیاں گھی میں ہو سکتی ہیں، کیونکہ یہاں گھی کا ایک ہند مہاساگر کنیا کماری کے آس پاس لہریں مار رہا ہے۔

چار— تم سب بہت یاد آتے ہو۔ ایک دن تمھیں یہاں آنا ہوگا۔ تب تک تمھارے ساتھ خرچ کرنے کے لیے میں کچھ روپیہ جوڑ لوں گا۔

خط پڑھتے ہی میں بھی لکھنے بیٹھ گیا۔ موج سے رہو، مگر سنبھل کر۔ تمھیں ابھی جمنا ہے۔ نئی نوکری ہے، نئی جگہ۔ ہند مہاساگر میں ڈوب مت جانا...

لگتا تھا، جیسے میرا خط پاتے ہی وہ بھی لکھنے بیٹھ جاتا تھا۔

بڑکے، اب میں ٹھیک سے جم گیا ہوں۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ کالج کے لڑکے بھی سیدھے ہیں۔ بلاّ وہ کرتے ہیں جن کی سمجھ میں کچھ آتا ہے۔ ان کی سمجھ میں ہی نہیں آتا کچھ، تو بے چارے کیا کھا

کر مجھے ہوٹ کریں گے؟ ہاں، اب میں اسی کمرے میں رہ رہا ہوں جہاں تم رہتے تھے۔ ایک بات لکھنے کو بڑا من ہے۔ شاید پڑھ کر تمھیں اچھا لگے گا۔ بات یہ ہے کہ کل موشائے نے ایک کٹوری میں کچھ کھانے کو دیا۔ گڑ سے بنی جانے کیا چیز تھی۔ بولے، نودھایے ہیں یہ۔ میں نے وہ کھا تو لیا، مگر منھ جانے کیسا ہو گیا۔ موشائے میرا منھ دیکھ کر بھانپ گئے۔ پردے کی طرف دیکھ کسی کو پکار کر بولے، جول! ایک لڑکی پانی لے کر آئی۔ موشائے ایسے بولتے ہیں جیسے ان کے دونوں گالوں میں ہوا بھری ہو اور وہ لڑکی بھی ویسے ہی۔ نومشکار! کیوں بڑکے، تم نے ہم سے کبھی ذکر ہی نہیں کیا کہ یہاں کوئی لڑکی بھی ہے؟ ایک عورت بھی ہے یہاں — شریمتی موشائے۔ ماں کہتی ہے وہ لڑکی انھیں۔ سنتے ہیں وہ ماں دن رات مانس پوجا[۲] کیا کرتی ہیں۔ آنکھیں موندے بیٹھ کر بھگوان کی کلپنا کیا کرتی ہیں۔ بھگوان آ جاتے ہیں۔ وہ ویسے ہی پوجا کا سامان اکٹھا کرتی ہیں اور اچھے سے اچھے پکوان کا بھوگ لگاتی ہیں۔ یہ سب کچھ مانس میں ہوتا ہے۔ اور مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ موشائے بھی مانس میں کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہتے ہیں۔ جب دیکھو، ان کے ہاتھ میں پیری میسن، کانن ڈائل یا بلیک سیریز کے قصے رہتے ہیں۔ ان کا لڑکا کہیں ریلوے میں ہے۔ انھیں پنشن ملتی ہے۔ لڑکی پڑھتی ہے۔ وہ انگریزی میں پرائیویٹ ایم اے کر رہی ہے اور میرا اسبجیکٹ ہے کیمسٹری۔ کوئی پٹری نہیں بیٹھتی۔ مگر جو بات میں کہنا چاہتا تھا وہ یہ ہے بڑکے، کہ وہ جو نومشکار والی لڑکی ہے نا، تمھیں جانتی ہے۔ کل شام تمھارا خط دینے آئی تھی — او مائی گاڈ! بڑکے، ایسے لمبے بال کبھی نہیں دیکھے! جھوٹ بولوں تو میرے چشمے کا نمبر بڑھ جائے۔ کھلے بال اس کی ایڑی کو چھو رہے تھے۔ بولی تھی کہ تم ان کے (یعنی تمھارے) چھوٹے بھائی ہو نا؟ پھر یہ بھی پوچھا تھا کہ وہ مجھے (یعنی اسے) جانتے ہیں کیا؟

میں تو خط پڑھتے پڑھتے تھم گیا تھا۔ جیسے خود کو مجرم پا رہا تھا کہ میں نے کبھی اسے یاد کیوں نہیں کیا۔ مجھے نہیں یاد کہ اس کے بال لمبے تھے۔ تب اس کا جسم خوب بھرا ہوا، رنگ خوب صاف اور آنکھوں میں خوب شرارت بھری تھی۔ وہ تب شاید نویں میں تھی، شاید دسویں میں، یہ سب میں بھول چکا ہوں۔ کیسے اور کب موشائے سے تعارف ہوا، وہ سب بھی یاد نہیں کیا جا سکتا۔ میں ان کے گھر کے ہی

---

[۲] مانس پوجا: ذہنی عبادت۔ یعنی ایسی عبادت جس میں رسوم کی پابندی نہ ہو بلکہ صرف معبود کا تصور باندھا جائے۔

Scanned with CamScanner

ایک آدمی کی طرح رہتا تھا۔ موشائے رینج میں ہیڈ کلرک تھے۔ دن رات آفس کا کام اور فرصت ملتی تو شطرنج۔ مجھے آ پکڑتے تھے۔ میں بڑی مشکل سے چھوٹ پاتا۔ زیادہ وقت فارم پر ہی کٹتا تھا میرا۔ جتنے سے بھی گھر رہتا کھکی میرے کمرے میں رہتی۔

''نومشکار!'' وہ پیچھے کے دروازے سے آتی اور کمرے میں رکھی اکلوتی گول میز پر ہاتھ میں اپنے کورس کی کوئی کتاب لیے آ بیٹھتی۔

''کیں؟'' وہ مسکان کے چھلّے بناتی۔

''بھالو،'' میں اتنا کہتے ہاتھ کی کاپی اس کے سر پر دے مارتا۔ وہ گول میز پر شرارت سے آدھی لیٹ جاتی۔ میں اسے مناتا۔ پکارتا،'' کھکی!''

وہ نہیں بولتی۔

''کھکی!'' میں پھر پکارتا اور وہ چپ ہی رہتی۔

''کھکی!''

اب وہ بول دیتی،'' کیں؟''

''کھکی، تمی بور!''

''آمی نا، تمی!'' وہ چڑ جاتی۔

''کھکی، تُمی بوکا!''

''کیں بولچے؟ بوکا؟'' وہ زور سے ہنس دیتی۔ پھر کہتی،'' آمی نا، تُمی، تمی، تمی!'' اور یہی تُم تُم تُم کی رٹ لگاتی وہ چلی جاتی۔

دن نکلتے پھر چائے لاتی۔ نیلی پلیٹ میں ایک رس گلّا لے کر آتی — شام کے نیلے آسمان میں چاند کی طرح۔ میں ایک بار میں ہی رس گلّا کھا جاتا اور فارم کی طرف جانے کو ہوتا۔ وہ جانتی تھی کہ میں فارم جاتا ہوں، پھر بھی پوچھے بغیر نہیں رہتی،'' کو تھے، دادا؟''

میں جواب دینے کے بجائے اس کا ہاتھ پکڑ لیتا۔ وہ چیختی، چلاتی،'' چھوڑے داؤ!''...

اور وہی کھکی پوچھ رہی ہے — پوچھ کیا رہی ہے پچھوا رہی ہے — کہ میں اسے جانتا ہوں کیا؟ میں خط پر پھر نگاہ جمالیتا ہوں...

Scanned with CamScanner

تو بڑکے، جواب دیتے ہوئے یہ لکھو کہ تم اسے جانتے ہو کیا؟ ماں کی یہ بھی شکایت ہے کہ بڑا بھائی (یعنی تم) ملنسار تھا اور تم (یعنی میں) نہیں ہو۔ موشائے سے تو میں ٹھیک ٹھاک بات کر لیتا ہوں، لیکن ماں سے جانے کیوں ڈر لگتا ہے۔ اور تو مشکا روالی لڑکی جب سامنے پڑ جاتی ہے تو اس کے ایڑی تک لمبے بال میرے دماغ پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ کہیں پڑھا تھا شاید کہ ایسے بالوں والی کو ایلوکیشی کہتے ہیں۔ کہتے ہیں کیا؟ اور ہاں، بڑکے، اب میں بنگلہ سیکھ رہا ہوں۔ ایک ہفتے میں ہی آنچ جانچ بولنے لگا ہوں۔ اور کیا لکھوں؟...

اور کیا کروں میں؟ یہ رس گلا نیچے نہیں گرنے کا۔ یوں چپ ہے، جیسے سو گیا ہے۔ کوئی تبھی وِمٹو کی ایک بوتل مجھے دے جاتا ہے۔ میں اسے ایک ہی ہاتھ سے پکڑے پکڑے اسٹرا منھ میں لگا لیتا ہوں، سانسیں ایسی تھک گئی ہیں کہ وِمٹو مجھ سے اسٹرا میں کھینچا ہی نہیں جاتا۔ میں نظر نیچی کر کے اسٹرا کی شفاف سفیدی میں لال رنگ کے ساتھ بننے والے ہوا کے سفید موتیوں کی بھیڑ دیکھتا ہوں۔ جیسے تیسے ایک سانس اوپر کھنچتی ہے تو وِمٹو منھ میں بھر آتا ہے۔ لیکن طبیعت ہوتی ہے، اسے پیوں نہیں، تھوک دوں...

''تمی جول کھابے؟''

''نہ کھکی، آمی بھیجا کھابے!'' میں تیزی سے دوڑ کر اسے کمر سے پکڑ لیتا۔ وہ مجھ سے چھوٹنے کو کسمساتی۔ پھر ایک رَوش گلّے کی یا ایک سندیش کی یا ایک پلیٹ نو دھاپیے کی شرط پر میں اسے چھوڑ دیتا۔ میں فارم کے بورڈنگ میں کھانا کھاتا تھا، مگر ہر تیسرے چوتھے دن موشائے مجھے مدعو کر لیتے۔ میں سمجھ جاتا کہ آج بھات ماچھ بنا ہے۔ پھر شام کو صحن میں سب اکٹھے ہوتے۔ ماں پیڑھے پر بیٹھی رہتیں، میں ایک کرسی پر۔ موشائے آفس کے تھکے، آرام کرسی پر لیٹ جاتے اور کھکی ٹہلتی رہتی۔ موشائے گیت سننے کو کہتے تو وہ دل ہی دل میں گنگناتی اور پھر رَوِیندر سنگیت کی لہروں سے صحن گونج اٹھتا۔ موشائے کو پسند تھا۔

آمادَیر پا کبے نہ چُل گو، مودَیر پا کبے نہ چُل

آماڈیر جھر بے نہ پھل گو، موڈیر جھر بے نہ پھل

سنتے سنتے وہ ڈوب جاتے۔ پھر کھکی اپنی پسند گنگنا اٹھتی—

جودی تورڈاک شُنے کیو نہ آشے...

کسے فرصت تھی پھر سننے کی!

ایک بار رات کو مجھے فارم جانا تھا۔ کھکی بیٹھی پڑھ رہی تھی۔ میں نے پکارا، ''کھکی!''

''کیں کیں، دادا؟'' وہ مجھ سے آ لگی۔

اس کا گیت مجھ سے لہروں میں ٹکرا رہا تھا۔ سیڑھیاں اترتا بولا، ''آمار ڈاک شُنی کیو نہ آشے، کھکی!''

''اورے، اورے او بھاگا!'' وہ ہنس دی تھی، ''آمائے کیں نائے ڈاک دیبو؟ تو مار ڈاک شُنی آمی...!''

موشائے نے یہ سُنا تھا اور بولے تھے، ''کلکتہ کیا چھوڑا کہ ہماری بنگلہ ہی بگڑ گئی! وہاں اس کا یہ بولنا سنیں گے تو لوگ ہنسیں گے۔'' پھر موشائے نے کہا تھا، ''جاؤ کھکی! دادا کے ساتھ جاتی ہو تو گھوم آؤ۔''

میں نے سوال بھر کر اس کی جانب دیکھا، ''آمی جا چھی؟''

وہ میرے ساتھ تھی۔ میں اپنے کام کے فارم پر اسے لے گیا۔ چاند تھا تو، مگر میں نے اس کی طرف دیکھا ہی نہیں۔ اسے ایک دم نظر انداز کر دیا۔ ہم فارم میں گھوم رہے تھے۔

''کھکی، اس سے گاؤ گی؟''

''نہ،'' اس نے انکار کر دیا۔

''کھکی!''

اس نے میری طرف دیکھا۔

میں دھیرے سے بولا، ''کھکی، تمی بور، تمی بور، تمی بور!''

وہ چڑ گئی، ''تمی... تمی!'' اور میرے پیچھے آ کر مکیاں مارنے لگی۔ میں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے تو وہ دانت سے کاٹنے لگی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے گتھ گئے تھے۔ پھر میں نے اسے

Scanned with CamScanner

پاس کھینچ لیا تھا۔ اس کا چہرہ میرے سامنے تھا، جو ہی کے چھوٹے سے منڈوے کی طرح وہ مجھ سے لگی کھڑی تھی۔ میں نے پھر پکارا، ''کھکی!'' تو وہ ہاتھوں سے چھوٹی اور بھاگی، اور میں اس کے پیچھے۔ اس کے اسکرٹ کا بڑا گھیر طرح طرح کے دائرے بناتا جاتا۔ ماں کہتی تھی، اس کے اسکرٹ میں آدھا گز کپڑا زیادہ لگتا ہے، اسے گھیر بہت پسند ہیں۔ اور اوپر سے پیٹی ایسے کس کر باندھتی ہے کہ بکلس کو ایک ایک ملی میٹر پیچھے ہٹانے میں اسے پانچ منٹ لگ جاتے ہیں۔

ایک بار ہم بھی کلب جانے والے تھے۔ شیاما سنگیت کا پروگرام تھا اور کھکی نے پیٹی ایسے کس کر باندھی تھی کہ کمر کو غائب کر دینے پر ہی تل آئی تھی۔ ماں نے ایک دھپ جمائی اور کھکی کو بری طرح ڈانٹا۔ پھر اس سے پیٹی ڈھیلی کروا کر ہی ماں نے اسے ساتھ چلنے دیا۔ وہ سارے وقت منھ پھلائے بیٹھی رہی تھی۔ مجھ سے بھی نہیں بولی تھی۔

اور میں بھی کسی سے نہیں بول رہا ہوں۔ منھ میں اسٹرا لیے ویسا کا ویسا ہی کھڑا ہوں۔ لوگوں کو لگ رہا ہے کہ میں پی رہا ہوں، مگر میں بوتل میں پھونک مار کر ومٹو کو ہلکی آواز سے بڑبڑاتا جا رہا ہوں۔ کچھ لوگ تو مبارکباد دے کر چل بھی دیے ہیں۔ آرکسٹرا پر راک این رال کی ٹیون چل رہی ہے۔ کوئی اور سامنے نہیں آیا تو آرکسٹرا والوں میں سے ہی ایک لڑکا، جو کارڈرائے پینٹ پہنے ہے، لان میں سامنے آ کر ناچنے لگتا ہے۔ اپنے جسم کو عجیب عجیب ڈھنگ سے ہلاتا ہے۔ نئی عمر کے لڑکے ڈھکن کھلوا کر ومٹو پھر ہاتھ میں لے لیتے ہیں اور میں ہوں کہ مجھ سے ایک بوتل ہی نہیں پی گئی ہے۔ میں انتظار کرتا ہوں سامنے والوں کے ہٹنے کا— یہ ہٹیں اور میں اس بھیڑ سے کٹ کر الگ ہو جاؤں...

روز مجھے اس کے خط کا انتظار رہتا تھا۔ ایک دن بڑا موٹا لفافہ آیا۔ لکھا تھا، بڑے سنسنی خیز ڈھنگ سے۔

آج میں غضب کی ایک بات لکھ رہا ہوں۔ یاد کرو بڑکے، کہ فارم کی ٹریننگ ختم ہونے پر جب تم یہاں سے گئے تھے، تو یہاں اس نومشکار والی لڑکی کو کیا دے گئے تھے؟...

میں خط ہاتھ میں لیے سوچنے لگتا ہوں... ہاں، میں اپنے فارم سے ایک پودا دے آیا تھا۔ میں

نے پچاسیوں پودے لگائے تھے — گلاب سے لے کر گیندے، گل بکاؤلی تک اور کاسمس سے لے کر کارنیشن، کیکٹس تک۔ جب بھی فرصت میں ہوتا، کھکی سے پھول پودوں کی بات شروع ہو جاتی۔ وہ یہی کہتی، ''پودا تو ایسا ہونا چاہیے دادا، کہ آج لگایا اور کل پھول دینے لگے۔ نہیں تو مہینوں پانی دینے پر پھول آئیں تو کس کام کا وہ پودا؟''

''ہو گئی پھر تم سے باغبانی! پھول کوئی ماں کی طرح مانس پوجا کرنے سے تھوڑے لگتے ہیں! اس کے لیے کرنی ہوتی ہے محنت۔ اب گل بکاؤلی یعنی ٹیولپ میں تو سات سال بعد پھول آتے ہیں... پھر؟''

اس نے اس وقت ٹیولپ کو دنیا کا سب سے بڑا پھول بتلایا تھا۔ مگر میری جب ٹریننگ ختم ہوئی اور میرا سامان بندھ گیا تو کہنے لگی، ''دادا، گل بکاؤلی کا ایک گملا دیتے جاؤ!''

میں نے اسے پاس کھینچ کر اپنے سے دبا لیا تھا، ''اس میں تو سات برس میں پھول آتے ہیں!''

اس نے مجھ سے خود کو ڈھیلا کرتے کہا تھا، ''پھول تو آتے ہیں نا؟''

جب وہ ضد پر ہی آ گئی تو فارم سے گل بکاؤلی کا ایک گملا لا دیا میں نے، اور چلا آیا تھا۔ مجھے کوئی بھی اسٹیشن چھوڑنے نہیں آیا تھا— نہ موشائے، نہ ماں، نہ کھکی۔ کھکی تو اس وقت گل بکاؤلی کو سینچ رہی تھی۔ تو یہی تو میں اسے دے آیا تھا؟...

میں خط آگے پڑھتا ہوں— یاد آیا، بڑکے؟ تم اسے گل بکاؤلی کا پودا دے گئے تھے... اور وہ سات سال سے سینچتی رہی ہے اسے۔ کہتی ہے، وہ گملا جان سے زیادہ پیارا ہے۔ سات سال میں وہ گل بکاؤلی کی طرح جھوم آئی ہے، بڑکے! جوان لڑکیوں کے جسموں پر جوہی، رات رانی، گلاب، گل بکاؤلی جیسے پھولوں کے لگنے کی تدبیر بھی گاڈ کو کرنی چاہیے تھی، مگر بغیر اس کے بھی وہ نومشکار والی ایلوکیشی پوری ایک گارڈن لگتی ہے۔ ہاں، تو کل ہی اس نے بتلایا ہے کہ اس گل بکاؤلی کی عمر سات برس کی ہو گئی ہے اور اس میں پھول لگ آئے ہیں۔ میں نے کہا، تم بڑکے کو لکھ دینا۔ سو، اس خط کے آخر میں اس نے کچھ لکھا ہے، میں ابھی تک بنگلہ حروف سیکھ نہیں سکا، سو پڑھ نہیں سکتا کہ کیا لکھا ہے...

میں اس کی— کھکی کی— لکھاوٹ دیکھنے کو بے تاب ہو جاتا ہوں۔ خط کے صفحے پلٹتا

Scanned with CamScanner

ہوں، موتی جیسے حروف میں لکھا ہے اس نے — آ جی پھوٹل تو مار اُوئی گل بکاؤلی... آج تمھاری اس گل بکاؤلی میں پھول آ گئے... پھول آ گئے آج تمھاری اس گل بکاؤلی میں... اس گل بکاؤلی میں تمھاری، آج آ گئے پھول... خط میرے ہاتھ سے چھوٹ گرا تھا!... کیا وہ فقط نائنتھ میں پڑھتے وقت بھی سب کچھ سمجھتی تھی؟... کیا وہ میرے لیے ہی اتنا کس کر پیٹی باندھتی تھی؟... کیا وہ روبندر سنگیت گونجاتے وقت، اورے، اورے او ابھاگا، کے بول کھینچتی ہوئی میری طرف ہی دیکھتی رہتی تھی؟... کیا وہ میرے بدن میں جھوم جانے کے لیے ہی ''آمی نا'' کہہ کر ''تُمی، تُمی، تُمی'' کی ناراضی بتلاتی تھی؟... مجھے اپنے آپ پر اس دن سا غصہ کبھی اور نہیں آیا۔ لیکن میں تو جیسے دُکھے پہاڑے بھول گیا، ویسے ہی کھکی کو بھی بھول بیٹھا۔ اب کوئی مجھ سے پوچھے، چھبیس پنجے یا ستائیس چھکے یا اٹھائیس اُنّھے، تو میں نہیں بتلا سکتا، منٹوں تک سوچنا ہوگا تب کہیں بتلا سکوں گا۔ ویسے ہی اب کھکی کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ پہلے ہر پودا کھکی، ہر پتا کھکی، ہر پھل کھکی... میں نے ٹریننگ سے لوٹ کر وہاں ایک آدھ خط بھی لکھا تھا۔ ماں، موشائے کہاں خط لکھنے لگے! لیکن کھکی تو خط لکھ سکتی تھی۔ وہ خط لکھتی تو آج پھول آنے کے دن میں یہاں ایسی بے چینی محسوس کرتا کیا؟ اس نے کچھ تو کہا ہوتا... کچھ کہا تو ہوتا... فقط ایک سطر ہی لکھ بھیجتی کہ میں تمھاری گل بکاؤلی کو سینچ رہی ہوں... مگر تب تک کوئی کیسے کچھ سوچتا؟ پانچ پانچ منٹ میں بکل کو ایک ملی میٹر پیچھے ہٹانے والی لڑکی کیا سوچتی؟ ''آمی نا'' کی ضد کر کے مجھے مکیوں سے پیٹنے والی لڑکی کیا کہتی؟ آج میں آدھا گز زیادہ گھیر کے اسکرٹ والی عمر میں گل بکاؤلی میں پھول آنے کے سات لمبے برس جوڑتا ہوں تو میرے سامنے ایڑی چھوتے کیسوں والی کھکی تو مشکار کرتی آ کھڑی ہوتی ہے۔ مگر اب وہ کھکی کیسے؟ جس دن اس نے اسکرٹ پہننا چھوڑا ہوگا اسی دن وہ نام اس کے آدھا گز زیادہ گھیر کے ساتھ گول چکر کھا، نیچے گر گیا ہوگا۔ اب میں وہاں جاؤں بھی تو وہ سامنے آتے شرما جائے گی۔ میں اب اسے نہ بور کہہ پاؤں گا، نہ بوکا ہی۔ اس کی عمر میں سات برس جڑے تو میں کابلی والا ہو گیا۔ کل شام جیل سے چھوٹا کابلی والا اپنے بھائی کا خط پڑھتا ہے —

لیکن بڑکے، میں نے کبھی گل بکاؤلی، دیکھی ہی نہیں۔ اس نے کل دکھانے کا وعدہ کیا ہے۔ اب کل پھول دیکھ کر آگے لکھوں گا۔ کالج بھی جانا ہے، آج لڑکوں کے پریکٹیکل ہیں۔

لیکن پھول کیسے لگ آئے؟ خط میرے ہاتھ میں بے جان پنچھی کی طرح تھا اور میں پنکھ پھیلائے بھٹک رہا تھا۔ قلم گلاب کی لگتی ہے، گل بکاؤلی کی نہیں۔ کھکی جب بہت ہی پیچھے پڑ گئی تو ایک گملے میں میں نے مٹی بھری اور ٹیولپ کی ایک ٹہنی اس میں لگا کر اسے دے آیا تھا۔ وہ ٹہنی تو دو یا تین یا حد سے حد چار دنوں میں سوکھ گئی ہوگی۔ مجھے ایسا مذاق نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ سوکھی ٹہنی کو پانی دیتی رہی ہوگی...

ہاں، تو ابھی میں اس نومشکا روالی ایلوکیشی کے صحن سے آ رہا ہوں۔ اس نے کہا، میں روز سویرے اور شام پانی دیتی رہی۔ گل بکاؤلی میں نئی نئی پتیاں آئیں، پودا پھوٹ گیا۔ پیلی پتیاں میں توڑ دیتی اور نئی کونپلوں، اکھووں کو پوستی۔ سات سال بیتے اور کل اس میں پھول آ گئے۔ دیکھو وہ رہا گملا! اور بڑکے، اس نے جس طرف انگلی اٹھائی، اس طرف میں نے دیکھا۔ ایک مٹی بھرا گملا پڑا تھا، اس میں نہ کوئی پودا تھا، نہ ٹہنی، نہ کونپل، نہ اکھوا نہ پھول۔ میں نے ہنس کر کہا، آپ تو مذاق کر رہی ہیں، تو وہ بھی ہنس دی۔ بولی، آپ میری بات کو بیکار میں سیریسلی لے رہے ہیں۔ وہ ہنستی ہی رہی اور کہنے لگی، ماں جیسے بھگوان کی مانس پوجا کرتی ہیں، ویسے ہی میں گل بکاؤلی کی مانس پوجا کرتی رہی۔ میں تو، بڑکے، بات سن کر ٹھٹکا ہی رہ گیا...

میں خط آگے نہیں پڑھ سکا۔ خط ہیں کہ کوئی لمبی کہانی جیسے! اور یہ کھکی مانس پوجا کرنے لگی — آنکھیں میچے بیٹھے بیٹھے روبندر کے گیت گاتی رہی اور گل بکاؤلی کے پھول کھلا لیے اس نے۔ لیکن وہ پھول کسے دکھاؤں اب؟ اپنے بچوں سے کہوں کہ آؤ بیٹا، تمھارے پاپا کے لیے کسی نے گل بکاؤلی کے پھول کھلائے ہیں؟...

لوگ راک این رول ختم ہونے پر تالیاں پیٹ پیٹ کر خوشیوں کے پھول کھلا رہے ہیں۔ مجھے بھی تالی بجانا چاہیے تھا، مگر میں نہیں بجاتا... اب بجادوں؟ مگر جب سب چپ ہیں تب تالی بجانا تو اور بھی عجوبہ لگے گا، سو چپ بھلا۔ میں پھر وہی ومٹو منھ سے لگا لیتا ہوں۔ تھوک سے بھیگ کر اسٹرا کی کمر لچک گئی ہے۔ سو اسے نکال دیتا ہوں اور ویسے ہی بوتل سے ایک گھونٹ پیتا ہوں۔ سامنے سے کوئی آ رہا ہے۔ کہتا ہے، ''ہیلو!'' میں بھی ''ہیلو'' تو کہتا ہوں، مگر اسے پہچانتا نہیں۔ وہ مذاق میں، مجھے بوتل

سے ومٹو پیتے دیکھ ہاتھ آگے بڑھا کر کہتا ہے، ''سمیل پلیز!'' میں یوں ہی اپنی بوتل اس کی ناک تک لے جاتا ہوں۔ وہ اسے ہلکے سے سونگھ کر بڑی ادا سے کہتا ہے، ''سوری، مجھے شک ہوا تھا!'' اور اپنے منھ میں اسٹرا گھماتا آگے بڑھ جاتا ہے۔ بالکل جوکر سا لگ رہا ہے، لیکن مجھے ہنسی ہی نہیں آتی۔ لاکھ چاہوں، پھر بھی نہیں ہنس سکتا۔

اور لاکھ چاہے بھی کھکی کے بارے میں سوچے بغیر نہیں رہ سکتا۔ چھٹو اس کی تعریف کے پل اپنے خطوں میں اکثر باندھا کرتا اور میں اس کے خطوں کو لیے گھنٹوں جانے کیا کیا سوچتا رہتا۔ بیوی بچے میرے سپنوں کے چلتے وقت بیچ میں پڑ جاتے تو سنیاسی ہونے کی طبیعت ہو آتی۔ ایک بار چھٹو نے پوچھا— تو بڑکے، ایک بات پوچھتے ہیں کہ نومشکار والی یہ ایلوکیشی ہے کیسی لڑکی؟ مجھے تو، گستاخی معاف، بڑی بور لگتی ہے... بور! بور! بووور! نا آمی نا... تُمی تُمی، تُمی! میں اسی وقت پیڈ سے ایک ورق پھاڑتا ہوں اور چھٹو کو خط لکھتا ہوں—

نہیں چھٹو، وہ بڑی اچھی لڑکی ہے، بور تو ہو ہی نہیں سکتی۔ یوں ہی بنگالی لڑکیاں بڑی اچھی ہوتی ہیں اور وہ تو بے حد میٹھی ہے، وہ تو جیسے سنسکرتی کی ایک لکیر ہے...

میں لکھتا ہی چلا گیا۔ جب خط دوبارہ پڑھا تو سوچا کہ چھٹو میرے اس لکھے کو پڑھ کر جانے کیا سوچے گا؟ مگر کھکی کے بارے میں لکھتا ہوں تو لکھے ہی چلا جاتا ہوں۔ کھکی کا بھرا بدن پہلے پانی سے بھیگی مٹی سی سگندھ دیتا ہے۔ اس کا آدھا گز زیادہ کا گھیر جوہی کے منڈوے سا لگتا ہے۔ اس کی خوب کسی ہوئی چوٹی کے اوپر کا حصہ مور پنکھی کی بناوٹ سا لگتا ہے... میں کیسے نہ لکھتا کھکی کی تعریف! لوٹتے وقت ایسا لگتا رہا تھا مجھے جیسے کھکی کا یہ باہر کو برس پڑتا سا جسم میرے ہاتھوں کا ہی بنایا ہوا ہے۔ وہ تو موشائے کی ایک قلم تھی، میں نے ہی اس پر ڈھیروں پھولوں کو ڈالا تھا... یہ خود کلامی میرے دل میں آپ ہی آپ چلتی رہی۔

لیکن ایک دن چھٹو کے خط نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے کھکی کی خبر جاننے کے لیے لفافہ پھاڑا تھا، مگر یہ کیا لکھا... میں جیسے اُبل پڑا۔ ایسا لگنے لگا، جیسے جوالا مکھی ضبط ہی نہیں ہو پا رہا ہے—

بڑکے، کبھی زندگی میں ممکن ہوا تو ہم دونوں ایک فلم بنائیں گے۔ میرے ساتھ ایسا ہوا ہے کہ

Scanned with CamScanner

پو چھومت! ڈیٹیل میں تو نہیں لکھ سکوں گا، لیکن جو کچھ لکھوں اس سے اندازہ لگا لینا۔ وہی نومشکا روالی ایلوکیشی کوئی ایسا گیت گا رہی تھی، جس میں اُبھا گا لفظ بار بار آتا تھا۔ اور وہ اسے گاتے ہوئے میری طرف دیکھ لیتی۔ کل شام ایک عجیب بات ہوئی کہ وہ بالوں میں جوڑے کے لیے صحن میں بیٹھی گرہ لگا رہی تھی۔ بڑکے، میں نے اس کے اٹھے ہوئے ہاتھوں کو اوپر ہی تھام لیا۔ پھر میں تو ایسا ہو گیا، جیسے کاٹو تو خون نہیں۔ موشائے نے دیکھ لیا تھا۔ میں نے پہلے خط میں لکھا تھا نا، بوڑھے آدمیوں میں موشائے مجھے بہت پیارے لگے ہیں، سو انھوں نے مجھے اپنے سامنے بٹھا لیا اور ہم دونوں سے پوچھا کہ کیا ہم ایک دوسرے کو چاہتے ہیں؟ میں نے، بڑکے، تم سے پوچھے بغیر کبھی کچھ نہیں کیا، مگر اس بار تو ''ہاں'' کہہ دیا۔ میں تو اَچرج کی منجدھار میں ڈوب گیا جب نومشکا روالی ایلوکیشی کا سر بھی ''ہاں'' میں ہل گیا۔ لیکن قہر یہ برسا کہ ماں ناراض ہے، بے حد ناراض۔ موشائے نے یہ کہا ہے کہ وہ انھیں ٹھیک کر لیں گے۔ بولو، بڑکے، میں کیا کروں؟ وہاں اماں کا ڈر ہے۔ کہیں یہ بات سن کر ان کا بلڈ پریشر نہ بڑھ جائے۔ تم انھیں تسلی دے دینا اور دیکھ بھال کرنا۔ جلدی جواب دو۔ میں بڑی پریشانی میں ہوں۔

میں نے خط کو ہاتھ میں موڑ کر پھینک دیا۔ یہ نہیں ہوسکتا... کیسے ہوسکتا ہے یہ؟ نہیں، چھٹو اس کھکی سے شادی نہیں کرے گا!... تو کھکی کی تعریف کا یہ مطلب تھا، یہ مطلب کہ کنور صاحب دل دے بیٹھے اسے! کیا گل بکاؤلی کی باتیں ان کی محبت کی تمہید تھی؟ بڑکے کو ہی بنا دیا اس چھوکرے نے! جس تھالی میں کھایا اسی میں چھید!... میں اپنے چھوٹے سے، اندر جو کچھ محسوس کر رہا تھا، کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں غصے میں تقریباً پیر پٹکتا اٹھا اور پوجا پر بیٹھی اماں کے سامنے چلاّ پڑا۔ ''سنا اماں، چھٹو وہاں نوکری کرنے نہیں، ایک بنگالی چھوکری کے جادو سے مینڈھا بننے گیا ہے!...'' اماں دنگ رہ گئیں۔ بیوی روٹی بیلتے میں وہیں کی وہیں رک گئی۔ بولی، ''ذرا سمجھا کر خط تو لکھو۔ وہ تو تمھیں سب کچھ سمجھتا ہے۔''

اماں سے کہا تو کچھ نہیں گیا، لیکن ان کے تر پن میں دیوتا بغیر نہائے، دہی ملے ہی پڑے رہے۔ بولیں تو یہ، ''چھٹو کو لکھ دے کہ اپنے باپ کی ناک نہ کٹوائے، اور ایسا ہی کرنا ہے تو سمجھ لے وہ کہ ہم سب مر گئے۔''

اماں کا بلڈ پریشر بڑھ گیا۔ میں نے انھیں گولی دی۔ بیوی پنکھا کرنے لگی۔ میں کمرے میں

Scanned with CamScanner

ٹہلتے ہوے سوچنے لگا، مجھے اماں سے نہیں کہنا چاہیے تھا... مگر یہ شادی نہیں ہوگی!... وہ بنگالن سے تو کیا کسی چمارن سے بھی شادی کرتا تو میں راضی ہو جاتا، اماں کو بھی منا لیتا، لیکن کھکی سے وہ شادی کرے، یہ کیسے ہوسکتا ہے!...

تھوڑی دیر دکھ منا کر اماں سو گئیں۔ بچے کھیلنے لگے۔ بیوی کپڑے دھونے لگی اور میں کرسی پر بیٹھا چھٹو کو بے حد غصے میں خط لکھنے لگا—

تم نے یہ سوچا ہوتا کہ جو لڑکی تمھارے بڑکے میں دلچسپی لے سکتی ہے، وہی ایک منٹ میں تم سے شادی کرنے کو کیسے تیار ہو جائے گی؟... اور اگر تیار ہو جاتی ہے تو اس لڑکی کا کیا کردار...

سوالیہ نشان پھن پھیلا کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا— جو لڑکی سات برس تک گل بکاؤلی میں پھول آنے کی آس کر سکتی ہے، اسی کے کردار کا سوال، تم... تم... تین بچوں کے پاپا اٹھا رہے ہو؟... میں نے وہ کاغذ پھاڑ کر پھینک دیا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ مجھے ذرا ٹھنڈے دل سے اس پر غور کرنا چاہیے... میں سر پر ہاتھ رکھے بیٹھ گیا... مانا وہ لمبے بالوں والی ہے، اس کے کیس ایڑی چھوتے ہیں، وہ ایلوکیشی ہے... مگر میرا اپنا چھوٹا بھائی، میرا چھٹو اسی سے شادی کرے اور بعد میں اسے پتا لگے، وہ مجھ کو لے کر سپنے پال رہی تھی، تو؟... ہمارے گھر کی عمارت میں دراڑ پڑ جائے گی... چھٹو کے لیے تو میں ایسی اچھی بیوی لاؤں گا کہ... میری حالت پاگل پن کی حد کو چھونے لگی جیسے... لیکن ان دونوں کے دلوں پر کیا بیتے گی؟ میرے ہی دل میں سے یہ ایک غدار آواز آئی— چھٹو اس سے شادی کر بھی لے تو کیا برا ہے؟ بھائی، وہ تو سب اب بیت گیا۔ تم اگر غیر شادی شدہ ہوتے تو بات الگ تھی۔ ناؤ تیزی سے بہتے بہتے جیسے کنارے کی کاٹ میں پھنس گئی ہو... ہاں، تب میں بہت چھوٹا تھا، اماں پوجا پر بیٹھی تھیں۔ ہمارے گھر ستیہ نارائن[۳] کی کتھا تھی۔ شہد بپّا کی دوائی میں ختم ہو گیا تھا۔ پنچ امرت[۴] میں ایک امرت کی کمی تھی۔ اماں بولیں، ''بڑکے پیالی لے کے جا اور پروہت جی کے گھر سے تھوڑا شہد تو لے آ۔ ہاتھ دھو کر پیالی اٹھانا، پوجا کے لیے چاہیے۔'' میں پیالی لے کر گیا تھا۔ پروہت جی نے شہد دیا۔ ایسا اچھا شہد کہ میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ گلی سونی تھی۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا، دور تک کوئی نہیں

---

[۳] ستیہ نارائن: بھگوان وشنو کا ایک نام۔ رسم کے مطابق لوگ کسی گھر میں اکٹھے ہو کر ان کی کتھا سنتے ہیں۔

[۴] پنچ اَمرت: ایک قسم کی شیرینی جو پانچ چیزوں — دودھ، دہی، گھی، شہد اور شکر — کو ملا کر بنائی جاتی ہے۔

Scanned with CamScanner

تھا۔ میں پیالی اپنے منھ کے قریب لایا اور زبان آگے بڑھا تھوڑا سا شہد چاٹ لیا۔ میں نے اس سے پہلے کبھی شہد نہیں چکھا تھا اور میں اس سونی گلی میں، ہاتھ میں شہد لیے، اپنے آپ کو روک ہی نہیں پایا تھا۔ گھر آ کر پیالی اماں کے ہاتھوں دینے والا تھا کہ ہاتھ کانپ گئے تھے۔ اماں نے جانے کیسے تاڑ لیا تھا۔ ''اسے جوٹھا تو نہیں کر دیا؟'' میں چپ کھڑا رہا۔ چاہتا تو کہہ سکتا تھا، میں نے اسے چھوا بھی نہیں۔ اماں یقین بھی کر لیتیں۔ مگر میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا۔ لگا تھا، اگر میں جھوٹ بولا تو آج لیلاوتی، کلاوتی میرے گھر میں آگ لگوا دیں گی۔ میرے ہاتھ سے پیالی چھوٹ پڑی تھی۔ میں مضبوط لفظوں میں بول گیا تھا، ''اماں، میں نے اسے چکھ لیا، یہ جوٹھا ہے... ''اور میں، وہی بڑکے ہوں، جس کے دل میں یہ خیال آ رہا ہے کہ چھٹو کھکی سے بیاہ کر بھی لے تو کیا برا ہے؟ پھر کیوں نہیں کہہ دیا تھا کہ اماں، میں نے شہد کو چھوا بھی نہیں؟

میں چہرے پر سے پسینہ پونچھ لیتا ہوں اور ایک لمحے میں اس فیصلے پر پہنچ جاتا ہوں کہ یہ شادی نہیں ہوگی۔ یہ بھی سوچتا ہوں کہ دل کے طوفان کو بتانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ سیدھے سے مضبوط لفظوں میں ایک خط لکھ دیتا ہوں۔ ''چھٹو، تمھارا خط ملا۔ میری رائے سے یہ شادی ٹھیک نہیں۔ تم جیسے قابل لڑکے کے لیے ہزار ایلو کیشیاں مل جائیں گی۔ کسی لڑکی کا اچھا ہونا ایک بات ہے اور اچھی بہو ہونا بالکل دوسری بات ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میری بات کو تم سنجیدگی سے سوچو گے۔''

میں خط لفافے میں رکھ ہی رہا تھا کہ پوسٹ مین ایک ایکسپریس دے گیا۔ لفافہ چھٹو کا تھا۔ جلدی میں اس نے لکھا تھا—

''میرا ایک خط ملا ہوگا۔ یہاں بات بہت الجھ گئی تھی۔ مگر موشائے کی رائے سے ہم نے کل رات آریہ سماج میں شادی کر لی۔ ماں کو کچھ بخار تو آیا ہے، لیکن میرا یقین ہے کہ وہ ہمیں معاف کر دیں گی۔ بڑکے، میری جگہ تم ہوتے اور الجھن ایسی آ جاتی، تو اسے تم بھی اسی طرح سلجھاتے۔ اب انتیس، بدھ کی شام پارٹی ہے۔ تم ایک دم آ جاؤ۔ پھر میں چھٹی لے کر گھر چلوں گا۔ وہاں اماں کو سمجھانا تمھارا کام ہوگا...''

میں سر ڈال کر آرام کرسی پر لیٹ گیا۔ اب میرے دل میں کوئی طوفان نہیں، کوئی ٹکراؤ نہیں۔ میں ایک ہارا ہوا، پست آدمی ہوں۔

Scanned with CamScanner

مجھے ایسا ٹنڈ حال دیکھ کر بیوی پاس آتی ہے۔ چھٹو کا ایکسپریس پڑھتی ہے اور مسکراتی ہے۔ کہتی ہے، "للا تو ایک دم ضدی اور موجی رام ہیں۔ مگر ہوا سو ہوا۔ میں تمھارے کپڑے رکھے دیتی ہوں۔ آخر تمھارے چھٹو کی ہی شادی تو ہوئی ہے۔ جاؤ، آج ہی چلے جاؤ۔ وہاں پارٹی کے وقت تک پہنچ جاؤ گے۔ ان دونوں کو ساتھ لے آنا، تب تک میں اماں کو منا لوں گی۔ دیکھوں تو، للا کی وہ بنگالن کیسی جادوگرنی ہے!..."

میں چپ چاپ یہاں آ گیا۔ ایک لفظ بھی نہیں بولا۔ بولتا بھی کیا؟

ایٹ ہوم چل رہا ہے۔ اب میں کر ہی کیا سکتا ہوں سوائے اس کے کہ کہیں اکیلے میں بیٹھ کر اپنے ہاتھ ملوں اور آنکھیں بند کر سوچتا... سوچتا ہی چلا جاؤں۔ اب میں ایسا کر سکتا ہوں کیونکہ بغیر کچھ کھائے ہی میں نے چمچ پلیٹ رکھ دیے ہیں، اب میرے ہاتھ میں وہ مٹو بھی نہیں ہے۔ کبھی قریب قریب جا چکے ہیں۔ چھٹو اور کھکی... کھکی نہیں نومشکا روالی ایلوکیشی میرے پاس آتی ہے۔

"اب تو غصہ دور کرو، بڑکے!" چھٹو میرے گلے میں ہاتھ ڈال دیتا ہے۔

میں اس کے ساتھ ہو لیتا ہوں۔

"چلیے نا، پریزنٹس دیکھیں!"

ہم تینوں وہاں آتے ہیں۔

"تم اگر ناراض ہو بڑکے، تو میں اسے طلاق دے دیتا ہوں!" چھٹو نے کہا ہے، اور کھکی... کھکی نہیں نومشکا روالی ایلوکیشی، ہنسنے لگی ہے۔

میں اپنے دل میں کچھ عجیب سا محسوس کرتا ہوں، اس لیے بناوٹی مسکراہٹ سے انجان بنا رہنا چاہتا ہوں۔

"ارے، یہ کیا؟ یہ بھی تحفہ ہے کیا؟" چھٹو ایک چھوٹی سی ٹوکری میں گدرائے ہوئے بیروں کو دکھاتا پوچھتا ہے۔

"ہمارے یہاں ایک چھابڑی والی روز سبزی دینے آتی ہے۔ وہی یہ بیر دے گئی ہے۔" وہ ایک بیر اٹھا لیتی ہے۔

"اوہو!" چھٹو کہہ رہا ہے، "یہ بیر تو بالکل تمھارے جیسے ہیں۔" شاید اس کا اشارہ گدرائے پن

کی جانب ہو — اس کو میری بالکل شرم نہیں!

''ہاں،'' کھٹی ... کھٹی نہیں نومشکار والی ایلوکیشی، ہنستی ہوئی کہتی ہے،'' مجھ جیسے ہی کھٹے ہیں!''

''نہیں جی! کیوں، بڑکے؟'' وہ میری طرف دیکھتا ہے، پھر اس سے کہتا ہے، ''تم اگر کھٹی ہوتیں تو بڑکے تمھاری کبھی تعریف نہ کرتے!... اور اگر ان کو تم نہ جانتی ہوتیں تو میں تم سے کبھی شادی نہ کرتا۔ تم میٹھی ہو، یہ بڑکے نے ہی تو لکھا تھا۔''

میرا سب کچھ جیسے ختم گیا ہے — ایک دھاگا ٹوٹا تو کر گھار ک گیا ہے جیسے...

وہ دونوں بیر کھا رہے ہیں، میں ان کی طرف دیکھ رہا ہوں، دیکھے جا رہا ہوں۔ بیر میٹھے ہیں، میٹھے ہی ہیں، میں جانتا ہوں، اسی لیے چپ ہوں۔

❊❊

Scanned with CamScanner

دھیریندر استھانا

ہندی سے ترجمہ: ماجد حسن

مانسی

''مانسی! مانسی! مانسی!''

بہت شور تھا مانسی کا۔ چار ایک ہزار مکانوں والی اس متوسط طبقے کی کالونی کا کھمبا جیسے مانسی کے وجود میں مگن ہوا، خاموش کھڑا تھا۔ جتنے منھ اتنی باتیں۔ لیکن کمال یہ ہے کہ ساری باتیں یا تو مانسی کی تعریف میں تھیں یا مانسی کی مذمت میں۔ جیسے مانسی نہ ہوتی تو لوگوں کی گویائی جاتی رہتی اور گھروں میں نحوست چھا جاتی۔ جوان لڑکوں کے دلوں کو اجڑنے سے اور عورتوں کو آپس میں ٹکرانے سے مانسی ہی نے روکا ہوا تھا۔ صبح، دوپہر، شام، عورتوں میں ایک ہی ذکر رہتا...

مانسی چلتی بہت شان سے ہے... مانسی سنورتی بہت آن سے ہے... مانسی بولتی بہت سلیقے سے ہے... مانسی ہنستی بہت قاعدے سے ہے... مانسی کو ڈانس بہت اچھا آتا ہے... مانسی گاتی بہت سریلا ہے... مانسی بڑوں کا احترام کرتی ہے... مانسی چھوٹوں کو پیار کرتی ہے... مانسی نے جب جیوگرافی سے انٹر میں دلّی ٹاپ کیا تو راج دھانی کے سارے اخباروں میں اس کے فوٹو چھپے... مانسی کالونی کی توقیر ہے۔ مانسی بہت صلح جو ہے، نیک خو اور مہذب لڑکی ہے... مانسی نظمیں لکھتی ہے... مانسی کو گھومنے کا بہت شوق ہے... مانسی کو اتنا آزاد نہیں ہونا چاہیے... اُس کی سنگت سے کالونی کی باقی لڑکیاں بھی بگڑ رہی ہیں... مانسی کو چھاتی پر دوپٹا ڈال کر رہنا چاہیے... مانسی دیر رات تک باہر کیوں رہتی ہے؟... جب گھر میں ٹی وی موجود ہے تو ناٹک دیکھنے کے لیے تھیئٹر جانا کیوں ضروری ہے؟... مانسی جینز کیوں پہنتی

Scanned with CamScanner

ہے؟... مانسی کو مرانڈا کالج میں داخلہ نہیں لینا چاہیے تھا... جوان لڑکے اور اُن کے پتا جس طرح مانسی کو دیکھ ایک ساتھ رال ٹپکاتے ہیں، وہ کیا اچھی بات ہے؟... مانسی کے ماں باپ اُسے دبا کر کیوں نہیں رکھتے؟... مانسی کی وجہ سے کئی گھروں میں میاں بیوی کے بیچ تکرار ہو چکی ہے... مانسی بدچلن ہے...

کسی لڑکی کا اتنا شور ہو اور اُس تک نہ پہنچے، ایسا کیسے ممکن تھا۔ وہ جو ہر لڑکی کے اندر ایک ہیروئن تلاش کرنے لگتا تھا، کب تک مانسی سے بچا رہتا؟ صبح صبح گھر سے نکل کر رات بارہ ایک بجے تک گھر سے باہر رہنے کے باوجود مانسی کا شور اس تک پہنچ ہی گیا اور جب شور پہنچا تو دل کے کسی کونے میں السائی پڑی ہیروئن اس کے ذہن میں کسی قدیم خواہش کی طرح اُبھر آئی۔

''کون ہے مانسی؟'' ایک رات اُس نے اپنی بیوی سے پوچھ ہی لیا۔

بیوی اس وقت میز پر کھانا لگا رہی تھی۔ اس کا سوال سن کر وہ نہ صرف چونک گئی، بلکہ چوکنی بھی ہوگئی۔ پہلے وہ تنائی، پھر مسکرائی اور پھر بے حد سنجیدگی سے بولی، ''تمھاری بیٹی کے برابر ہے۔''

''چھتیس سال کے کسی آدمی کی چوبیس سال کی بیٹی ہو ہی نہیں سکتی،'' اُس نے مذاق کے انداز میں کہا اور مسکرا دیا۔

''ارے باپ رے!'' بیوی لگ بھگ چیخ ہی پڑی، ''تمھیں تو اس کی عمر تک پتا ہے۔''

جوابی جواب پر وہ پھر مسکرا دیا۔

''میں تمھاری نس نس سے واقف ہوں،'' بیوی نے چڑ کر کہا۔ پھر چڑاتے ہوئے بولی، ''ویسے بے فکر رہو، تمھیں گھاس نہیں ڈالنے والی وہ۔''

''تجھے پتا ہے میں گھاس نہیں کھاتا،'' اس نے فوراً جواب دیا اور بیوی کو پکڑ لیا۔

اور اس طرح مانسی اس کے گھر میں بھی آ کر پسر گئی۔

اُسے صحافت کے ایک قومی انعام سے نوازا گیا تھا۔ رات ٹیلی وژن کی خبروں میں اس انعام کی اطلاع کے ساتھ اس کا چہرہ بھی پورے ملک کو دکھایا گیا تھا اور آج صبح کے بھی بڑے اخباروں میں اس کی تصویریں چھپی ہوئی تھیں۔ صحافت میں اس کے ادا کردہ حصے، افکار، رجحانوں، کامیابیوں اور نکھرشوں کا بھی تفصیل سے ذکر کیا گیا تھا۔ لگ بھگ اپنے آپ میں مگن، بولایا ہوا سا، وہ اخباروں

Scanned with CamScanner

میں ڈوبا ہوا تھا کہ ہاتھ میں اخبار لیے لگ بھگ دوڑتے ہوے ایک لڑکی اندر داخل ہوئی اور ہانپتے ہوے بولی، ''آنٹی! انکل کو اتنا بڑا انعام ملا...'' اس سے آگے کی بات وہ پوری نہیں کر پائی اور آہستہ سے بولی، ''آنٹی کہاں ہیں؟''

''تم؟'' وہ تھوڑا پریشان ہو گیا۔

''میں، مانسی... ''لڑکی نے شرما کر کہا۔

''مانسی؟'' وہ حیران ہو گیا۔

''آنٹی نہیں ہیں؟'' لڑکی رک رک کر بولی، ''میں بعد میں آؤں گی۔ ویسے آپ کو مبارک!'' اُس نے لگ بھگ اِترا کر کہا، ''مجھے پتا نہیں تھا کہ آپ اتنے بڑے آدمی ہیں۔''

''ارے نہیں... '' وہ ابھی تک گھبرایا ہوا تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ کچھ اور کہتا، مانسی اُسی طرح دوڑتی چلی گئی جس طرح آئی تھی — بالکل کسی سپنے کی طرح۔

مانسی جا چکی تھی لیکن وہ ابھی تک اسی سمت میں دیکھ رہا تھا جہاں سے وہ نمودار ہوئی تھی۔

''تم سچ مچ ایک سپنا ہو،'' وہ بڑبڑایا۔ ''نہیں، تم سپنا نہیں، سپنے اور حقیقت کے بیچوں بیچ کھڑی ایک فینٹسی ہو،'' اس نے سوچا۔ اچانک وہ اداس ہو گیا کہ مانسی نے اس کے لیے 'انکل' کا لفظ استعمال کیا۔ اسے دکھ ہوا کہ مانسی اُسے بیوی کے ساتھ اپنے رشتے کے حوالے سے جانتی ہے۔ اسے افسوس ہوا کہ آئیڈیل ہیروئن جیسی مانسی سے وہ اب تک ناواقف رہا۔

''مانسی! تم اتنی دیر میں کیوں آئیں؟'' اس نے سوچا اور اپنے کو بہت اکیلا، ناامید اور مایوس محسوس کیا۔ انعام کے سرور میں دفعتاً مانسی کی کمی اس نے اپنے ذہن پر طاری ہوتے محسوس کی اور اپنی بے چارگی سے تار تار ہو گیا۔ اس نے تمام اخبار سمیٹ کر ایک طرف رکھ دیے اور کرسی پر آرام کی حالت میں پسر گیا۔

کتنا مجبور ہے وہ، اس نے سوچا، کہ مانسی سے متعارف ہونے کے راستے پر سُنیتا کھڑی ہوئی ہے — اس کی بیوی، اپنے تمام حقوق سے لدی پھندی۔ جب تک سنیتا کی آنکھیں اجازت نہ دیں، تب تک وہ مانسی سے بولنا تو دور، اسے اپنے قریب دیکھ بھی نہیں سکتا۔ ہر وقت ناطمینانی اور بے چینی میں ڈوبا رہنے والا اس کا دل ایکا ایک، ایک ٹھوس گھبراہٹ سے ٹکرا کر کڑھنے لگا۔

Scanned with CamScanner

اچانک ایک بے حد سخت اور ننگا سوال کیا اس نے اپنے آپ سے — مانسی کیوں چاہیے اسے؟ ایسا خوبصورت یا آئیڈیل آدمی نہیں ہے وہ کہ سنسار کی تمام سندر اور سمجھ دار عورتیں اس کی تمنا کرنے لگیں۔ تو پھر وہ کیوں کرتا ہے ایسی تمنائیں جو ناممکن ہوں اور جن کے پورا نہ ہونے کی صورت میں وہ خواہ مخواہ کی تکلیف میں کھیل کھیل ہونے لگے! لیکن وہ صرف سوال تھا، ایسا سوال جس کا جواب پا کر آدمی خود کو پالتو اور گھریلو قسم کی لجلجی شخصیت میں تبدیل ہوا محسوس کرتا ہے۔ اس لیے سوال سوال ہی رہا، اس کی تکلیف کو کم نہیں کر پایا۔ پھر اسے لگا، ایسے بے کار اور تکلیف دہ سوالوں سے الجھنے کا کوئی فائدہ ہی نہیں ہے۔ مانسیاں ایسے سوالوں کے پار کھڑی رہ کر دھڑکا کرتی ہیں۔ مانسیاں نہ ہوں تو آدمی نہ رچ سکے اور نہ ہی جی سکے۔ اس کٹھن اور خود غرض سنسار کو مانسیاں ہی کومل، پاکیزہ اور پیارا بناتی آئی ہیں آج تک۔ مانسی کے بارے میں اس طرح سوچنا اچھا لگا اسے، اور اچانک اس نے پایا کہ ایک راگنی کی طرح بج رہی ہے مانسی اس کے دل میں۔

منٹ کے ساٹھویں حصے میں دیکھ لیا تھا اس نے کہ مانسی عورت کے وجود کا نہیں عورت ہونے کی شرطوں اور احساس کا عکس ہے۔ اس کا تیزی سے آنا، ٹھٹکنا، لجانا، اترانا اور اس کے بڑپن کو گہری عقیدت سے قبول کر کے سپنے کی طرح اوجھل ہو جانا۔ اتنا کچھ ایک ساتھ دیکھ اور محسوس کر کے کون نہیں چاہے گا کہ مانسی صرف اسی کے خون میں ایک ابال کی طرح موجود رہے۔ اس نے دیکھا تھا، ان کچھ ہی معجزاتی سے لمحوں میں اس نے دیکھا تھا کہ مانسی سپنے دیکھنے کا سلیقہ بھی جانتی ہے اور انھیں پورا کرنے کا طریقہ بھی۔ وہ دبنگ بھی ہے اور منکسر بھی۔ وہ آزاد رہ سکتی ہے اور آزاد رکھ بھی سکتی ہے۔ وہ خود سپردگی کرا بھی سکتی ہے اور خود کو سپرد کرنے میں بھی اسے پس وپیش یا جھجک نہیں ہوگی۔ وہ ساتھ ہو تو حقوق کے باہمی جھگڑے کی نہیں، حقوق کی بقائے باہمی کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔ مانسی تخریب کا نہیں تخلیق کا بلاوا ہے جیسے۔ اور جیسے بھی ہو، یہ تخلیق کرنا ہی ہے اسے۔ خود کو تباہ کر کے بھی اس تخلیق کو ممکن کرنا ہے، کیونکہ تخلیق ہونے کے لیے بے چین اور مضطرب مانسیاں سڑکوں پر نہیں کھڑی رہتیں — انھیں کھوجنا ہوتا ہے۔ وہ خود کیا پچھلے لمبے عرصے سے اس کھوج میں نہیں لگا ہوا ہے؟

اس کی آنکھیں بے اختیار نم ہو آئیں۔ اسے لگا، مانسی کے روپ میں اسے برسوں سے کھوئی ہوئی نایاب چیز دکھائی دے گئی ہے۔ اس کا رواں رواں کہہ رہا تھا کہ مانسی پھر آئے گی۔ مانسی آتی رہے

Scanned with CamScanner

گی۔ مانسی کا آنا اور اس کے ساتھ مل کر ایک شاہکار خواب کو تخلیق کرنا تو کسی پوتر گرنتھ میں درج منتروں کی طرح پہلے سے لکھا جا چکا ہے۔

بیوی حیران تھی۔ وہ یہ ماننے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھی کہ اَروند سدھر سکتا ہے۔ لیکن اس سچائی سے بھی وہ کیسے انکار سکتی تھی کہ پچھلے کافی عرصے سے اروند اپنی ہر چھٹی گھر پر گزارنے لگا تھا اور شام کو سات آٹھ بجے تک لوٹ آتا تھا۔ شراب پینا اس نے نہیں چھوڑا تھا، لیکن یہ سکھ بھی کم نہیں تھا کہ پچھلے کافی وقت سے اس کی نجی ڈائری میں اروند کی طرف سے ملی کسی اذیت کا کوئی ذکر درج نہیں ہوا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اروند کی زندگی میں آیا یہ انقلاب مانسی کی بدولت ہے۔ لیکن مانسی کی وجہ سے اسے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ اروند کو 'انکل' اور اسے 'آنٹی' کہتی تھی اور ویسا ہی احترام کا برتاؤ کرتی تھی۔ پھر مانسی اروند کی موجودگی میں کبھی گھر نہیں آتی تھی، اس لیے بھی اسے مانسی کی طرف سے کوئی فکر نہیں تھی۔ اروند کی عیش پسند طبیعت کی جانکاری تھی سنیتا کو، لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اروند کے لیے اس کی شہرت اور مقام اتنی بڑی لکشمن ریکھا ہے جسے لانگھ کر وہ کوئی کام نہیں کر سکتا اور اس کالونی میں تو قطعی نہیں۔ اس لیے اس طرف سے وہ بالکل مطمئن تھی کہ مانسی کی موجودگی اس کے ازدواجی تعلقات میں کسی خرابی کی طرح داخل ہو سکتی ہے؛ لیکن اس اتنی ذہین لیکن سپنوں میں ڈوبی رہنے والی لڑکی کا اروند سے لگاؤ اسے خود مانسی کے لیے مفید نہیں لگتا تھا۔ اروند کی غیر موجودگی میں مانسی اس کے پینوں، اس کی کتابوں اور کسی نہ کسی بہانے اس کے کپڑوں کو جس انداز میں چھوتی، مس کرتی تھی، اس سے ڈر بھی لگتا تھا سنیتا کو۔ سنیتا کے توسط سے اروند کی کتنی ہی پسندیدہ عادتوں کو گہرائی سے جان گئی تھی مانسی۔ وہ کسی بھی شام ہاتھ میں کٹوری لیے چلی آتی: ''آنٹی، یہ بھرواں کریلے۔ انکل کو پسند ہیں نا؟'' یا ''آنٹی، انکل کو فلاں نظم کے لیے بدھائی دینا؛'' یا ''یہ بال پین لائی ہوں میں انکل کے لیے، انھیں دے دیجیے گا؛'' یا ''آنٹی، انکل پر دباؤ ڈالیے نا، وہ اتنی شراب نہ پیا کریں۔'' ایک دن تو حد ہی ہو گئی۔ سنیتا، اروند کی میلی پینٹ شرٹ لے کر انھیں دھونے باتھ روم جا رہی تھی کہ مانسی چلی آئی اور بولی، ''لائیے میں دھو دیتی ہوں۔''

''اروند کو تو کچھ نہیں ہوگا،'' تب سوچا تھا سنیتا نے، ''ایسا نہ ہو یہ لڑکی کہیں کی نہ رہے۔''

اور اسی دوران ایک تماشا کر دیا تھا مانسی نے۔ جو لڑکا اسے دیکھنے آتا تھا، اسے وہ کوئی نہ کوئی

Scanned with CamScanner

مین میکھ نکال کر ریجیکٹ کر دیتی تھی۔ جب پچھلے دنوں آئے چوتھے لڑکے کے لیے بھی انکار کر دیا مانسی نے، تو سنیتا نے پوچھ ہی لیا اس سے، ''آخر تیری بھی تو کوئی خواہش ہوگی۔ کیسا لڑکا چاہتی ہے تو؟''

ایک عجیب شان میں ڈوب کر گردن اوپر اٹھائی مانسی نے اور بے جھجک بولی، ''ناراض نہیں ہونا آنٹی۔ اگر آپ نہیں ہوتیں انکل کے جیون میں، تو مجھے انکل ہی چاہیے تھے۔ انکل میں جو بات ہے...''

مانسی نے اپنی دونوں ہتھیلیاں آپس میں زور سے بھینچ کر کہا تھا اور سنیتا کو بھونچکا چھوڑ چلی گئی تھی۔

یہ ساری اطلاعات سنیتا کے ذریعے اروند تک بھی آتی تھیں، لیکن وہ لاپروائی سے اڑا دیتا تھا انھیں۔ وہ بالکل نہیں چاہتا تھا کہ سنیتا کو اس بات کا شبہ تک ہو کہ وہ خود مانسی کے بارے میں کہیں بہت جذباتی یا کمزور ہے۔ اس آخری بات کو بھی اس نے سنیتا کے سامنے یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ لڑکیاں اپنے شوہر کے روپ میں اپنے باپ کی اور لڑکے اپنی بیوی کے روپ میں اپنی ماں کی ہی تمنا کرتے ہیں— ایسا نفسیات کی درجنوں کتابوں میں لکھا ہے؛ مانسی ابھی بچی ہے اور اس کا یہ نوعمری کا جوش اس کی عمر کے ساتھ ساتھ ڈھل جائے گا ایک دن۔

سنیتا کو بے خوف کر دیا تھا اروند نے، لیکن خود الجھ گیا تھا۔ وہ چاہنے لگا تھا کہ مانسی سے روز ملے لیکن ادھر اُس نے اس کی غیر موجودگی میں بھی گھر آنا چھوڑ دیا تھا۔ سنیتا سے کہہ تو دیا تھا اس نے کہ اسے انکل ہی چاہیے تھے، لیکن کہنے کے بعد شاید ڈر بھی گئی تھی اور سنیتا کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں جٹا پا رہی تھی، اس لیے نہیں آ رہی تھی۔

آخر مانسی آئی، اس کی موجودگی میں دوسری بار۔ پہلی بار تب، جب اروند نے اسے پہلی بار دیکھا تھا اور دوسری بار اب، اس کے جنم دن پر۔ وہ سب سے آخر میں آئی، بن بلائے۔ کچھ جھجکتی ہوئی سی۔ اس کی آنکھیں، اس کے ہونٹ، اس کی انگلیاں، اس کی چال، اس کی الجھن، اس کی خوشی، اس کی جھجک، سب کچھ یہ بتا رہا تھا کہ جنم دن کی پارٹی میں آئے راجدھانی کے مشہور لیکھکوں، صحافیوں، مصوروں اور افسروں کو دیکھ کر وہ نہ صرف متاثر اور سہمی ہوئی ہے بلکہ مگن اور مغرور بھی ہے۔ وہ نیلی ساڑھی پہن کر آئی تھی اور ایک کالی ڈائری بھی لائی تھی۔ ڈائری کے سرورق پر لال گلاب منقش تھا اور اس کی لمبی، پتلی، شفاف انگلیوں کے پیچھے سے جھانک رہا تھا۔

Scanned with CamScanner

مانسی نے وہاں موجود سب لوگوں سے بہت شائستگی سے سلام دعا کی۔ ڈائری اسے تھمائی اور ہولے سے مسکرا کر اندر والے کمرے میں چلی گئی، سنیتا کے پاس۔

اس نے چپ چاپ ڈائری کھولی۔ ڈائری کھولتے وقت اس کی انگلیاں تھرتھرا رہی تھیں اور دل ایک عجیب سے شوق اور اضطراب کے بیچ آ جا رہا تھا۔ ڈائری کے پہلے صفحے پر، بہت سندر حروف میں، نیلی روشنائی سے لکھا تھا: ''پیارے اروند کو، مانسی کا من۔''

ایکا ایک یقین نہیں ہوا اسے۔ دھول، دھوپ، ہوا، بارش، محرومی، دکھ، تکلیف، مایوسی، دھوکے، اذیت اور بیگانگی سے لڑتے لڑتے لگ بھگ پختہ اور کھردرا ہو چلا اس کا شعور چوبیس برس کی جوان اور کومل لڑکی کی یہ سپردگی اچانک جھیل نہیں پایا۔ اسے لگا، یہ حقیقت نہیں، اس کے اندر دبی آرزو کا خواب کا ساروپ ہے۔ لیکن بار بار پڑھنے پر بھی، ''پیارے اروند کو، مانسی کا من'' اَنمٹ رہا— مانسی کی آنٹی اور اپنی بیوی سنیتا کے خوف یا خفگی سے متاثر ہوئے بغیر، اپنے میں آزاد اور الفت کی حرارت سے دھیمے دھیمے دہکتا ہوا۔ اس نے ڈائری بند کر کے فوراً اپنی میز کی دراز میں، کاغذوں کے نیچے دبا دی۔ مانسی کی طرف سے لکھے لفظوں کے سنیتا تک پہنچ جانے کا مطلب تھا، اس گھر سے مانسی کا مکمل نکالا۔ مانسی کی ہمت دیکھ کر وہ ایکا ایک اپنی نظروں میں چھوٹا بھی ہو آیا۔ لیکن ایک بے بس بزدلی کا ڈنک اپنے سینے میں گڑا محسوس کرتے ہوئے بھی، اسے لگا کہ مانسی کے سہارے وہ کسی بھی رکاوٹ کو شکست دے سکتا ہے۔ چھتیس برس کے شکی اور متذبذب اروند کی نجات اگر کہیں ہے تو صرف چوبیس برس کی مانسی کی خواب ناک دنیا میں ہی۔ یہ مانسی ہی ہے جو اس کے دُکھ کو اپنے پاکیزہ اور سپردگی بھرے پیار سے ایک ایسا اظہار دے گی کہ لفظوں کے کاریگر تک چونک اٹھیں۔

تیسری بار مانسی سے منڈی ہاؤس کی ایک سڑک پر سامنا ہوا اس کا۔

''انکل آپ؟'' خوشی سے شرابور ہو اٹھی مانسی، لیکن جواباً وہ چپ ہی رہا تو مانسی جیسے تاڑ گئی کہ کہاں کیا غلط ہوا ہے۔ اس نے ایک بار بھرپور نگاہ سے اروند کو دیکھا، پھر گردن جھکا کر دھیمے سے بولی، ''وہ کیا ہے کہ 'انکل' لفظ عادت میں شامل ہو گیا ہے نا، اس لیے منھ سے نکل جاتا ہے۔ کوشش کروں گی عادت بدلنے کی۔''

Scanned with CamScanner

وہ چپ کھڑا مانسی کو دیکھتا رہا اور اس کی سمجھ پر محظوظ ہوتا رہا۔ اس کے اس طرح لگاتار دیکھنے سے شاید مانسی کو گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔ اس کا ارادہ مانسی کو کسی گھبراہٹ میں ڈالنے کا نہیں تھا لیکن اس کیفیت میں مانسی کے گال جس طرح گلابی سے سفید اور سفید سے گلابی ہو رہے تھے اور جس طرح اس کی پلکیں امڈ چھاتیاں اوپر نیچے اٹھ اور گر رہی تھیں، اس سب سے وہ اندر ہی اندر کافی لطف اور سرور محسوس کر رہا تھا۔ آخر اس کیفیت کو توڑنے کی پہل مانسی ہی نے کی، ''بہت اچھا لکھتے ہیں آپ۔''

''اچھا؟'' وہ شرارتی ہو اٹھا، ''بدلے میں کیا کہنا چاہیے مجھے؟''

''اتنے کھلنڈرے ڈائیلاگ بھی بول لیتے ہیں آپ؟'' مانسی نے کھلکھلا کر کہا، ''اچھا ہی ہے، اس سے آپ سے ڈر کم ہو جاتا ہے۔''

''ڈر کیوں؟'' اسے تجسس ہوا۔

''بس ہوتا ہے،'' مانسی اترا رہی تھی۔ ''کتنا بڑا سا دائرہ ہے آپ کے اثر کا۔ مجھے تو آپ سے بات کرتے بھی گھبراہٹ ہونے لگتی ہے۔''

''پھر تو یہ ڈر ٹوٹنا بہت ضروری ہے،'' اروند نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

''کیوں، ضروری کیوں ہے؟'' مانسی اٹھلائی۔

''کیوں کہ اپنا من تم مجھے دے چکی ہو،'' اروند نے ایک ایک لفظ پر رکتے ہوئے کہا اور تھوڑے اعتماد لیکن زیادہ تذبذب کے ساتھ مانسی کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اس کی آنکھیں جذباتی ہو آئی تھیں اور مانسی کی آنکھوں میں ناؤ سی تھرتھرانے لگی تھی۔

جیسے بھونچال آیا ہو اور سب کچھ اپنی جگہ سے ادھر اُدھر ہو گیا ہو۔ مانسی کا روم روم تھرا اٹھا۔ جیسے سڑک پر صرف مانسی تھی اور اروند تھے — نہیں، اروند تھا — باقی سب بھونچال کی بھینٹ چڑھ گیا تھا۔ جیسے مانسی کو کوئی نئی چیز پیدا کرنی تھی اروند کے ساتھ مل کر۔ اس نے گہری تڑپ کے ساتھ اروند کی آنکھوں میں دیکھا، اپنی ایڑیوں کو پنجے کے بل تھوڑا اوپر اٹھایا، کسی جادوئی خودرفتگی کی پکار کی طرح اروند کے ماتھے پر اپنے ہونٹ چھوائے اور ''ایڈیٹ'' کہہ کر دوڑ لگا گئی۔

اروند کی دنیا میں جیسے بابا کا رچ گیا۔ اپنے پریم کا اتنا نذرانہ دے کر مانسی نے اروند کی پیڑا کو اور گہرا کر دیا تھا۔ وہ ایک گہرے افسوس سے گھر گیا۔ اگر وہ بھی بیس بائیس برس کا بے فکر اور کھلنڈرا

Scanned with CamScanner

نوجوان ہوتا تو اس دوڑتی ہوئی مانسی کو بھاگ کر پکڑ لیتا اور اسے اس کے پریم کا جواب دے دیتا۔ لیکن وہ چھتیس برس کا ایک ایسا آدمی ہے جسے ڈھیر سارے لوگ سنجیدہ اور گمبھیر مانتے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ اسے جاننے والے کئی لوگ اسے مانسی سے بات کرتے اور مانسی کو اس کا بوسہ لیتے ہوئے بھی دیکھ چکے ہوں، اور اپنی اپنی یادداشتوں میں چٹ پٹا اضافہ بھی کر چکے ہوں۔ نہیں، ''ایڈیٹ'' کہہ کر لگاتار آنکھوں سے دور جاتی مانسی کا پیچھا نہیں کر سکتا وہ۔

مانسی جا چکی تھی۔ وہ اسی طرح جاتی تھی۔ یہ تیسری ملاقات تھی۔ تینوں بار وہ اچانک آئی تھی اور ایک دم چلی گئی تھی— اگلی ملاقات کا پروگرام طے کیے بغیر۔

چوتھی بار مانسی اس کے دفتر ہی چلی آئی۔ وہ سر جھکائے ایک مضمون لکھ رہا تھا کہ کانوں میں ایک جھنجھناتی سی جانی پہچانی آواز پڑی۔

''میں آپ کو آپ کے دفتر میں کام کرتے دیکھنا چاہتی تھی، اس لیے چلی آئی۔''

اس نے چونک کر سر اٹھایا اور ایک پل کے لیے اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ پیلی ساڑھی، پیلا بلاؤز، کالا پرس، چہرے پر جھلکتی بردباری اور انکسار، سوالیہ آنکھیں اور اَدھ کھلے ہونٹ۔ مانسی اس کے دفتر میں تھی، عین اس کے سامنے۔ تھوڑا سا جھک کر کھڑی ہوئی۔ مانسی کو دیکھ کر ایک دم اس کے ذہن میں ''ایڈیٹ'' لفظ اتر آیا اور اس کا ہاتھ خود بخود اپنے ماتھے پر پہنچ گیا، جہاں مانسی کے ہونٹوں کا لمس ابھی تک دہک اور مہک رہا تھا۔

وہ اس سے بیٹھنے کو کہتا یا اس کی اِس اچانک آمد کے سواگت میں اٹھ کر کھڑا ہوتا، اس سے پہلے ہی مانسی نے پوچھا، ''میں پانی ہوں یا ریت؟''

''مطلب؟'' وہ حیران ہو گیا۔

جواب میں مانسی نے اس کی میز پر رکھے شیشے کے نیچے رکھی کسی نظم کی سطروں پر اپنی انگلی ٹکا دی، ''مجھے معاف کیا جائے، اور پانی کو پانی، ریت کو ریت کہنے دیا جائے۔''

''ندی...'' وہ کہنا چاہتا تھا، ''تم ندی ہو۔'' لیکن تب تک مانسی ''پھر ملیں گے'' کہہ کر اونچی ایڑی کی سینڈلوں سے فرش پر ٹھک ٹھک کرتے ہوئے دفتر سے باہر نکل چکی تھی— اسے ہمیشہ کی طرح

Scanned with CamScanner

حیران اور تکلیف میں چھوڑ کر۔

تب منڈی ہاؤس کی سڑک تھی اور وہ دوڑ نہیں سکا تھا۔ اب دفتر تھا اور وہ مانسی کو پیچھے سے پکار بھی نہیں سکتا تھا۔

اور اسی لیے اس بار وہ جھنجھلا گیا۔ مانسی کے جس رویے نے پہلے پہل مسرور کر دیا تھا، اس کو چوتھی بار مسلسل ہوتے دیکھ اس کے اندر کہیں ہلکی سی ناگواری اور تکلیف نے جنم لیا۔ آخر کیا جتانا چاہتی ہے مانسی؟ کیوں کرتی ہے وہ ایسا؟

زیادہ وقت نہیں گزرا۔ دو ہی دن بعد وہ پھر دفتر میں تھی۔ اس بار شام کے وقت۔ نیلی ڈریس میں آئی تھی۔

''میں کل بھی آئی تھی،'' مانسی نے آتے ہی کہا۔

''اچھا؟ کسی نے بتایا نہیں،'' اس نے پرسکون لہجے میں کہا، جیسے مانسی کے آنے پر کوئی خاص سکھ نہ ہوا ہو۔

''میں نے پوچھ تاچھ نہیں کی۔ دیکھا، آپ کی میز کی درازیں بند ہیں اور بیگ بھی نہیں ہے، سو چپ چاپ لوٹ آئی،'' مانسی نے اس اپنائیت سے کہا جیسے اس کی عادتوں، رہن سہن اور مزاج سے برسوں سے واقف ہو۔

''انھیں گے نہیں؟'' اس نے پر اعتماد لہجے میں کہا۔ پھر اس کا لہجہ التماس میں بدل گیا،'' آج میں آپ کا تھوڑا سا وقت لینا چاہتی ہوں۔''

''کوئی خاص بات؟'' اس نے پرسکون اور مطمئن آواز میں پوچھا۔ حالانکہ مانسی کی فرمائش سن کر خوشی کا ایک طوفان سا اس کے اندر اٹھا تھا اور تیز تیز منڈلانے لگا تھا۔

''منڈی ہاؤس؟'' اس نے سنجیدہ آواز میں پوچھا۔

''آپ کی پسند،'' مانسی نے جواب دیا۔

چونکانے میں مانسی کو لگتا ہے، مزہ آتا تھا۔ اروند ایک مسرور تعجب سے گھر گیا۔ مانسی کو کیسے پتا چلا کہ اسے'' آپ کی پسند'' میں بیٹھنا اچھا لگتا ہے؟'' آپ کی پسند'' میں بیٹھ کر ریستوران کی جلوت میں بیٹھنے کے ساتھ ہی خلوت میں ہونے کا سکھ بھی ملتا تھا۔

Scanned with CamScanner

ایک گہری احسان مندی کے سے انداز سے اس نے مانسی کی آنکھوں میں دیکھا، اٹھ کر کھڑا ہوا، دراز بند کی، بیگ اٹھایا اور مانسی کے ساتھ دفتر کی سیڑھیاں اترنے لگا۔ نیچے اتر کر اس نے اسکوٹر رکشا روکا اور مانسی کو بیٹھنے کو کہہ دیا۔ مانسی کی سمجھ جیسے غائب ہو چکی تھی اور وہ اروند کے کہنے پر ہی جی رہی تھی اس وقت۔ سمجھ کے اس تعطل نے اس کے چہرے کو دعا کے معصوم لمحوں کی طرح پوتر اور نردوش کیفیت میں ڈھال دیا تھا۔ وہ چپ چاپ اسکوٹر میں بیٹھ گئی۔ مانسی کے بیٹھنے کے بعد وہ خود بھی بیٹھ گیا اور بولا، ''دریا گنج۔''

ہوا کے مسلسل جھونکے سے مانسی کے دوپٹے کا پلا اس کے چہرے سے ٹکرا رہا تھا، لیکن مانسی اس طرف سے شاید ایک دم بے خبر تھی۔ اس نے بھی ایسا ہوتے رہنے دیا۔ وہ ایک دوسرے کو محسوس کرنے کے اونچے، ہم آہنگ اور وفادار لمحے تھے شاید۔

''آپ روز شراب کیوں پیتے ہیں؟'' سڑک کی طرف دیکھتی، اپنے میں گم مانسی نے اچانک منھ گھما کر پوچھا۔

یہ بات غیر متوقع تھی۔ وہ اس وقت منڈی ہاؤس کی سڑک پر کھڑا تھا اور مانسی اس کے ماتھے کو اس طرح چوم رہی تھی گویا نڈر ہونے کا سبق دے رہی ہو۔ اس لیے مانسی کے اس سوال کو سن، وہ اچانک ایسے شخص کی طرح ہو آیا، جو ابھی ابھی بیچ نیند میں، اپنا خاتمہ ہوتے دیکھ، گھبرا کر جاگا ہو۔ بڑی حیرت سے اس نے مانسی کو دیکھا اور گہرے دکھ سے بھر کر پوچھ بیٹھا، ''سنیتا نے بتایا؟''

''نہیں، لیکن میں جانتی ہوں۔ پرسوں رات بارہ بجے جب آپ نشے میں اپنے گھر کے باہر کی سیڑھیوں سے پھسل کر کھمبے سے ٹکرائے، میرا دل چاہا، دوڑ کر آپ کو سنبھال لوں۔ پر ایسا ممکن نہیں تھا نا۔'' مانسی کی آنکھوں میں ناامیدی اتر آئی تھی۔

اس کا ہاتھ اپنے ماتھے پر چلا گیا۔ پر، مانسی تب کہاں تھی؟ اس نے سوچا اور حیرانی سے مانسی کو دیکھا۔

''جب تک آپ گھر نہیں آجاتے، میں اپنی کھڑکی سے آپ کو دیکھا کرتی ہوں،'' مانسی نے راز کھولنے کے سے انداز میں کہا۔

''تمھارا گھر کہاں ہے؟'' اسے تعجب ہوا کہ یہ بھی نہیں جانتا کہ مانسی کا گھر کہاں ہے۔

Scanned with CamScanner

’’آپ کے گھر سے تین گھر پہلے۔ آپ روز رات میرے کمرے کی کھڑکی کے سامنے سے ہی گزرتے ہیں،‘‘ مانسی نے بتایا۔

تین گھر پہلے؟ اس نے کچھ یاد کرنا چاہا، لیکن تبھی مانسی بول پڑی، ’’نیچے والا گھر نہیں، اوپر والا گھر۔ آپ مجھے نہیں دیکھ سکتے۔‘‘

’’پر میرے لوٹنے تک تم کیوں جاگتی رہتی ہو؟‘‘ اس نے سیدھا سوال کیا۔ وہ اپنے لیے مانسی کے لگاؤ کے ریشے ریشے کو جان لینا چاہتا تھا۔

’’میں بہت ڈری ہوئی رہتی ہوں۔ مجھے لگتا رہتا ہے کہیں آپ کے ساتھ کوئی مس ہیپ نہ ہو جائے۔ کئی بار تو ایسا ہوا کہ آپ کے آنے سے پہلے مجھے جھپکی آ گئی اور میں نے نیند میں دیکھا کہ ایک ٹرک...‘‘

’’سنو مانسی!‘‘ اس نے مانسی کا ہاتھ پکڑ لیا، ’’مجھے کمزور مت کرو۔‘‘ مانسی کی دوستی نے اس کے آرزومند دل کو کہیں بہت اندر جا کر چھو لیا تھا۔

’’پر آپ روز کیوں پیتے ہیں؟‘‘

’’کیونکہ سونے کی ضرورت روز پڑتی ہے،‘‘ اس نے مختصر جواب دیا۔ اتنے نازک سوال کا تفصیلی جواب دینے کا یہ صحیح موقع نہیں تھا۔

دریا گنج آ گیا تھا، اس نے اسکوٹر رکشا کو رکنے کا اشارہ دیا اور میٹر دیکھنے لگا۔ ’’پیسے میں دوں گی،‘‘ مانسی پرس کھولنے لگی۔

’’نہیں،‘‘ اس نے ذرا زور سے کہا اور اسکوٹر کا بل چکا دیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ ’’آپ کی پسند‘‘ کے پرسکون ماحول میں تھے۔ ’’آپ کی پسند‘‘ میں کئی ناموں کی چائے تھی۔ مانسی نے ’’ہم دونوں‘‘ کا آرڈر دیا۔

’’آپ کی میز پر ابسن کی ایک لائن لکھی ہوئی ہے،‘‘ مانسی نے کہا، ’’سب سے طاقتور شخص وہ ہے جو بالکل اکیلا ہے۔ کیا یہ صحیح ہے؟‘‘

’’تمھیں کیا لگتا ہے؟‘‘ اس نے جواب میں سوال کیا۔

’’مجھے لگتا ہے یہ غلط ہے۔ میں تو خود کو بہت کمزور محسوس کرتی ہوں،‘‘ مانسی کا لہجہ اکھڑا، مایوس

Scanned with CamScanner

اور ٹوٹا ہوا تھا۔ ''ہو سکتا ہے آپ کے نزدیک یہ صحیح ہو۔ مگر آپ اکیلے کہاں ہیں؟''

''میں بھی اکیلا ہی ہوں مانسی،'' اروند کی آواز جذبے سے بھرا اٹھی، ''اور کمزور بھی بہت ہوں۔''

''کیوں ہوتا ہے ایسا؟'' مانسی نے پوچھا، ''اتنے سارے لوگوں کے ہوتے ہوئے بھی آدمی اکیلا کیوں رہ جاتا ہے؟''

''کیونکہ اکیلا پن مادی نہیں ذہنی کیفیت ہے۔'' وہ سنجیدہ ہو گیا، ''جب تک دل کا ساجھے دار نہ ملے تب تک اکیلے پن سے نجات ممکن نہیں ہے۔''

''تو پھر؟'' مانسی نے اس کی ہتھیلیاں تھام لیں اور پھر فوراً ہی چھوڑ بھی دیں۔

''کیا یہ جرم ہے؟'' پوچھا مانسی نے۔

''جرم؟'' اس بار اروند نے مانسی کی لگ بھگ پسیجی ہتھیلیوں کو بہت ملائمت سے تھام لیا اور ان پر اپنی ہتھیلیاں پھراتا ہوا بولا، ''جرم صرف اپنی خواہش کے خلاف جینا ہے، مانسی۔ پر ہم کیا کرتے ہیں؟ گھر سے لے کر دفتر تک اور ذاتی سے لے کر خاندانی سطح تک لگاتار وہ زندگی جیتے ہیں جس سے بہت اندر تک نفرت کرتے ہیں۔'' اروند ایک ایسی تکلیف کے بیچ کھڑا تڑخ رہا تھا جس نے مانسی کو بہت دور تک دکھی کر دیا۔ اس نے چاہا کہ اس معصوم اور خوددار بچے کو اپنے سینے میں چھپا لے۔ اس سے بارہ سال بڑا اروند اپنی ٹوٹ پھوٹ میں اس کے سامنے ایک ایسے نا سمجھ بچے میں بدل گیا جسے چاروں طرف سے ڈھیر ساری آفتوں نے گھیر رکھا ہو۔ اپنا جیون دے کر بھی اس اروند کو بچانا چاہتی تھی مانسی۔ پر کیسے؟

اچانک مانسی کو جھٹکا سا لگا۔ اس کی ہتھیلیوں پر اروند کی گرفت رفتہ رفتہ سخت ہونے لگی تھی۔ اور زیادہ ڈوبنے سے، بڑی مشکل سے روکا مانسی نے خود کو۔ یہ عوامی جگہ تھی، اور اروند کی پہچان کا کوئی بھی شخص کسی بھی لمحے داخل ہو سکتا تھا۔ اس کا کیا ہے؟ کون جانتا ہے اسے؟ پر اروند؟ اف! مانسی کا سینہ درد کر اٹھا۔ کتنا مجبور ہے یہ شخص! کیسے کیسے بندھنوں میں جکڑا ہوا۔ شہرت آدمی کو اس قدر غلام بھی بناتی ہے، یہ احساس مانسی کو پہلی بار ہو رہا تھا۔ ابھی تو کتنی سچائیاں جاننی ہیں مانسی کو، اس اپنے آئیڈیل مرد کے ذریعے۔

''آپ نے ڈائری میں کیا لکھا؟'' مانسی پھر ایک متجسس پرستار میں بدل گئی اور اس نے آہستہ

سے اپنی ہتھیلیاں چھڑالیں۔

''اس میں لکھنے کے لیے تو پہلا ورق پھاڑنا پڑے گا۔''

''تو پھاڑ ڈالیے،'' مانسی مسکرائی۔

''لفظوں کو ضائع کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا مانسی۔''

''چلیں؟'' مانسی نے موضوع بدل دیا۔ اتنی دیر ہو چکی تھی کہ گھر میں فکر اور غصہ ٹہلنے لگتے۔

''چلو!'' اروند اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے اچھا لگا۔ پہلی بار مانسی چلنے کے لیے پوچھ رہی تھی — اٹھ کر چلی نہیں گئی تھی۔

۲

بڑا بننے کی خواہشوں، سپنوں، فکروں، اندیشوں، بے چینیوں، سوالوں، احساسِ غم، چاہتوں، بے ہمتی اور چھوٹے بڑے ڈروں سے مل کر بنی تھی مانسی کی شخصیت۔ سوال چاہے تفتیشی صحافت کی حدود اور امکانات سے جڑا ہوا ہو، چاہے ازدواجی رشتوں کی اخلاقیات اور تقاضوں سے، یا سیکس کی پیچیدگی، ناگزیریت اور نفسیات سے، مانسی ہر چیز کے بارے میں سب کچھ جان لینے میں ہر دم مشغول رہتی تھی۔ اس سے بات کرنے میں سکھ ملتا تھا، لیکن کئی بار باتیں اتنا زیادہ پھیلاؤ پا لیتی تھیں کہ ایک اکتاہٹ اور الجھن سی ہونے لگتی تھی اور اروند کا دل بیچ بحث میں اچٹ جاتا تھا۔

ایک دِقت اور تھی مانسی کے ساتھ۔ اس دقت کا احساس اروند کو مانسی کے ساتھ اپنی چھ مہینے کی پہچان میں بہت گہرائی سے ہو گیا تھا۔ دقت یہ تھی کہ بات چاہے کسی بھی موضوع پر چل رہی ہو اور مانسی نے بات چیت کا چاہے کوئی سرا تھام رکھا ہو، لیکن آخرکار ہوتا یہ تھا کہ مرکز میں مانسی آ جاتی تھی اور بات کا موضوع اس سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہونے لگتا تھا۔ میرلن منرو اس کی پسندیدہ ہیروئن تھی اور اس بات سے وہ بہت دکھی رہتی کہ روپ، جوبن، شہرت اور دولت کے آئیڈیل سکھ کے بیچوں بیچ رہنے والی میرلن کو نیند کی گولیاں کھا کر ایک دم چپ چاپ اور اکیلے مرنا پڑا۔ ''میں ہوتی میرلن کی جگہ...'' مانسی کہا کرتی تھی، ''تو اتنی تنہا موت کبھی نہ چنتی اور نہ ہی اپنی کامیابی مرد میں ڈھونڈنے کی کوشش کرتی۔'' میرلن کے بعد مانسی کو سیمون د بووار میں کشش محسوس ہوتی تھی۔ بووار کی کتاب دی سیکنڈ

سیکس اس نے کئی بار پڑھی تھی اور کتاب سے اٹھے کئی سوالوں پر گھنٹوں اس کا دماغ چاٹا تھا۔

''آپ کی پسند'' میں چھ بجے ملنے کو کہا تھا مانسی نے اور اس وقت چھ تیس ہو رہے تھے۔ اروند دو پیالے چائے اور پانچ سگریٹ پھونک چکا تھا اس کے انتظار میں، اور جھلا رہا تھا کہ آخر ایسا کیا ہے مانسی میں کہ اس کے جیسا پختہ کار اور مصروف آدمی ایک نوعمر عاشق کی سی بے تابی سے مانسی کے انتظار میں غرق ہو رہا ہے۔ وہ کلس رہا تھا اور دل ہی دل میں مانسی کا تجزیہ کر رہا تھا کہ بڑی ہڑبڑاہٹ کے ساتھ مانسی داخل ہوئی۔ چھ چالیس ہو رہے تھے۔ ٹھنڈ بڑھنے لگی تھی۔

''میں پھنس گئی تھی،'' مانسی نے جلدی سے کہا، رومال سے غیر مرئی پسینہ پونچھا اور کرسی پر بیٹھ گئی۔

''وہ چپ رہا اور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنسا کر، ان پر اپنا چہرہ ٹکائے مانسی کو دیکھنے لگا۔

''ناراض ہیں؟'' مانسی نے پوچھا۔

''میں تمھارا کون ہوں؟'' اس نے اسی انداز میں کہا۔

''فرینڈ، فلاسفر اینڈ گائیڈ،'' مانسی ہنس دی۔

''میری فیس،؟'' وہ پہلے کی طرح سنجیدہ تھا۔

''فیس؟'' مانسی اس بری طرح چونکی، جیسے اروند پگلا گیا ہو۔ لیکن اسے اسی طرح سنجیدہ دیکھ کر ایکاایک اس کے چہرے پر سختی ابھر آئی۔ اس نے ایک ایک لفظ پر ٹھہر ٹھہر کر پوچھا،'' کیا آپ سیریس ہیں؟''

''ہاں۔''

''سچ مچ فیس چاہیے آپ کو؟''

''سچ مچ۔''

''کیا لیں گے؟'' مانسی کی آنکھوں میں ایک عجیب سی سختی ابھر آئی تھیں۔

''یہ تم جانو،'' اروند اسی انداز میں بیٹھا تھا اور جیسے ہوا سے باتیں کر رہا تھا۔

''تو اٹھیں،'' مانسی نے جسم کو مسحور کر دینے والی حاکمانہ آواز میں کہا اور ٹھک ٹھک کرتی ریستوران سے باہر نکل گئی۔

مانسی کے اس روپ سے واقفیت نہیں تھی اسے۔ کچھ دیر وہ یونہی گم سم بیٹھا رہا، پھر پیسے چکا کر

Scanned with CamScanner

باہر نکل آیا۔ باہر مانسی ایک اسکوٹر رکشا رکوا کر اس میں بیٹھ چکی تھی اور اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے سچ مچ چبھن سی ہونے لگی۔ کیا کرنے جا رہی ہے مانسی؟ کہاں جا رہی ہے مانسی؟ اسے بھی ساتھ جانا ہے یا اکیلے ہی جائے گی مانسی؟ شکوک سے گھرا ہوا وہ اسکوٹر کے قریب آیا۔

''بیٹھیں،'' مانسی کی آواز ہی نہیں، چہرہ بھی ست ہو گیا تھا۔ پر ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں کچھ کر گزرنے کا عجیب سا ضدی انداز بھی اتر آیا تھا۔

وہ چپ چاپ کسی نٹ کھٹ لیکن ڈرے ہوئے بچے کی طرح اسکوٹر میں آ بیٹھا، مانسی سے بچتے ہوئے۔ اس کے بیٹھتے ہی مانسی نے اسکوٹر والے سے کہا، ''شانتی بن۔''

شانتی بن! اس کی یاد سے یہ سہانی اور رومانی جگہ کسی پتھر کی طرح ٹکرائی۔ اس نے چپ چاپ گھڑی دیکھی: سات بج کر دس منٹ۔ اس وقت تک شانتی بن ایک گہرے سناٹے اور شفاف اندھیرے میں ڈوب چکا ہوگا۔ اس کے گھنے پیڑوں کے نیچے اندھیرا خوف کی طرح اتر آیا ہوگا۔ اسے سچ مچ ٹھنڈ لگنے لگی۔

شانتی بن آ گیا تھا۔ مانسی اس کے آگے آگے چلتی رہی۔ چپ۔ بے تاثر۔ اتنی گھنی اور بھید بھری خاموشی سے لڑنے کے لیے اروند نے سگریٹ جلا لی۔ جب تک سگریٹ ختم ہوئی، وہ پیڑوں کے ایک بڑے جھرمٹ کے گھنے اور خاموش سائے کے نیچے اندھیرے میں گم ہو چکے تھے۔

تبھی مانسی رک گئی۔ اتنے اچانک کہ سنبھلتے سنبھلتے بھی اروند مانسی سے ٹکرا ہی گیا۔ اور اس سے پہلے کہ اس کے ہونٹ فطری طور پر ''سوری'' لفظ ادا کرتے، ان پر مانسی کے گرم، اچھوتے اور جوان ہونٹ آ کر چپک گئے۔

''لو، اور لو،'' مانسی بڑبڑائی اور اس کے ہونٹوں، ماتھے، گردن اور گالوں پر کسی ہسٹیریا کے روگی کی طرح ٹوٹ پڑی۔

مانسی کے اس غیر متوقع جوش کو اس کا ٹھہرا ہوا، غیر حاضر اور پریم کا باتمیز لین دین کرنے والا تن من جھیل نہیں پایا۔

''مانسی!'' اس نے مانسی کو اپنے سے الگ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے، سخت لیکن سرگوشی کی سی آواز میں کہا۔ اسے دھیان آ گیا کہ اس حال میں اگر کوئی اسے دیکھ لے تو وہ اخباروں کا موضوع تو

Scanned with CamScanner

بن ہی جائے گا، اس کا اپنا گھر دوزخ میں تبدیل ہو جائے گا۔ گھر، دفتر، کالونی، دوست ـــ کس کس سے ٹکرائے گا اس کا دروں بیں، متذبذب اور خوفزدہ وجود۔

مانسی الگ نہیں ہٹی تھی بلکہ اور بھی کس کر اس سے چمٹ گئی تھی۔

''مانسی، ہٹو!'' اچانک اس نے مانسی کو کس کر دھکا دے دیا۔

اس کے دھکے سے مانسی لڑکھڑا گئی اور پیڑ سے ٹکرا گئی۔ اس کا شال نیچے گر پڑا۔ ایک پل کے لیے اس کی رنجیدہ آنکھیں اروند کے چہرے سے ٹکرائیں اور دوسرے ہی پل وہ پھر ہانپتی ہوئی سی اروند کے جسم سے آ لگی اور لڑکھڑائی ہوئی آواز میں بولی، ''چھ مہینے! چھ مہینے سے اس محرومی کے جہنم میں جل رہی ہوں ـــ اب اور نہیں۔''

''لیکن اس کا یہ طریقہ نہیں ہے،'' اروند نے اسے پھر چھڑانے کی کوشش کی۔

''میں کسی طریقے کو نہیں مانتی۔ 'اروند جی' کے روشن ہالے سے لڑتے لڑتے ٹوٹ گئی ہوں میں۔ مجھے اروند جی نہیں، اروند چاہیے، صرف اروند، اور وہ بھی فوراً،'' مانسی نے ٹوٹے، تھکے اور سپردگی بھرے لفظوں میں کہا اور اس کے گلے سے لگ کر رونے لگی۔

اروند کا جی بھر آیا۔ مانسی کے جسم کی مغرور شدت ایک ڈھیلے اور لاچار وجود میں ڈھل رہی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ ساری رکاوٹوں اور اندیشوں کے پار جا کر وہ اسی پل مانسی کو اپنا لے ـــ پورا کا پورا اور مکمل۔ آخر یہی تو چاہتا رہا ہے وہ خود بھی۔ تو پھر اتنا تذبذب کیوں؟ پیار کی اتنی کھلی، سرعام اور پرجوش دعوت بھی اس کی شریانوں کے خون کو گرما کیوں نہیں پا رہی ہے؟ اس سرد رات میں ایک نوجوان اور دہکتا ہوا نسوانی بدن اسے دہکانے کے بجائے برفانی احساس کی آغوش میں کیوں دھکیل رہا ہے؟ شاید پیار کی اتنی دبنگ، جارحانہ اور غیر متوقع سپردگی اس کے ازدواجی اور معمول کی دنیا میں ایک دم انجانی رہی ہے، اس لیے آج وہ اس مورچے پر بنا لڑے شکست خوردہ ہو رہا ہے، جسے فتح کرنے کی تمنا ہی میں جی رہا تھا وہ پچھلے چھ مہینے سے۔ اس نے دوبارہ سگریٹ سلگائی۔ زمین سے مانسی کا شال اٹھا کر اسے اڑھایا اور بولا، ''چلو۔''

مانسی نے سر جھکا لیا اور اندھیرے کو چیر کر آگے بڑھتے اروند کا پیچھا کرنے لگی۔ کچھ بولے بغیر۔ اس کے آگے، سب کچھ پا کر بے غرض ہوا ٹھے آدمی کی طرح چل رہا تھا اروند۔ لگاتار یہ سوچتے

Scanned with CamScanner

ہوے کہ مانسی کے بلاوے کو ٹھکرا کر شاید اس نے اچھا نہیں کیا۔ پر اب کیا ہو سکتا تھا، سوا ایک گہرے پچھتاوے میں ڈوبنے تیرنے کے۔

مانسی کو نیند نہیں آ رہی، تین مہینے سے اس کی آنکھیں مسلسل جل رہی ہیں۔ جب بھی آنکھ بند کرتی ہے، شانتی بن والا منظر اس کے ذہن میں ہاہا ہو کرنے لگتا ہے۔ کتنی ہی راتیں وہ چونک کر اٹھ بیٹھی ہے۔ اور کتنی ہی راتیں پوری پوری رات جاگی رہ گئی ہے۔ گھر میں، کالج میں، کتابوں میں، نیند میں، ہر کہیں بس ایک ہی نظارہ۔ اس نظارے سے ٹکراتے ٹکراتے اس کا سر جگہ جگہ سے درک گیا ہے جیسے۔ اگر تین مہینے پہلے شانتی بن کی اس ساکت رات میں اس کی جنونی سپردگی کو اپنا لیا ہوتا اروند نے، تو شاید اس کی روح میں نحوست کی طرح گونجتا یہ بین اسے اس طرح نہ ستاتا۔ اسے خود پتا نہیں، کیسے کیا ہوا۔ اس نے تو ہمیشہ اروند کے احترام، مقبولیت اور لیاقت سے ہی پیار کیا۔ وہ ہمیشہ یہی چاہتی رہی کہ اس کی زندگی میں اروند ایک پیڑ کی طرح موجود رہیں اور وہ ان کی گھنی اور سرپرستانہ چھاؤں میں رہتے ہوے ہی اس سنگدل دنیا میں اپنے آزاد وجود کی صورت گری کرے۔ اروند کو ایک مرد کے طور پر نہ اس نے چاہا تھا نہ ہی اروند کے مرد پن میں اپنے وجود کی کامیابی پانے کی اس نے تمنا کی تھی۔ تو پھر کیوں ہوا ایسا کہ اروند اس کے سپنوں میں، اس کی تمناؤں میں ایک مرد کی طرح نمودار ہوتے رہے؟ اروند کی عادتوں، اروند کے اکیلے پن اور اپنے لیے اروند کے جھکاؤ کو جاننے، سمجھنے اور گہرائی سے محسوس کرنے کی جلد بازی نے ہی کیا اسے اس انجام تک پہنچایا کہ چھتیس برس کے شادی شدہ اور سماج میں معزز، لگ بھگ پختہ عمر اروند اس سنگدل دنیا میں جسمانی اور روحانی سطح پر ایک آئیڈیل مرد کے روپ میں ظاہر ہوا تھے؟ لیکن اس کا کیا کرے کہ اس جیسی لڑکی کا آئیڈیل اروند جیسا شخص ہی ہو سکتا ہے۔ کالونی میں اس کی آزادی کو چاہے جتنی بھی چھچھلی اور بازاری سطح پر لیا جاتا ہو، اس کے خیالوں اور طرز عمل سے خفا ہو کر اس کے پتا بھلے ہی ایک اجنبی میں بدل گئے ہوں لیکن اس کا ضمیر جانتا ہے کہ وہ کتنا پاک اور بے داغ جیون بتاتی آئی ہے۔

اروند سے پہلے کسی ایک کو بھی اپنا دل نہیں دیا مانسی نے۔ اسے لگا ہی نہیں کہ اس کی جیسی خوابوں میں رہنے والی اور بڑا بننے کی تمنا رکھنے والی لڑکی کو بیوی کے روپ میں کوئی روایتی مرد جھیل سکتا ہے۔ یا

Scanned with CamScanner

خود وہی کسی ایسے مرد کو شوہر کے طور پر قبول کر سکتی ہے جو زمانے بھر کی حماقتوں، جہالتوں اور بدگمانیوں سے بھرا ہوا ہو۔ سکھ دکھ، سپنوں اور مصیبتوں کو بغیر کسی بے اعتباری اور تعصب کے شیئر کر سکنے والے مرد کے انتظار میں اس نے اپنے جیون کے چوبیسویں برس کو بھی سونا، ادھورا اور خالی رہنے دیا۔ اس کی کتنی ہی ہم عمر سہیلیاں گھر بسا کر یہاں وہاں چل دیں۔ کتنی ہی سہیلیوں کے گھر آنگن میں بچے ٹھنکنے لگے اور کتنی ہی سہیلیاں گھر بسانے کے بعد اسے توڑ کر عدالتوں میں تاریخیں بھگت رہی ہیں۔ وہ بھی چاہتی تو ایسا ہی کچھ کر لیتی اب تک۔ پر اس نے ایسا نہیں کیا، کیونکہ اپنی ہی شرطوں پر زندگی کو شکل دینا چاہتی تھی وہ۔ اسے بھروسا تھا کہ دیر سویر وہ ایسے جیون ساتھی کو کھوج ہی لے گی جو اسے بھی آزاد رکھے اور خود بھی آزاد رہے۔

اور ایسے آدمی کا وجود اسے اروند میں دکھائی دیا— اس کا کیا کرے وہ؟

وہ اپنے آئیڈیل مرد کے انتظار میں اروند کے روشن ہالے کے باہر ہی کھڑی رہتی، لیکن خود اروند جس طرح اپنے حصار سے باہر نکل کر اس سے ملے جلے اور کھلے، اس سے لکشمن ریکھا کے اندر پہنچ گئی۔ یہ صحیح ہے کہ ان کے جنم دن پر ڈائری میں اپنا من پہلے اسی نے دیا لیکن اروند اس من کو رد بھی تو کر سکتے تھے۔ انھوں نے اپنا کیوں لیا اس کا من؟ اور جب اپنایا تھا تو شانتی بن میں اس کو اتنی سختی سے کچل کیوں دیا؟ کیوں اتنی سنجیدگی سے مانگی تھی انھوں نے فیس؟ کیوں پوچھا تھا کہ وہ میرے کون ہیں؟ اور جب لڑکی ہونے کے باوجود اس نے خود ہی ان کے اور اپنے رشتے کو روپ دینا چاہا تو انھوں نے دھکا دے دیا۔

اف! مانسی کی کنپٹی پھر تڑتڑ کرنے لگی۔ اروند کی طرف سے ٹھکرائے جانے کا منظر پھر سے گہرا ہونے لگا۔ بس، اسی منظر کو نہیں جھیل سکتی مانسی۔ کاش یہی ایک منظر کوئی اس کی یاد سے مٹا دے۔ یہ منظر اس کی نغمے اور محبت سے بھری دنیا کو وحشیانہ اور پرتشدد میدان جنگ میں بدل دیتا ہے۔ اروند کی طرف سے ٹھکرائے جانے پر بھی ان کے خلاف نہیں جا سکتی مانسی۔

پر اسے ٹھکرا کر خود بھی تو ایک خوفناک جہنم میں جل رہے ہیں اروند۔ شانتی بن والے واقعے کے بعد وہ اروند سے ایک بار بھی نہیں ملی۔ لیکن روز رات بارہ اور ایک بجے نشے سے چور، اپنے خودکشی کرنے والے سے وجود کو لڑکھڑاتے قدموں سے اپنے گھر تک پہنچاتے، اس کی کھڑکی کے نیچے سے

Scanned with CamScanner

ہی تو گزرتے ہیں وہ۔ آنٹی بتا رہی تھیں کہ پہلے سے زیادہ پینے لگے ہیں اروند۔

اروند جل رہے ہیں۔ اروند تباہ ہو رہے ہیں، اروند مر رہے ہیں۔ اس کی سپردگی کو رد کر کے اروند بھی سکھی نہیں ہیں — ایک عجیب سا سکھ ملا مانسی کو۔

لیکن یہ سکھ بھی مانسی کے لیے بے خوابی ہی لاتا ہے۔ کیسے سوئے مانسی؟ مانسی جانتی ہے کہ خود کو تباہ کر دیں گے اروند، لیکن اس سے ایک لفظ نہیں کہیں گے۔ اپنے بڑپن کے دائرے سے نکل کر دوستی کا نئے سرے سے آغاز وہ خود کبھی نہیں کریں گے۔ آنٹی صرف کہتی ہیں لیکن اروند کی نس نس کو جانتی ہے مانسی۔ یہ جاننا ہی اس کے اور اروند کے مشترکہ دکھ کا اصل سبب ہے، یہ بھی جانتی ہے مانسی۔ اس اصل سبب کو ہی ختم کرنا ہوگا، ورنہ نجات ممکن ہی نہیں۔

کھڑکی سے سر ٹکائے، اروند کے انتظار میں جاگتی سوچ رہی ہے مانسی کہ خود کو اروند سے اور خود اروند کو کیسے آزاد کرے وہ۔

تبھی سڑک پر شور سا ہوا۔ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھا مانسی نے — خود کو سنبھال نہ پانے کی وجہ سے نشے میں دھت اروند رکشے سے لڑھک کر سڑک پر گر پڑے ہیں۔ مانسی کے گلے سے دبی دبی سی چیخ نکل پڑی۔ رکشے والا اروند کی گھڑی کھول رہا تھا۔ شور مچانے سے اروند کی نیک نامی جا سکتی تھی، اس لیے آنکھوں میں آنسو لیے صرف دیکھتی رہی مانسی کہ اروند کے سر پر لات مار کر بھاگ گیا رکشے والا۔

''ہے بھگوان!'' مانسی کو لگا کہ زمین کو پھٹ جانا چاہیے۔ اس آدمی کے لکھے ایک ایک لفظ کو کتنے غور سے پڑھتے ہیں لوگ، ''ہے ایشور!'' مانسی نے پرارتھنا کی، ''اس رکشے والے کو معاف کرنا، وہ نہیں جانتا کہ اس نے کیا کیا!''

اروند اٹھ رہے تھے۔ لڑکھڑاتے ہوئے وہ اس کی کھڑکی کے عین نیچے آئے۔ سر اٹھا کر انھوں نے ایک پل کے لیے اوپر تکا اور آگے بڑھ گئے — اپنے گھر کی طرف۔

اب گھنٹی بجائی ہوگی انھوں نے، مانسی نے سوچا۔ کچھ ہی دیر بعد دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنی مانسی نے اور اپنا سر کھڑکی کی چوکھٹ پر دے مارا۔

Scanned with CamScanner

مانسی کو پتا چلا، اروند جا رہے ہیں۔ ان کا اخبار انھیں بمبئی بھیج رہا ہے۔ فی الحال اکیلے جا رہے ہیں، بعد میں آنٹی کو بھی آ کر لے جائیں گے۔ خود کو روک نہیں پائی مانسی — اروند کے دفتر پہنچ گئی۔ وہ اٹھنے کی تیاری کر رہے تھے۔ اسے دیکھا اور چہرے پر بغیر کوئی تاثر لائے دھیمے سے بولے، ''میں جانتا تھا، تم آؤ گی۔ 'ہم دونوں' پینے' آپ کی پسند' چلیں؟''

مانسی چپ رہی۔ پورے چھ مہینے بعد اتنے قریب سے دیکھ رہی تھی وہ اروند کو۔ ذرا بھی نہیں بدلے۔ صرف چشمہ نیا ہے اور آنکھوں کے نیچے کی سوجن تھوڑا اور بڑھ گئی ہے۔

''گھڑی کہاں گئی؟'' مانسی نے پوچھا۔

''شانتی بن والے واقعے کے بعد سے میرا انتظار کرنا بھی بند کر دیا تھا کیا؟'' سکون سے پوچھا اروند نے۔

اف! اندر تک کانپ گئی مانسی۔ اسی لیے تو چاہیے تھا یہ شخص مجھے، اس نے سوچا۔ اسی لیے تو دیا تھا اس آدمی کو اپنا من، کیونکہ یہ من کی قدر کرنا جانتا ہے۔

''بمبئی کب جا رہے ہیں؟''

''دو روز بعد۔''

''کیوں؟''

''کیونکہ من میں بیٹھی ہوئی مانسی سے صرف سمندر ہی آزاد کر سکتا ہے۔''

پہلی بار چوک ہوئی مانسی سے۔ وہ سمجھ نہیں پائی کہ اروند کیا کہنا چاہتے ہیں سمندر کو بیچ میں لا کر۔ رنجیدہ ہو کر بولی، ''آپ تو آزاد ہو جائیں گے۔ مجھے کون رہا کرے گا؟''

''مانسی کا من،'' کہا اروند نے۔

''پر وہ تو آپ کے پاس ہے۔''

''اسی لیے میں نے آج تک اس پر کچھ نہیں لکھا،'' اروند نے اپنی میز کی دراز کھولتے ہوئے کہا، ''مجھے معلوم تھا کہ ایک روز تمھارا من تمھیں لوٹانا ہوگا۔'' اروند نے مانسی کی دی ہوئی ڈائری نکال لی اور کہا، ''اسے رکھ لو۔ گھر سے اٹھا کر یہاں لایا تھا کہ آؤ گی تو لوٹا دوں گا۔ دیکھو، یہ ایک دم کوری ہے۔''

''کتنا سفید جھوٹ بولتے ہیں آپ!'' مانسی کی آواز ایک ساتھ اکھڑ اور زخمی ہو گئی۔ ''اس کے

Scanned with CamScanner

ایک ایک صفحے پر مانسی کا مرثیہ لکھنے کے باوجود کہتے ہیں کہ یہ کوری ہے۔''

''مانسی!'' اروند کی آواز ڈوب گئی۔

''ہم دونوں،'' مانسی نے دھیرے سے کہا اور رومال سے اپنی آنکھیں پونچھ لیں۔

اروند نے اپنا بیگ اٹھالیا۔ مانسی بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

'آپ کی پسند' میں 'ہم دونوں' پینے تک کوئی کچھ نہیں بولا۔ چائے ختم کر کے مانسی ہی نے کہا، ''کتنے ہی دن گزر گئے یہاں کی چائے پیے ہوئے۔''

''صرف تمھیں،'' اروند نے جواب میں دیا،''میں چھ مہینے سے یہاں روز آرہا ہوں۔ ایک چائے اپنے حصے کی پیتا ہوں، ایک تمھارے حصے کی۔''

''کیوں؟'' مانسی کے اندر ایک عورت رونے لگی۔ کیوں کرتے رہے اروند ایسا؟ اس نے سوچا، چھتیس برس کا یہ منظم سا دکھائی دینے والا شخص اتنا جذباتی کیوں ہے؟

''مانسی!'' اروند نے سگریٹ جلاتے ہوئے کہا۔ ''پچھلے چھ مہینے میں میں نے بار بار سوچا ہے اور ہر بار پایا ہے کہ میں تم سے پیار کرتا ہوں۔ ایسا پیار جو من اور تن دونوں پر اعتبار چاہتا ہے۔ میں چاہتا تو چھ مہینے پہلے تمھیں اپنا سکتا تھا، پر میں نے خود کو روک دیا۔ جانتی ہو کیوں؟ کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ مانسی جیسی لڑکی سماج میں دوسری عورت یا رکھیل کہلائے۔ یہ سچ ہے مانسی... '' اروند نے سگریٹ کا لمبا کش لیا،'' کہ میں تمھیں اپنی بیوی نہیں بنا سکتا۔ سنیتا جیسی برداشت رکھنے والی اور میرے اندر کے جہنم کو بغیر مخالفت کے قبول کر لینے والی عورت تم شاید کبھی نہ بن پاتیں۔''

''چلیں؟'' مانسی بیچ میں ہی پوچھ بیٹھی۔

''نہیں، میری پوری بات سنے بغیر نہیں جاسکتیں تم،'' اروند نے حکم سا دیا۔ ''تم نے صرف میرا اجالا دیکھا ہے۔ میرے اندر کے اندھیرے اور بدبو سے تعارف نہیں ہے تمھارا۔ میرے اندر کی اندھیری، نفرت انگیز اور ناقابل برداشت دنیا کو، میرے کمزور اور کھوکھلے ہو چکے من کو محبوبہ کی نہیں باندی کی ضرورت ہے مانسی، اور باندیاں مانسیاں نہیں، سُنیتائیں ہی ہو سکتی ہیں۔''

''اور کچھ؟'' خوفزدہ ہو اٹھی تھی مانسی۔ اروند سچ کہہ رہے تھے۔ اروند کے اندر بسے جاگیردار کو اس کے اندر بیٹھی عورت شاید قبول نہ کر پاتی۔ جب حالات اتنے صاف ہیں تو من جڑتا کیوں ہے

Scanned with CamScanner

اروند سے؟

''اپنی خواہش سے جا رہا ہوں میں،'' اروند نے کہا، ''یہاں رہوں گا تو تم سے دور رہ نہیں پاؤں گا۔''

''صرف ایک خواہش پوری کریں گے میری؟'' مانسی نے پوچھا۔

''نہیں کر پاؤں گا مانسی،'' اروند نے مایوسی بھرے لہجے میں کہا، ''بنا شراب پیے میں کچھ نہیں سوپاتا۔ تم ہوتیں جیون میں تو شاید کوشش بھی کرتا۔''

مانسی کا جی چاہا کہ لپک کر روک لے اروند کو اور کہہ دے کہ اسے دوسری عورت بننا منظور ہے۔ اپنے سارے سپنوں اور آزادی کی قربانی دے سکتی ہے مانسی، اگر اروند آدھا ہی اس کا ہو جائے۔

پر ایسا کہہ نہیں سکی مانسی — نہ اُس روز، نہ اس کے اگلے روز اور نہ ہی اس وقت جب آنٹی کے ساتھ اسٹیشن چلی آئی تھی وہ — اروند کو وداع کرنے۔ گاڑی چلی گئی اور اروند کا ہلتا ہوا ہاتھ دکھائی دینا بند ہو گیا تو آنٹی کی گود میں سر چھپا کر کسی چھوٹی سی بچی کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی مانسی۔

❊❊

Scanned with CamScanner

شیلیش ٹیانی

ہندی سے ترجمہ: اجمل کمال

اردھانگنی

نکٹ گھر سے آخری بس کے جا چکنے کی اطلاع دو بار دیے جانے کے باوجود نین سنگھ کے پاؤں اپنی ہی جگہ جمے رہ گئے۔ سامان آنکھوں کی پہنچ میں، سامنے احاطے کی دیوار پر رکھا ہوا تھا۔ نظر پڑتے ہی سامان بھی جیسے یہی پوچھتا معلوم ہوتا تھا: کتنی دیر ہے چل پڑنے میں؟ نین سنگھ کی بے صبری اور جھنجھلاہٹ کو دیوار پر رکھا ہوا سامان بھی جیسے ٹھیک نین سنگھ کی طرح محسوس کر رہا تھا۔ اس میں ایک ہلکی سی کپکپی اٹھنے کا گمان بار بار ہوتا تھا، جبکہ لوہے کے ٹرنک، وی آئی پی بیگ اور بستر جھولے میں کچھ بھی ایسا نہ تھا کہ ہوا سے متاثر ہوتا۔

سارا بکھیڑا ٹرین نے کیا تھا، نہیں تو دیا جلنے کے وقت تک گاؤں کی حد میں پاؤں ہوتے۔ ٹرین میں ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ ہو سکتا ہے جھٹ پٹے میں گھر لوٹتی گائے بکریوں کے ساتھ ساتھ کھیت جنگل سے واپس ہوتے گھر کے لوگ بھی دور سے ہی دیکھ لیں کہ یہ اپنے نین سنگھ صوبیدار جیسے کون چلے آ رہے ہیں۔ خاص طور پر بھیموا کی ماں تو صرف ہلکی سی جھلک سے ہی بھانپ لے گی کہ کہیں رموا کے بابو تو نہیں۔ سرپرائز وزٹ مارنے کے چکر میں ٹھیک ٹھیک تاریخ بھلے ہی نہیں لکھی مگر مہینہ تو یہی دسمبر کا لکھ دیا تھا۔ تاریخ نہ لکھنے کا مطلب یہ ہوا کہ وہ مہینے کے پہلے اور دوسرے پندرھواڑے دونوں پر نظر رکھے۔

---

[1] اردھانگنی: یہ لفظ دو لفظوں ''اردھ'' یعنی نصف اور ''انگ'' یعنی جسم سے مل کر بنا ہے۔ ہندو روایت میں یہ لفظ بیوی کے لیے ان معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے کہ وہ شوہر کا آدھا جسم ہوتی ہے۔

Scanned with CamScanner

کیسی مایا کہ چھٹیوں پر جانے کے تصور کرنے کے وقت سے ہی دل کے بھٹکنے کا ایک سلسلہ سا شروع ہو جاتا ہے۔ کینٹ کا ٹائم ٹیبل جیسے ایک وبال ٹالنے کا سامان بن جاتا ہے۔ یادوں میں آنکھوں کے سامنے کے حال کی جگہ پچھلی چھٹیوں کا ماضی چھا جاتا ہے، پہاڑ کی گھاٹیوں کے کہرے کے چھا جانے کی طرح جو خود تو دھند کے سوا کچھ نہیں مگر جنگلوں اور پہاڑوں تک کو نگاہ سے غائب کر دیتا ہے۔ آخر یہی لگن گھر کے آنگن میں پہنچتے پہنچتے تک کہیں اندر اندر اڑتے پنچھیوں کی طرح ساتھ ساتھ چلتی ہے۔

دکھائی کچھ بھی صرف سپنوں میں پڑتا ہے، لیکن آواز تو جیسے ہر وقت اندر بھرتی رہتی ہے۔

کیا غضب کہ ٹنک پور کے قریب پہنچتے پہنچتے آنکھ لگ گئی تھی، جبکہ آنکھ کھلنے کے بعد پھر رات سے پہلے سونے کی عادت نہیں۔ جانے کون ساتھ میں سفر کرتی عورت باتھ روم کی طرف کو نکلی ہوگی، بالکل بھیما کی ماں کے پیروں کی سی آہٹ ہوئی تھی۔ چھٹیوں میں گھر پر رہتے ہیں تب دھیان نہیں جاتا، لوٹ آتے ہیں تب یاد آتا ہے کہ بھینیا چھاتے میں انتظار کرتے، سگریٹ پیتے، کوئی فلمی گانا گارہے ہوتے۔ آسمان میں یا چاند ہوتا تھا یا صرف تارے! رات کے سناٹے میں ایک طرف سول گاڑ (سول ندی) کے بہنے کی آہٹ کانوں میں آرہی تھی، دوسری طرف گھر کا کام نبٹا کر آتی ہوئی صو بیدارنی کی جھانجھروں کی آواز!

آواز ہی کیوں، دھیرے دھیرے شکل بھی ظاہر ہونے لگتی ہے۔ دھیرے دھیرے یوں تو بابو، بچوں بھی کی، مگر خاص طور سے اُسی کی جو دو تین برسوں کے وقفے میں چھٹیوں کی تیاری شروع ہوتے ہی قدرتی نظارے کی طرح نمودار ہو جاتی ہے۔ ساتھ پچھلی چھٹیوں میں گزرا ہوا وقت کبوتروں کی طرح کندھوں پر بیٹھتا، پنکھ پھڑپھڑاتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ جی میں آتا ہے کہ یہ ٹرین تو سُسری بار بار اڑیل گھوڑے کی طرح رک جاتی ہے — یہ کیا لے چلے گی، ہم اسے اُڑا لے چلیں۔ ریل گاڑی، بس سے سفر کرتے ہوئے بھی سارا راستہ پیدل ناپنے کا خیال گھیرے رہتا ہے۔ گاڑی رکتے ہی دیر تک گاڑی کے ڈبے میں پڑے رہنے کی جگہ آگے پیدل چل پڑنے کو جی چاہتا ہے۔ گھر پہنچنے کے بعد تو اتنا دھیان نہیں رہتا لیکن پہلے یہی خیال کہ صبح کے اجالے میں کیا عالم رہتا ہے، اور شام کے دھند لکے یا رات کے اندھیرے میں کیا، اُس جگہ کا جہاں صو بیدارنی رہا کرتی ہیں۔ یادوں کی دنیا میں چلتے پھرتے جیسے اور زیادہ روپ پکڑتی جاتی ہیں۔ سجاؤ بھی کیا پایا ہے، اکیلے ہی ساری کائنات چلاتی جان پڑتی ہیں — کائنات ہے بھی کتنی، جتنی ہم سے جڑی رہے۔

'پیں پیں' کی لمبی آواز سنائی دی تو گمان ہوا کہ کہیں کوئی اسپیشل بس تو نہیں لگائی جا رہی پتھوراگڑھ کے لیے۔ لیکن یہ تو ٹرک تھا۔ مایوس ہو کر نین سنگھ نے منھ پھیرا ہی تھا کہ پھر 'پیں پیں' ہوئی۔ گھوم کر دیکھا تو وہی ٹرک تھا۔ جیسے ہی رخ بدلا پھر وہی 'پیں پیں، پیں پیں!' اب دھیان آیا کہ ٹھیک ڈرائیور والی سیٹ کی بغل میں باہر نکلا کوئی ہاتھ ''ادھر آؤ! ادھر آؤ!'' پکار رہا ہے۔

نین سنگھ نے نہیں پہچانا۔ بن کھری والی دیدی کا حوالہ دیا تو ناتا جڑا کہ اچھا، کیا نام کہ جسوتی پردھان کا منجھلا کھیما ہے۔ ہاں سنا تو تھا کہ اِن لوگوں کی گاڑیاں چلتی ہیں۔ کھیم سنگھ کا بولنا دیوتاؤں کی آکاش وانی جیسا معلوم ہوا، اور ساتھ چلنے کا سگنل پاتے ہی نین سنگھ صوبیدار سامان ٹرک میں رکھوانے کی جنگی پیمانے کی بے تابی میں مبتلا ہو گئے، جیسے کہ یہ ٹرک ہی واحد اور آخری وسیلہ رہ گیا ہو گاؤں پہنچنے کا۔ اچھا ہوتا انبالہ سے ایک چٹھی بن کھری والی دیدی کو بھی لکھ دی ہوتی کہ فلاں تاریخ کے آس پاس گھر پہنچنے کی امید ہے۔ گھر والوں نے 'جاگر' بھی مان رکھا ہے اور ہاٹ کی کالِکا میں پوجا بھی دینی ہوئی۔ تم بھی ایک دو دنوں کو ضرور چلی آنا۔ بہنوئی تو پاکستان کے ساتھ دوسری لڑائی میں مارے گئے۔ پنشن یافتہ عورت ہے۔ بھائی بہن کے ساتھ ساتھ کچھ ایک ہی جیسے عملی میدان کا رشتہ بھی بنتا ہے۔ پتھوراگڑھ کے زیادہ تر گاؤں کی بیواؤں میں تو فوج میں بھرتی ہوئے لوگوں کی بیوائیں ہی ہوں گی، نہیں تو پہاڑوں کی صحت بخش آب و ہوا میں بڑی لمبی عمر تک جیتے ہیں لوگ۔

ٹرک کے اسٹارٹ ہوتے ہی نین سنگھ کو جیسے پنکھ لگ گئے ہوں۔ ٹرک کا روپ کچھ ایسا ہو گیا تھا جیسے کہ نین سنگھ صوبیدار بیٹھے ہیں تو وہ بھی چلا چل رہا ہے پتھوراگڑھ کو، نہیں تو کہاں اس شام کے وقت ٹنک پور سے چمپاوت تک کی چڑھائی چڑھتا پھرتا۔

کھیم سنگھ نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ رات تو آج چمپاوت میں ہی پڑاؤ کرنا ہوگا، لیکن صبح دس بجے تک پتھوراگڑھ سامنے۔ یہاں ٹنک پور میں ہی ٹھہر جانے کا مطلب ہوتا کل شام تک پہنچنا، حالانکہ گھر تو جو آنند جھٹ پٹے کے وقت پہنچنے کا ہے دوپہر کو کہاں! شام کا دھندلکا آپ کو تو اپنے میں لپٹائے رکھتا ہوا سا پہنچتا ہے، لیکن جہاں گھر پہنچنا ہوا تو اسے کون یاد رکھتا ہے۔

Scanned with CamScanner

دیکھیے تو وقت بھی عجب شے ہے — سب جگہ اور ہر وقت، وقت بھی ایک سا نہیں۔ شام کا وقت جو مطلب پہاڑ میں رکھتا ہے، خاص طور پر کسی گاؤں میں، وہ میدانی شہروں میں کہاں؟ پچھلے سال ٹھیک شام جھیلتے میں پہنچنا ہوا اور اتفاق سے گھر کے سارے لوگوں سے پہلے رُکما صوبیدارنی عرف بھیموا کی اماں ہی سامنے پڑ گئیں تو کیا ہوا صوبیدارنی کا حال اور کیا خود صوبیدار صاحب کا! کیا غضب کہ پندرہ سال پہلے چیت کے مہینے میں شادی ہوئی تھی اور جنگل کی ہرنی کا سا چونکنا ابھی تک نہیں گیا۔

بھیڑ بھاڑ والا علاقہ پار کرتے کرتے، کھیم سنگھ کے ساتھ خیر خیریت پوچھتے اور ادھر اُدھر کی باتیں کرتے اور کیپسٹن سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے بھی نین سنگھ صوبیدار ماضی کے دھندلکوں میں ڈوبتے ہی چلے گئے۔ کھیم سنگھ ٹرک کے ساتھ ساتھ خود کو بھی ڈرائیو کرتا جان پڑتا تھا۔ اس کے تمام حواس جیسے پوری طرح ٹرک کے حوالے ہو گئے تھے۔ اور دیکھیے تو ٹنک پور سے پتھورا گڑھ کی طرف کو جاتے یا اس طرف سے آتے ہوئے راستے پر گاڑی چلانا بھی کسی کرشمے سے کہاں کم ہے۔ پلک جھپکتے میں ایسے ایسے موڑ ہیں کہ ڈرائیور کا دھیان چوکتے ہی، بسیرا نیچے گھاٹی میں ہی ملنا ہے۔

ٹرک رفتار سے زیادہ شور پیدا کر رہا تھا۔ آخر دو تین کلو میٹر پار کرتے کرتے میں ہی، پہلے ٹرین میں رات بھر ٹھیک سے سو نہ سکنے کی تمہید باندھی اور پھر آنکھیں بند کر لیں نینا صوبیدار نے، مگر نیند کہاں۔ آنکھ بند رکھنے میں سڑک ٹرک کے ساتھ ہی مڑتی جان پڑتی تھی، ٹرک سڑک کے ساتھ جاتا ہوا۔ نیچے اب اتھاہ معلوم ہوتی میلوں گہری گھاٹیاں ہیں اور کھیم سنگھ کا یا خود ٹرک کا دھیان ذرا سا بھی چوکا نہیں کہ...

صوبیدار نین سنگھ نے ہڑ بڑا کر آنکھیں کھولیں تو سامنے کا ایک ایک منظر پوچھتا سا دکھائی دیا، ''آنکھیں کیوں بند کر لے رہے ہو؟''

سچ مچ نیند ہو تو بات اور ہے، نہیں تو ٹنک پور پتھورا گڑھ کی اُدھر میں ٹانگتی سی سڑک پر کہاں اتنا اطمینان کہ آنکھیں بند کیے رُکما صوبیدارنی کی ایک ایک جھلک کو یاد کرتے رہو۔ پچھلی چھٹیوں میں رامی یعنی رَموا صرف ڈیڑھ سال کا تھا اور سالا الّو کا پٹھا بالکل بندر کے ڈیگرے کی طرح ماں کی چھاتی سے چپکا رہتا تھا۔ اِس بار کی چھٹیوں کے لیے تو صوبیدار نے تب ایک ہی کوشش رکھی کہ دو لڑکے 'مور دین سیفیشنٹ' مانے جانے چاہئیں۔ ضرورت اب صرف ایک عدد لڑکی کی ہے۔ کچھ کہیے صاحب، جو آنند لڑکی کے پالنے پوسنے میں ہے، جیسے وہ آئینے کی طرح آپ کو اپنے میں جھلکاتی سی، بولتی بتیاتی ہے، وہ

بات سُسر ے لڑکوں میں کہاں۔ اس لیے پچھلی بار جی جان سے لڑکی کی کوشش تھی، اور اسی کوشش میں تھی یہ دعا کہ ہے میا، ہاٹ کی کالِکا! آگے کیا کہوں، تو خود سب کچھ جانتی ہی ہے۔

چلتے چلاتے ہی یہ بھی یاد آ گیا نین سنگھ صوبیدار کو کہ اس دفعہ گھر سے اس قسم کی کوئی خبر چٹھی میں نہیں آئی۔ لگتا ہے میا پوجا پانے کے بعد ہی پرشاد دے گی۔ وہ بھی تو آدمی کے سہارے ہے۔ جیسا جس کا یقین ہو، ویسا ہی روپ اس کا ٹھہرا۔

مایوسی کے سمندر میں امید کے جہاز کی طرح ٹرک لے کر نمودار ہونے والے کھیم سنگھ کے لیے احسان مندی کا جذبہ فطری ہی نہیں ضروری بھی تھا، کیونکہ ملٹری میں نوکری سے گھر لوٹتے شخص کا نبکا ہی کچھ اور ہوتا ہے لوگوں میں۔ پھر کھیم سنگھ سے تو دیدی کی وجہ سے بھی رشتہ ہوا۔ لگ بھگ ہر دس پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر ٹرک کو آرام دیتے ہوئے کھیم سنگھ و چائے پانی، گٹک رائتے کو پوچھنا اپنی ذمے داری ہی لگتی رہی صوبیدار کو۔ صوبیدار کی بیچ بیچ میں سیٹی بجانے اور گانے کی کوشش بھی اسی احتیاط کی وجہ سے رہی کہ کھیم سنگھ کو پتا چلے کہ یہ سب تو بہت معمولی باتیں ہیں۔ بس کا کرایہ بچ بھی گیا ہے تو گھر میں بچوں کے ہاتھ میں رکھنے کو تو کچھ روپے زبردستی بھی دینے ہی ہوں گے۔ ٹکٹ کے پیسوں سے ڈونے ہی بنیں گے، کیونکہ ابھی تو چمپاوت میں پڑاؤ ہونا ہے اور وہاں رات کا ڈنر بھی تو صوبیدار کے ہی ذمے آئے گا۔ مگر خوشی اس بات کی ہے کہ ٹنک پور میں اگر کسی ہوٹل میں رہنا پڑ گیا ہوتا تو جیب جو کٹتی سو کٹتی، یہ آدھا پہاڑ کہاں پار ہوا ہوتا۔ اب تو جہاں آتی جاتی، کھیتوں میں کام کرتی عورتیں نظر آتی ہیں، جی میں صوبیدارنی کی پرچھائیں گھومتی پھرتی ہے۔

ابھی ابھی بھومیادار کی چڑھائی پار کرتے میں، وہ اوپر کے کھیت میں 'نیولی' گاتی کچھ عورتیں اپنے کو ہی دل کا حال سناتی جان پڑ رہی تھیں، جیسے کہتی ہوں کہ پلٹن سے لوٹ رہے ہو، ہمارے لیے کیا لائے ہو؟ جی میں تو آیا کہ کچھ دیر کو ٹرک رکوا کر یا تو ان عورتوں کے پاس تک خود جایا جائے اور یا انھیں ہی اشارہ کیا جائے کہ یہاں تک آ کر نیولی ٹیپ کرا جائیں — فیس کا ٹرانزسٹر کم ٹیپ ریکارڈر یعنی 'ٹو ان ون' اسی مقصد سے تو لائے ہیں — لیکن پہلے تو خود صوبیدارنی کی نیولی ٹیپ کرنی ہے۔ ماں تو سورگ باشی ہوئی۔ کچھ ہی سال پہلے تک دونوں ساس بہو مل کے 'نیولی' گاتی تھیں اور زیادہ رنگ میں ہوئیں تو ایک

Scanned with CamScanner

دوسرے کی کولی بھر لیتی تھیں۔

استری تو[2] بھی کیا شے ہے! پوری کائنات میں بھرا ہوا۔ کوئی اور چھور تھوڑے ہی ہوا ان کی ممتا کا۔ لامحدود سرشٹی[3] ہوئی، نئے نئے روپ، نئے نئے کھیل۔ دیکھیے تو کیا کر سکتا ہے ہزار بندشوں میں جکڑا بندہ۔ خواہش کر لیتا ہے، صبر کر لیتا ہے۔ صوبیدارنی سے ملتی جلتی اور اپنے دل کا حال سناتی سی عورتوں کا اوجھل ہونا دیکھتے چل رہے ہیں نین سنگھ صوبیدار بھی۔ سواری کا وسیلہ بھی تو محض ایک بہانہ ہوا۔ چلنے والا تو ہر حال میں آدمی ہی ٹھہرا۔ آدمی چلتا رہے تو گاڑی موٹر، سڑک، کھیت کھلیان، پیڑ جنگل، اور چرند پرند بھی ساتھ چلتے رہے۔ آدمی رکا تہاں بھی رک گئے۔ آدمی کو دکھتے تک میں لامحدود کائنات کا سب کچھ جاندار اور متحرک ہوا۔ آدمی کی نگاہ سے اوجھل ہوتے ہی سب کچھ صفر ہو جانے والا ٹھہرا۔

کیا ہے کہ دھیان دھرتا ہے آدمی، دھیان کرتا ہے آدمی۔ دھیان سے ہی صوبیدارنی بھی ٹھہری۔ عورتیں سب لگ بھگ یکساں ہوئیں اور لگ بھگ سبھی ماں، بہن، بیٹی وغیرہ۔ لیکن کسی کی کوئی بات دھیان میں رہ گئی، کسی کی کوئی۔ ماں کا سورگ سدھارتے وقت کا ''نینوارے'' کہتے ہوئے پورے بدن پر ہاتھ پھرانا دھیان میں رہ گیا ہے، تو رُکما صوبیدارنی کا دیکھتے ہی ہرنی کی طرح چونکنا۔ فوٹو کیمرا مین ہو جانے والی ٹھہری یہ عورت اور آپ کے ایک ایک نین نقش کو پکڑتی، ظاہر کرتی، ایسا دھیان کھینچ لے کہ پندرہ سالوں کی گرہستی میں بھی آنکھوں کی آب جوں کی توں ہوئی۔ اور باقی تو جسم میں جو ہے سو ہے مگر آنکھیں کیا چیز ہوئیں کہ جان تو یہیں جھلمل کرتی ٹھہری۔ پھر رکما صوبیدارنی کا تو حال کیا ہوا کہ جیسے کھیم سنگھ اسٹیرنگ ویل کو ہاتھوں سے گھمار ہا ہے، ویسے آپ کو صوبیدارنی صرف آنکھوں سے گھما سکنے والی ٹھہری۔ یہ بات دوسری ہوئی کہ بہت سے معاملوں میں وہ 'ریز رو فاریسٹ' ہی ٹھہری۔

نین سنگھ کا ایکا ایک اور اچانک ہنس پڑنا جیسے جنگل کی ونس پتیوں[4] اور پنچھیوں تک میں پھیلتا چلا گیا۔ کھیم سنگھ کا دھیان بھی چلا گیا اس اچانک کے ہنس پڑنے پر، تو اس نے بھی یہی کہا، ''فوج کا آدمی تو بس انھی چار دنوں کی چھٹیوں میں جی بھر ہنس بول اور موج مچا کر لیتا ہے، داجیو! کچھ جاندار چیز تو آپ ضرور ساتھ لائے ہوں گے۔ یہاں تو پہاڑ میں سسری آج کل ڈابر کی گنو ماتا کا دودھ مُوت چل رہا ہے۔ مردہ امرت سُرا! تھری ایکس رم، بلیک نائٹ، پیٹر اسکاٹ وسکی اور ایگل برانڈی جیسی چیزیں تو اوقات

---

[2] استری تو: نسوانی اصول۔ [3] سرشٹی: تخلیق۔ [4] ونس پتی: نباتات

سے بالکل باہر پہنچا دیں سرکار نے۔"

چمپاوت آتے ہی کھیم سنگھ نے ٹرک کو پہچان کے ڈھابے کے کنارے کھڑا کر دیا، کچھ ایسے ہی انداز میں جیسے گائے بھینس تھان پر باندھ رہا ہو۔ انگلیوں کی قینچی پھنسا کر لمبی جماہی لیتے ہوئے "جے ہو کالکا میا کی، آدھا سفر تو خیر سے کٹ گیا،" کہا اُس نے اور نظر صوبیدار پر جما دی۔

مطلب تو راستے میں ہی سمجھ لیا تھا اور ٹھان بھی لیا تھا کہ جاتا ہی دیکھو تو دل دریا بنا لو۔ ہنستے ہوئے ہی اشارہ کر دیا کہ معاملہ ٹھیک ٹھاک ہے۔ کھیم سنگھ کا تو روز کا معمول ہوا۔ جتنی دیر میں کھیم سنگھ ڈھابے کی طرف نکلا، صوبیدار نے اپنی وی آئی پی اٹیچی کھول کر، اس میں ہینڈ لوم کی کوری دھوتی میں لپیٹی ہوئی کوٹے کی تھری ایکس بوتلوں میں سے ایک باہر نکالی۔ کچھ دبدھا میں ضرور ہوئے کہ کوئی خالی اَدھا پڑا ہوتا تو ففٹی ففٹی کر لیتے۔ ڈرائیوروں کلینروں کی نظروں سے تو باقی چھپڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔ جب تک کسی طرح یہ انتظام کرتے، کھیم سنگھ نہ صرف کٹی پیاز، بلکہ کلیجی، گردہ، دل، پھیپھڑے کے ساتھ ہی آلو بھی ملائے ہوئے بھونے کی بھاپ اٹھتی پلیٹ لیے موجود! کہو کہ پانی کا جگ لانا رہ گیا تو اتنے میں آدھی بوتل تھرمس میں کر لینے کا موقع مل گیا۔ چلو اب کہنے کو ہو گیا کہ کچھ راستے میں لے چکے، بوتل میں باقی جو بچ رہی ہے سو آج کی رات کے نام ہے۔

غنیمت کہ کلینر ہری رام کچھ ہی دوری پر کے اپنے گاؤں چلا گیا اور کھیم سنگھ نے بھی مربھکا پن نہیں دکھایا۔ سچ کہیے تو آدمی کے بارے میں اپنے حساب یا اپنی طرف سے آخری بات بھول کر بھی طے نہ کرے کوئی۔ بہت رنگارنگ جاندار ہوا کرتا ہے! اس کی آنکھوں میں پڑھ رہے ہیں آپ کچھ اور ہی لیکن دل میں اس کے جانے کیا ہے۔ ایک ایک پیسے کو سانسوں کی طرح اٹھا کر کے چلنا ہوتا ہے چھٹیوں میں، کیونکہ بندھن ہزار ہیں۔ ایسے میں پیسہ جسم میں سے بوٹی کی طرح نکلتا جان پڑتا ہے، کیونکہ گاؤں گھر اڑوس پڑوس میں ہی اگر نہ ہوا کہ نین سنگھ صوبیدار کا چھٹیوں پر گھر آنا کیا ہوتا ہے تو ناک کہاں رہی۔ اور اب اسے بھی تو ناک رکھنا ہی کہیں گے کہ بھٹوا اور پراٹھے، شکار[۵] بھات، ڈنر کا سارا خرچ کھیم سنگھ نے اپنے ذمے لگا لیا کہ "داجیو! چمپاوت سے اپنا ہوم لینڈ شروع ہو جاتا ہے۔ آج تو آپ ہمارے گیسٹ

---

۵ شکار۔ ماس، گوشت۔

ہو۔ کھانے کا بندوبست ہماری طرف سے، پینے کا آپ کی! مرنا ہمارا، جینا آپ کا۔ سینہ ہمارا، چاقو آپ کا! کوئی چیز کسی وقت میں ہو جاتی ہے تو اسے 'گاڈ گفٹ' مان لینا۔ منوا! آپ ہم کو کڑک فوجی ڈریس میں بس اڈے پر کھڑے دکھ گئے، یہ بھی بھگوان کی مرضی کا کھیل ٹھہرا! ٹھہرا کہ نہیں ٹھہرا؟ اگر نہیں تو کون جانتا ہے ملاقات بھی ہوتی یا نہیں۔ آپ 'بھرتی ہو جا فوج میں، زندگی ہے موج میں' گاتے بجاتے، چھٹی کاٹ کر چل بھی دیتے۔"

پریم ہے کہ نفرت ہے، جہاں شراب کچھ اندر تک اتری تہاں آدمی کی اصلیت بولنے لگتی ہے کہ وہ دراصل ہے کیا۔ اس وقت کم سے کم کھیما ساتھ ہے تو کچھ گھر کا سا ماحول ہے۔ کہیں ٹنک پور میں ہی اٹک گئے ہوتے تو پھر وہی آدھے انگ کا کھانا پینا اور سونا۔ کیمپ چھوڑا تھا تب سے لگاتار یہی ہوا کہ ادھورا ادھورا لگتا ہے۔ ہر لمحہ کسی کی یاد ہے اور بس تھوڑے سے فاصلے پر ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔ اس مایا جیسی پرچھائیں کو جسم کا روپ لینے میں ابھی بہت وقت لگنا ہے۔ کل جا کر گاؤں پہنچیں گے تب ہی یہ بے چینی تھمے گی۔

"جب تک 'سدرشن چکر'[۶] ہاتھ میں ہے تب تک توبہ ہے! اس کو چھوٹا منھ بڑی بات مان لینا داجیو! کون 'ہز بینڈ آف مدر' جھوٹ بول رہا ہے! کھیم سنگھ ڈرائیور کا نام لے کر انکوائری کر سکتا ہے ہر شخص جو کہ چلتا ہے ٹنک پور سور کی اس لائن میں، جہاں کہ ذرا سا بے لائن ہوئے آپ شریمان جی، تو سمجھیے کہ مربہ تیار ہے!" کہتے ہوئے کھیم سنگھ نے بھٹوے کی پلیٹ کو اٹھا کر اس میں لگا تیل مسالہ چاٹنا شروع کر دیا تو درمیانہ سطح کے سرور میں صوبیدار کا دھیان گیا سیدھے اس بات پر کہ راستے میں جانے کتنی بار سچ مچ یہی جھس جھس ہوئی تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو...

آئیڈنٹٹی کارڈ ساتھ میں رہتا ہے، شناخت ضرور پہنچ سکتی ہے، لیکن آدمی کی جگہ صرف اس کی شناخت کا پہنچنا کتنا خطرناک ہو سکتا ہے اس بات کی تمیز تو اس کائنات کے سرجن ہار تک کو نہیں رہی۔ ایک خوبی اس چیز میں ہے — ایک دم لائن کے پار نہ نکل جائے آدمی تو پل پر کا چلنا ہے۔ نیچے آپ کے سست رفتار کی ندی بہہ رہی ہے اور آس پاس کے پہاڑ سر ے ایسے گھور رہے ہیں جیسے گھر والی میکے جاتی

---

[۶] سدرشن چکر: پھرکی کی شکل کا ہتھیار جو ہندو دیومالا کی رو سے کرشن کے ہاتھ میں رہتا ہے۔ یہاں مراد اسٹیئرنگ وہیل سے ہے۔

Scanned with CamScanner

ہو۔ تصور اگر کسی چڑیا کا نام ہے تو ٹھیک ایسے ہی موقعے پر پنکھ کھولتی ہے۔ جتنی بار خطرناک موڑ پڑتے تھے اتنی ہی بار صوبیدارنی جنگل میں ہرنی جیسی بے چین جان پڑتی تھی، کیونکہ دھیان میں تو بیٹھی رہتی ہے وہی۔ اور اندر ہی اندر دونوں ہاتھ بار بار اس پرارتھنا میں اٹھ جاتے رہے تھے کہ ''ہے میا، ہاٹ کی کالکا!''

عورت ہے کہ دیوی ہے—— مایا موہ اور ڈر خوف کا ہی سہارا ہے۔ اٹیچی میں چھچھماتا لال ساٹن ڈیڑھ میٹر رکھا ہوا ہے اور پون انچی سپر فائن گوٹ اور ستارے۔ چولا میا کا صوبیدارنی خود اپنے ہاتھوں تیار کرے گی۔ جب تک میا کا ایسا دھیان ہے، تب تک حفاظت ضرور ہے، نہیں تو فوج کی نوکری میں کون جانتا ہے کہ سرکار نے کب دانہ پانی چھڑا دینا ہے۔ کیولری کی زندگانی ہے۔ زین لگام ہی یونیفارم ہے۔ پچھلے سال اچانک ہی کیسے بلیو اسٹار آپریشن * ہو گیا اور کتنے ویر جوان ملک پر قربان ہو گئے۔ اگنی کو بھی قربانی ہی چاہیے۔ دیس کی جیوتی روشن رہے۔

اب نینا صوبیدار کا جی کر رہا تھا ایک پلیٹ بھٹوا اور منگا لیں، پھر چاہے تھرمس تک نوبت کیوں نہ آ پہنچے۔ جانے کو تو یہ زندگی ہی چلی جانے کے لیے ہے لیکن کچھ وقت ایسے ضرور آتے ہیں جو چاندی کے سکوں کی طرح بولتے معلوم پڑتے ہیں کہ ہم ساتھ رہیں گے۔ اب جیسے رُکما صوبیدارنی کا ہی دھیان ہے، یہ محض ایک آدھ جنم تک ہی ساتھ دینے والی چیز تو نہیں ہے۔ پہلے کیسے دھوتی کے پلے میں ناک دبا لیتی تھیں صوبیدارنی صاحبہ، پچھلی بار کی چھٹیوں میں نمونیے کی پکڑ میں تھی تو دو چمچ برانڈی پلانا، مچھلی کا منھ کھول کر پانی کا گھونٹ ڈالنا ہو گیا۔ بعد میں خود کہنے لگیں کہ کھیت جنگل کے کاموں سے ٹوٹا بدن کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے۔

چونکہ بھگتان کرنے کا ذمہ کھیم سنگھ نے لیا تھا اس لیے جھجک تھی کہ یہ زور ڈالنا ہو جائے گا، مگر اپنے اندر کی بھاشا کھیم سنگھ میں پھوٹ پڑی۔ ''صوبیدار داجیو، بھٹوا بہت زوردار بنا ٹھہرا۔ ایک پلیٹ اور لاتا ہوں۔''

آخر آخر تھرمس کھنگال کر پانی پینا پڑا لیکن نہ کھیم سنگھ آپے سے باہر ہوا، نہ صوبیدار۔ دھیرے دھیرے جانے کہاں کہاں کی گپ شپ لگاتے میں رم جھم رم جھم جذب ہوتی چلی گئی۔ کیمپ کی کینٹین سے باہر نکلنے کی سی آسودگی میں، دونوں اب کھانا کھانے ڈھابے کی بیچ تک پہنچے تو دیکھا، ڈھابے کی

* آپریشن بلیو اسٹار: ۱۹۸۴ء میں امرتسر کے گولڈن ٹمپل پر بھارتی فوج کی چڑھائی۔

مالکن ہی پراٹھے سینک رہی ہے، اور اتنا تو کھیم سنگھ نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ یہاں کے کھانے میں رس ہے۔ عورت بھی کیا چیز ہے صاحب! جو ذائقہ سل پر پسے مسالوں کا، سو پڑیا میں کہاں ہے، اور پراٹھے سالا کوئی مرد سینک رہا ہو تو گھی چاہے جتنا لگا لے مگر یہ جگ کو موہتی آواز اور ہنسی کہاں سے لائے گا۔ اِدھر پراٹھا بیلتی ہے، سینکتی ہے اور اُدھر مذاق بھی کرتی جاتی ہے کہ ''صوبیدارنی بہت یاد آ رہی ہوں گی!'' کہاں کہاں تک پھیلا دیا اسے بھی پھیلانے والے نے — جہاں دیکھو ویسی ہی چمک ہے۔ جہاں آپ جل رہے ہیں، جانے کب شکر ہو گئی۔ بولتی ہے اور اچانک ہی ہنس دیتی ہے تو دکانداری کرتی کہاں دکھائی دیتی ہے۔ کیسے پلک جھپکتے میں داؤں لگا دیا کہ ''آدمی تو دور دیس اور برسوں کا لوٹا ہی چیز ہوتا ہے!'' پکی عمر کو پہنچنے پر بھی ایک آنچ ہے۔ ماحول میں گھر کی سی گرمی معلوم دینے لگی۔

''ہاں ہاں'' کہنے کے سوا اور کیا کہنا ہوا۔ تین سال کے بعد لوٹنے میں تو اپنے علاقے کا اِس پیڑ سے اُس پیڑ کی طرف کودتا پھاندتا بندر بھی اپنا سا ہی لگتا ہے۔ یہ تو انّ پورنا دیوی کی سی مورت سامنے ہے۔ ہونے کو تو کچھ سرور تھری ایکس کا بھی ضرور ہے، مگر جب تک اندر کی دھارا سے سنگم نہ ہو، نشہ چاہے جتنا ہو لے، وہ آسمانی نشاط کہاں!

چولھے کی آنچ میں وہ کسی بن دیوی کی مورتی کی سی شکل میں لگتی ہے۔ سونے کا گلوبند جھلملا رہا ہے۔ پراٹھا تھاپتے میں ہاتھوں کی چوڑیاں بج رہی ہیں۔ بیچ بیچ میں ماتھے پر کے بال ہٹانے کو بائیں کہنی ہوا میں اٹھاتی ہے تو رُکما صوبیدارنی کی نقل اتارتی سی جان پڑتی ہے۔ خواہش ہو رہی ہے، دو کے سوا اور کوئی موجود نہ ہو۔ کوئی کوئی وقت جانے کیسی بے صبری سی بھر دیتا ہے اندر، کہ کہیں یہ بیت نہ جائے۔

نین سنگھ صوبیدار کو ایک ایک نوالہ پہلے پربت، پھر رائی ہوتا گیا۔ آنکھوں کی دنیا الگ ہوتی گئی، ہاتھ، منھ، پیٹ کی الگ۔ کھیم سنگھ کو تو شاید یہ گمان ہوا کہ تھری ایکس نے بھوک کا منھ کھول دیا ہے، لیکن صوبیدار کو جان پڑا کہ یہ اکیلے کا کھانا نہیں۔ بس یہی پھر صوبیدارنی کا سامنے بیٹھے ہونا سا محسوس ہوا نہیں کہ ڈکار بھی آ گئی۔ گلاس بھر پانی ایک ہی لے میں گٹکتے صوبیدار ہاتھ دھونے نل کی طرف بڑھ گئے۔

کچھ لمحے ایسے ہوتے ہیں کہ پھیلتے جاتے ہیں، اور کچھ پھیلے ہوئے وقت لمحوں کی طرح گزر جاتے ہیں۔ راستے کا ایک دن کتنا پربت، لیکن گھر پر مہینے بھر کی چھٹیاں ذرا سی دیر میں کافور ہو جاتی ہیں۔

Scanned with CamScanner

پنچھیوں سا اڑتا وقت کان میں آواز دیتا رہتا ہے، لو آج کا دن بھی بیتا تمھارا — اب باقی کتنے ہیں؟

بابو نے تھوڑا بہت 'جاگر' گا تو دیا، ''بدشگونی کیوں کرتے ہو'' کہنے اور صوبیدار بہو کی گائی ہوئی 'نیولی' کے کچھ بند سُن لینے پر، لیکن آخر تک ان کا یہ افسوس گیا نہیں کہ جتنی رقم اس فوٹو کیمرے اور ٹرانزسٹر ٹیپ ریکارڈر میں لگادی صوبیدار نے، اتنی میں گھر کے کتنے ضروری کام نمٹ جاتے۔ البتہ جرسی، بوٹوں، اور تھری ایکس کی تین بوتلوں سے ان کی آتما ضرور خوش ہوگئی کہ ''یار پتر، جاڑے کی مار سے بچانے کو آگیا تو۔''

چار سیل والا ٹارچ بھی انھیں بہت بھایا اور پانچ دس دن بیتتے نہ بیتتے تو خود ہی اس مزیدار موڈ میں آگئے کہ ''یار پتر، پیسہ تو سالا ہاتھ کا میل ٹھہرا! مرد کی شان ٹھہری زندہ دلی اور رنگینی! لے، آج تو بھی کیا یاد کرے گا، 'بھگوتی جاگرن' پوری شردھا سے کردیتا ہوں۔ کیا کہتا ہے تو کیا کرتا ہوں؟ ریکارڈر آن کرتا ہوں؟ تو کر پھر آن۔ ہری بھگوان جی، پہلا دھیان میں کس کا دھرتا ہوں؟ تو دھیان دھرتا ہوں اس چوکھی پالنے والی کا، میا مہا کالی کا جس نے کہ یہ پوری کائنات رچی اور آکاش کی جگہ پر آکاش، دھرتی کی جگہ دھرتی اور پہاڑ کی جگہ پہاڑ، ندی کی جگہ ندی، اگنی کی جگہ اگنی اور، کیا نام، ماتا گوری شنکری، کھپّر دھارنی، کہ پانی کی جگہ پانی کو پیدا کیا اور پھر پھول کو پتے، اور دودھ کو کٹورے جیسے آدھار پر رکھا۔ ہاڑ ماس کے پتلے میں رکھی جان کی سنجیونی بوٹی! آ ہاری میا، شیر پر سواری کرنے والی، کیسی اپرم پار ہوئی سرشٹی کہ سارے برہمانڈ میں ایک مہا شبد پھیل گیا۔ آدمی تو آدمی ہوا، پاتال کا پنچھی بھی 'میں یہاں، تو کہاں' گاتا دکھائی دیا۔ کہیں اونچا ہمالیہ رکھا کہیں گہرا سمندر، کہیں دھوپ رکھی کہیں چھایا، کہیں موہنی رکھی کہیں مایا۔ دوسرا سمرن تیرا ہے ماتا بھگوتی، کہ گھر کو گھرنی تو ہوئی، بن کو ہرنی، پوت کو ماتا ہوئی، پتا کو کنیا کماری...''

بابو 'دیوی جاگرن' گائے جارہے تھے۔ جانے کب انھوں نے گلاس میں باقی بچی رَم کو ایک ہی گھونٹ میں چڑھا کر، کھونٹی پر سے ہُڑکا[۸] بھی اتار لیا اور ڈُرٹکی ٹُرٹُر کا لہرا لگاتے، پوری طرح لہر میں ہوگئے۔ ان کے ماتھے پر کی چٹیا تک رنگ میں آگئی۔ پوری پٹی میں کون ہے ان کے مقابلے میں بھگوتی مہا کالی کا جاگرن رچانے والا؟ لیکن نینا صوبیدار کا دھیان تو ''کنیا کنیا'' سنتے ہی اس طرف چلا گیا تو

---

[۸] ہُڑک یا ہُڑکا: ہمالیہ کے پاس کماؤں کے علاقے میں بجایا جانے والا ایک ساز۔

پھر لوٹنا مشکل ہو گیا، کہ آج تو انیسواں دن ہے، انھوں نے تو گھر پہنچنے کے پہلے ہی دن مذاق مذاق میں صوبیدارنی کے پاؤں ہی پکڑ لیے تھے کہ ''بھگوتی، کنیا ہی دینا!'' ہاں، ترنگ تو کچھ تب بھی ضرور رہی ہوگی... لیکن منظر بھی نمودار تبھی ہوتا ہے جبکہ اندر ہلچل ہو۔ 'جاگر' میں بھی تو یہی بتایا بابو نے کہ پہلے تو پیدا ہوا شبد، تب کہیں جا کر صورت!

اسی بات پر تو کھیما کے ساتھ ٹرک میں کے سفر کی طرح پھر اچانک ہنسی پھوٹ پڑی اور بابو نے سمجھا کہ کچھ زیادہ چڑھ گئی ہوگی۔ ایک دو بند اور گا کر، ہڑکے کی پاگ کو گلے سے اتار کر ہڑکے میں ہی لپیٹ دیا۔ ''کل کا دن بیچ میں ہے نین! پرسوں سنیچر۔ تین دن کا جگار میا ہاٹ کی کالکا کے دربار میں لگنا ہی ہے۔ جا، سو جا، بھور راستہ دیکھتی ہوگی۔ میا کے دربار میں دیکھنا کیسا جاگر لگاتا ہوں۔ آخری جاگر ہوگا یہ...''

بڑھوا جی بھی بدماش ہیں، ''بچے راستہ دیکھتے ہوں گے'' نہیں کہتے! کیا کہہ رہے تھے اُس دن کہ جیون کی چکی کا ایک پاٹ جاتا رہا، ایک رہ گیا۔ ماں کو سورگ گئے ٹھیک کتنے سال بیتے ہوں گے؟

جوں جوں چھٹیاں پونچھ سی باقی رہتی جاتی ہیں، بیتا ہوا وقت اور پھیلاؤ پاتا چل رہا ہے۔ چمپاوت میں رات کیسی بیتی تھی؟ اندر اندر کوئی یہاں تک زور باندھنے لگا تھا کہ رائفل کی نوک پر سامنے بٹھائے رکھو اس عورت کو اور بتاؤ اِسے کہ روئیں روئیں میں جو بے تابی جگائے چلی گئی ہو اس کا دَین دار کون ہے؟ ہوا کی جگہ آندھی کا روپ رکھتی ہوئی، خود غائب ہوتی جا رہی ہو اور نین سنگھ صوبیدار پیڑ کی ڈالوں سے لے کر پہاڑ کی چوٹیوں تک کانپتا پڑا رہ گیا ہے رات کے اس بے انت لگتے سناٹے میں۔ روپ بھی جسم سے ہے، اِسے کیا تم نین سنگھ صوبیدار سے کم جانتی ہو، بھگوتی؟ آنکھوں سے لاچار شخص کھینچتا ہے، بلوان تو ہاتھوں سے کام لیتا ہے۔

بس اسی بلوان والی بات پر صوبیدار کو کھیم سنگھ کے ساتھ چپ چاپ اٹھ جانا پڑا کہ کہیں 'جمبو بولے یہ گت بھئی، تو کیا بولے کا گا' والی بات نہ ہو جائے۔ بڑا اچھا بدنام بُرا۔

تب کا بیتا وقت اب تک ساتھ ہے۔

اڈے تک سچ مچ صبح دس بجے سے بھی کچھ پہلے پہنچا دیا تھا کھیم سنگھ نے۔ صبح صبح چمپاوت سے لوہاگھاٹ تک کتنی گہری اور گاڑھی دھند تھی۔ ٹرک سمیت کہیں ان دیکھی دنیا میں داخل ہونے کا سا گمان

ہوتا تھا، اور ڈر۔ سارا دھیان اسی بات پر ٹنگا تھا کہ کیا سچ مچ اسی جنم میں پھر ڑکما صوبیدارنی ہوں گی اور ان کے ساتھ کا تالاب میں کی مچھلی کا سا اس کونے سے اس کونے تک اڑنا؟ گھر پہنچنے کے بعد تھوڑی تنہائی پاتے ہی صوبیدارنی ایکا ایک دونوں پاؤں جکڑلیں گی اور سوتے سے پھوٹ پڑیں گے دھرتی میں۔ جنم جنمانتروں کی سی بے تابی میں ان کی پیٹھ تک کانپتی ہوگی۔ تب ہاتھ بغلوں میں ڈالے اوپر اٹھائیں گے صوبیدار اور تسلی دیتے میں ہی یکجان ہو جائیں گے۔ تب ٹرک کے سفر میں ہی جانے کتنی بار ہوا کہ پرماتما تو دلوں کا حال جانتا ہے، اس سے کیا چھپا ہے، مگر بغل میں ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھا کھیم سنگھ بھی نہ دیکھ رہا ہو۔ جب کوئی جاگ آ ہے ہر لمحہ آدمی کی یادوں میں، تو چرند پرند بھی اندر تک جھانکنے سے لگتے ہیں۔

صوبیدارنی صاحبہ سے کیا کہا تھا اُس پہلی رات ہی، کہ ''ایک آنکھ سے ہم دیکھ رہے ہیں ایک سے تم! وہ بھگوتی پراٹھا سینکتی جاتی ہے، اور منجیرا سا بجاتی ہے کہ ایک پراٹھا تو اور لو، صوبیدار صاحب!' اور ہمیں آپ ہی سینکتی کھلاتی نظر آتی ہو۔ یہ تو آپ نے اب بتایا کہ کل رات کا برت رکھا تھا۔ دیکھیے کہ ہم بنا خبر ہوئے ہی دو جنوں کا کھانا کھا گئے۔''

کیا رکھا ہے بنا لے کسی آدمی کی زندگی میں، اگر کہیں پاؤں سے لے کر سر سے اوپر تک کا گہرے تالاب جیسا پریم نہیں رکھا ہے۔ کہاں تو ایک خاموشی کا سا عالم تھا شروعات میں، پھر شبد پھوٹا ایکا ایک، تو سچ مچ ایک سرشٹی ہوتی چلی گئی۔ جیبھ میں لپٹا دھاگے کا گچھا ہٹ گیا اور آواز جھرنا ہوتی گئی۔ جانے کب، کہاں رات بیتی۔ صوبیدارنی صاحبہ نے نہیں ٹوکا ایک بار بھی۔ صرف اتنا کہتی اٹھ کھڑی ہوئیں کہ ''صبح کا تارا نکل آیا ہے''۔ صوبیدار کو یہی ہوا کہ ماتا بھگوتی تو نہیں تو اور کون ہے! کون جاگتا ہے دن رات ہمارے لیے؟ کون دیتا ہے اتنا دھیان؟ کسے پڑی ہے ہماری اتنی چنتا؟

وہ گاؤں پہنچنے کی پہلی ہی رات تھی لیکن ڈونگرے گرائپ واٹر والے کیلنڈر میں ماتا ہاٹ کی کالکا کے پاؤں کے نیچے آپڑے شوشنکر کی سی جو حالت محسوس ہوئی تھی وہ اب تک ساتھ ہے۔ فرق اتنا کہ شنکر انجانے میں آ گئے پاؤں کے نیچے، نینا صوبیدار اندر کے زور سے۔ صوبیدارنی ''صبح کا تارا نکل آیا'' کہتی کھڑی ہوئی ہی تھیں کہ بستر سے باہر پاؤں رکھتے تک میں نینا صوبیدار نے ان پر اپنا متھا ٹیک دیا تھا۔ منھ سے کچھ نہیں بولے، مگر صوبیدارنی نے سب سن لیا۔

Scanned with CamScanner

چھٹیوں کے لیے عرضی لگانے کے دن سے لے کر یہاں پہنچنے کے دن تک کی ساری بے تابی پر کیسے اپنے ہی خول میں سے بار بار نمودار ہوتی، روئیں روئیں میں چھا جاتی رہیں صوبیدارنی۔ بازار نکلتے تو کیسے سامنے موجود دھوتی سی خود ہی دھیان دلاتی رہتیں پگ پگ پر، کہ ان کے لیے کیا کیا چیزیں لینی ہیں اور کون سی بچوں اور بابو کے لیے۔ جانے کب، کہاں سے اچانک سائے کی طرح نمودار ہونا اور سارا دھیان اپنی جانب کھینچ لینا بس گاؤں پہنچ کر ہی تھما ہے۔ پاؤں چھوتے ہی مٹی کے گھڑے کی طرح پھوٹ پڑنا اور سارا پانی صوبیدار پر انڈیل دینا کیا تھا صوبیدارنی نے، تب کہیں خود کے پورنا نگ 9 ہونے کی سی تسکین ہوئی تھی۔

کل اور بھی کیا ہوا تھا۔ اُدھر بابو 'دیوی جاگرن' میں ہیں اور اِدھر صوبیدارنی کے ساتھ ایک ایک دن بائیسکوپ کی تصویروں کی طرح آنکھوں کے سامنے ہوا جا رہا ہے کہ کون سا صوبیدارنی کے ساتھ کتنا بیتا اور کتنا کھیتوں، کتنا جنگل اور ندی باؤلی میں۔ کتنا ایک بغل صوبیدارنی ہے اور ایک بغل بھیموا یا رَموا۔ صوبیدار کہہ رہے ہیں، ''بھیموا کی اماں!'' صوبیدارنی ''رَموا کے بابو!'' اور یہ کہ ''اِیجا کی جگہ 'اماں' کیوں کہنے لگے ہو؟''

صوبیدار ایکا ایک اپنی فوجی انگریزی ٹھونکنے دے رہے ہیں: ''ایوری ڈے اینڈ ایوری نائٹ، مائی ڈیر صوبیدارنی، یُو واز آن مائی ڈریم!'' اور صوبیدارنی پولیسٹر کی نئی ساڑھی کا سرا منھ میں دبائے جا رہی ہیں۔ ''آگ لگے تمھاری اس لال منھ والے بندروں جیسی بولی کو!''

انگریزی کا اے بی سی نہیں جانتی ہیں، لیکن انگریزوں کا رنگ گلابی ہوتا ہے اتنا انھیں پتا ہے۔ صوبیدار سمجھا دیتے ہیں کہ ''اتنا تو مائی ڈیر، بالکل کریکٹ پکڑ لیا آپ نے کہ لال منھ والے انگریزوں کی لینگویج ہے۔''

راتوں کو کافی ٹھنڈ ہے اور چھوٹے رَموا نے سوئے سوئے ہی چھوٹی حاجت پوری کر لی ہے تو صوبیدارنی مذاق کر رہی ہیں: ''وہاں فوج میں بھی ایسا کر دیتے ہو کیا؟'' صوبیدار بدلے میں کچھ اور گہرا مذاق کرنے کی سوچ ہی رہے ہیں کہ صوبیدارنی کی آنکھیں ایکا ایک بھیگ جاتی ہیں۔ ''میرے لیے رموا

---

9 پورنا نگ: ''پورن'' (مکمل) اور ''انگ'' (جسم)۔

Scanned with CamScanner

اور تم میں کیا فرق ہوا!''

اس لیے کہنے اور ماننے کو جی کرتا ہے کہ دیوی میا تُو نہیں تو کون ہے! دو تین سال بلی کے بکرے کی طرح ٹنگا رہنا ہوتا ہے وہاں۔ اور کون ہے وہاں جس سے بات کرتے ہوئے اپنے اونچے اونچے پربت کی چوٹیوں پر براجمان ہونے اور ساتھ ہی کسی کے اپنے میں سے ہی جھرنے کی طرح پھوٹنے یا نیچے ندی کی طرح بہہ رہے ہونے کا احساس ہو؟ جہاں سر کے اوپر جانے سر سے کتنے کپتان، کرنیل، جرنیل لدے رہتے ہیں وہاں صوبیدار کی اوقات کیا ہوتی ہے۔ لیکن یہاں — اور یاد کی مانو تو وہاں بھی — ایک تیر الس ہوتا ہے کہ بدن میں ونس پتیاں سی پھوٹ پڑتی ہیں۔

ہاٹ کی کالکا میا کے دربار میں جانے کا دن سر پر آرہا ہے اور اس کے بعد ہی سامنے ہوگی — وداع ہونے کی گھڑی۔ صوبیدارنی کے ساتھ بیتے ایک ایک دن کو گھپ اندھیرے میں بکھیر دینے کو جی کرتا ہے اور ٹارچ ہاتھ میں لے کر ڈھونڈنے کو۔ آج بھی صوبیدارنی ابھی ابھی، روز کی طرح، صبح کے تارے کو گود میں لے کر دودھ پلانے کو بے تاب، چھاتی پر پاؤں رکھتی سی نکل گئی ہیں، لیکن جھانجھروں کی آواز ابھی بھی شہد کی مکھیوں کا سا چھتا ڈالے ہوئے ہے۔

''چہا (چائے) تیار ہے، بابو!'' کہتا ہوا بھیموا دہلیز پر کھڑا دکھائی دیا تب لگا کہ صبح ہوگئی ہوگی۔ آج کا دن بیچ میں ہے، کل ہی ہاٹ کی یاترا پر جانا ہے۔ صوبیدارنی کل کہہ رہی تھیں کہ ''ہے ہو، رموا کے بابو، تم کہہ رہے تھے کہ اس بار بانج کی پالیوں کیسی ہو رہی ہے!''

جنگل گاؤں کے شمالی کونے میں ہے۔ ایک سلسلہ سا ہے جو سات آٹھ گاؤں کے سرہانے کی ٹھوس گھنی ہریالی کی طرح، آر سے پار تک چلا گیا ہے۔ نیچے نیچے تک کئی بار ہو آئے ہیں صوبیدار، لیکن چونکہ شکار کھیلنے کو منع کر دیتی رہی ہیں صوبیدارنی کہ ''ہے ہو، یہ اپنی جھڑام بھڑام وہاں اپنی ملیٹری میں ہی کیا کرو۔ ہم کو نہیں لگتی اچھی ہتیا...'' اس لیے صوبیدار بھی بس رائفل کو کندھے پر سیر کروا کے لوٹ آتے رہے ہیں۔ لیکن دو دو تنتناتے بکرے ہاٹ کی کالکا کے مندر میں کاٹے جانے ہیں، ایک بھیموا کی بدھائی کا مانا ہوا ہے دوسرا رموا کی — دیوی میا نہیں کہتی ہوگی کہ ہمیں نہیں اچھی لگتی ہتیا؟ خیر، وہ کیا ہے کہ بابو 'دیوی جاگرن' میں کیسے بتاتے ہیں کہ ایک ہاتھ میں کھڑگ لیا دوسرے میں کرپان، ایک میں شنکھ لیا

Scanned with CamScanner

دوسرے میں چکر، ایک میں ترشول لیا اور دوسرے میں گدا، ایک ہاتھ میں... سولہ ہاتھوں میں میّا کالکا نے ہتھیار اٹھائے اور دو ہاتھوں میں کھپّر...

اس سے زیادہ دور تک دماغ جا نہیں پاتا ہے، کیونکہ یہ تو جب تک دو ہاتھوں والی ہے تب تک ہماری پہنچ میں ہے— آگے کا روپ رشیوں منیوں کے گیان کی چیز ہوئی۔

•

چائے پینے کو باہر آنگن میں نکل آئے صوبیدار، تو اب تک سارا مایا لوک جیسے کمرے میں ہی چھوٹ گیا۔ اندر دل کا پھیلاؤ تھا، باہر فطرت موجود ہے۔ گاؤں کی باکھلیوں [۱۰] کے نیچے گھاٹی میں، ندی کے کنارے تک کھیتوں کا سلسلہ چلا گیا ہے۔ لگتا ہے، صبح صبح، خاص طور پر سردیوں کی رُت میں، ندی میں اشنان کر کے، کوئی سیڑھیوں پر پاؤں رکھتی سی، وہ اوپر جنگل میں نکل گئی۔ دو چار دن گھٹ [۱۱] کی طرف نکل گئے تھے تو صوبیدارنی کپڑے دھوتی رہی تھیں اور وہ دیکھتے رہے، تالاب میں مچھلیوں کا کھیل— جیون کا کھیل جل تھل ہر جگہ ایک ہے۔

آج کل گیہوں کھیتوں میں انّ پراشنی [۱۲] کے بعد کے بچوں جتنا سیانا ہو آیا ہے، گھٹنوں کے بل کھڑا ہونے کی کوشش کرتا ہوا سا، لیکن ابھی کہرے میں دھوتی کے پلّے کے نیچے دبکا پڑا سا چھپا ہوا ہے۔ کہیں آٹھ نو بجے تک کہرا ٹھیک سے چھٹ پائے گا۔ ابھی تو بھومیا دیوتا کے کمرے نیچے کے کپڑے کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ گاؤں بھی تو کتنا چھوٹا ہے یہ— پہاڑ کا بچہ معلوم دیتا ہے۔

دس بجے تک سب کو کھلا پلا کر صوبیدارنی نے سیڑھی کے پتھر پر درانتی کو دھار لگانا شروع کیا تو صوبیدار بھی وردی میں ہو لیے۔ کھونٹی پر سے اتار کر رائفل کندھے پر رکھی۔ ہوائی بیگ میں ٹیپ ریکارڈر، کیمرا اور سگریٹ کا ڈبا رکھا اور چل پڑے۔

آنگن سے لے کر جنگل کی طرف والی پگڈنڈی میں شناساؤں برادری والوں سے 'رام رام'، 'پائے لاگوں'، 'جیتے رہو' نبٹاتے ہوئے مکمل تنہائی پاتے ہی سگریٹ کا ایک زوروں کا کش لیا۔ پھر تھوڑا رک کر، پیچھے پیچھے آتی صوبیدارنی کو برابری پر روکتے ہوئے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "آج آپ کو بہت

[۱۰] باکھلی: مکانوں کی قطار۔ [۱۱] گھٹ: پون چکی۔ [۱۲] انّ پراشنی: بچے کو پہلی بار اناج کھلانے کی رسم

جی جان سے گا کر سنا دینی ہے 'نیولی'، مائی ڈیر! گھر میں اور کھیتوں میں 'وائس' دبوا دی تھی آپ نے۔ اب تو چلا چلی کا وقت ہے۔ کل پوجا ہو جانی ہے۔ بس دو چار دن اور یا سا ماہیے۔ پھر وہی، آفٹر مَیتھم ٹو آر تھری ایرس والی بات گئی۔ آپ اُس 'نیولی' کو ضرور گانا آج اپنے فل 'بھالیوم' میں — کاٹتے کاٹتے پھر پھیلتا جاتا ہے بانج کا جنگل — دی فاریسٹ آف مریکلس!''

صو بیدارنی کچھ نہیں بولیں، قدرت کی طرح خاموش رہیں۔ لگ بھگ ایک میل کے بعد جنگل کا پورا دائرہ ہریالیوں سے بھری جھیل ہو گیا۔ دور دور گائے بکریاں چرتی دکھائی دے رہی تھیں اور کچھ عورتیں، بانج پھلیانٹ کے ملائم پتے بٹورتی۔ صو بیدارنی کو اتنی جھجک تو تھی کہ پہلے پہلے ساتھ جانے والی عورتیں، جہاں اور جب آمنا سامنا ہو گا، مذاق ضرور اڑائیں گی؛ لیکن اُن کا سنگ تو سدا کا ہے، صو بیدار کا کہاں۔ یہ تو پھول کی طرح کھلے اور وہ بھی دو تین برسوں میں ایک بار۔ ایک آدھ مہینہ اپنے سنگ سنگ میں ہمیں بھی کھلائے رہے اور پھر اچانک ایک دن، آنکھ اوجھل۔

اب جنگل تو ریشہ ریشہ جانا ہوا ہے۔ تنہائی ڈھونڈنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ صو بیدار بچے کی طرح ضد پکڑ گئے کہ پالیوں کٹے نہ کٹے، 'نیولی' پہلے نبٹانی ہے۔ چورس جگہ ٹوہ کر، صو بیدارنی اپنے نئے رنگین گھاگھرے کو ٹھیک سے پھیلاتی، بیٹھ گئیں۔ ہری کریپ کے گھاگھرے میں لال رنگ کی گوٹ ہے۔ کمر میں دھوتی کا پیتامبری [۱۴۳] پھینٹا ہے۔ وٹھاں [۱۴۴] پورے ماتھے پر ایسے ہے جیسے پیٹ سے ہی ساتھ ہو۔ ناک میں چندکوں والی تین تولے کی، بائیں کان کے پاس تک کی جگہ گھیرتی نتھ ہے، کانوں میں سونے کی مُدرکائیں۔ گلے میں موتی مالا، کالا چریوا اور گلوبند ہے۔ ہاتھوں میں پہنچیاں اور پیروں میں جھانجھر۔ پورے گہنے پہنے ہیں آج نینا صو بیدار کی فرمائش پر۔ ایک ہاتھ میں درانتی ہے دوسرے میں ابھی تک بانج پھلیانٹ کے ملائم پتے رکھنے کا جال تھا، اب اس میں رنگ برنگے پھولوں والا گھمیلا ہے۔ کیا روپ ہے! کیا رنگ ہے!

صو بیدار ایکا ایک اٹھے اپنی جگہ سے، صو بیدارنی صاحبہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ''او نیے!'' کہا اور جنگلی ہرن ہوتے ہوئے، قلانچ بھرتے سے، کچھ فاصلے پر ہو گئے۔ کبھی کہیں، مائی ڈیر، ذرا سا دائیں!، کبھی بائیں!، کبھی مسکراؤ!، کبھی کھلکھلاؤ! اور کبھی 'نیولی' گانے کے، پھر کبھی جنگل میں کسی کھوئے ہوئے کو

---

[۱۴۳] پیتامبری: زرد۔ [۱۴۴] وٹھاں: ٹیکا۔

ڈھونڈنے کے سے انداز میں ہو جاؤ — صوبیدارنی صاحبہ کو بھی جانے کیا ہوا کہ جیسا کہا تیسی ہو گئیں۔ بیچ میں صرف اتنا ہی بولیں، ''دیکھو، جیسے تمھارا من چاہتا ہے تیسا کرلو۔ مگر اِس وقت کے فوٹو ملیٹری میں چاہے اپنے دوستوں دوستانیوں کو دکھاتے پھرنا، یہاں رموا کے بوبو (دادا) اور دوسرے لوگوں کی نظر میں نہیں پڑنے چاہئیں — بہت مذاق اڑائیں گے لوگ۔ کہیں گے، گھر میں جگہ نہیں ملی...''

صوبیدارنی صاحبہ کا کھلکھلانا، ہلانس پنچھی کے چاند کی شکل کے جھنڈ سا اُڑتا ہوا، جانے ہمالیہ کی چوٹیوں تک کہاں کہاں چلا گیا۔ سارا جنگل ڈوب گیا۔ نیناصوبیدار کے منھ سے اتنا ہی نکلا، ''ہم کو تو آپ ہی دیوی ہیں۔''

صوبیدارنی کی ساری جھجھک پت جھڑ کے وقت کے پتوں سی جھڑتی اور بسنت رُت کے ملائم پتوں سی اُگتی چلی گئی۔ کہاں فوٹو میں گاتا دکھائی پڑنے بھر کو 'نیولی' شروع کی تھی، کہاں ایک لڑی سی بندھتی چلی گئی:

کاٹتے کاٹتے پھر پلاؤ رِت ہو آتا ہے
بانج کا بن
سمندر بھر جاتا ہے، میرے پران،
نہیں بھرتا من!
اَشوِن ماس کی ندی چمکتی ہے
اسیلا مچھلی...

اب جاتے ہو
کون جانتا ہے، پھر کب ہو گی بھینٹ!
وہ دیکھو، اُدھر ہمالیہ کی دَرونیوں میں
کیسی چادر سی بچھ گئی ہے برف...
پنچھی ہوتی مَیں، میرے پران،
اڑتی، بس اڑتی ہی چلی جاتی
تمھاری دِشا میں!

Scanned with CamScanner

ٹیپ کی گئی 'نیولیوں' کو خود صو بیدارنی نے سنا تو پہلے مست ہوئیں اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں۔ کل رات سے اب تک میں اکٹھا کیا ہوا سارا سکھ جیسے اپنے سارے غلاف اتارتا ہوا، ایک ساتھ ظاہر ہو گیا۔

لوٹتے لوٹتے جاڑوں کا دن اور چھوٹا ہو گیا۔ صو بیدارنی کے پاؤں بھاری ہو گئے ہیں۔ ایک گٹھر سر پر لدا ہے بانج پھلیانٹ کے پتوں کا، ایک اندر اکٹھا ہے۔ پالیوں اتارنے اور جال بھر لینے کے بعد کے آرام میں سر صو بیدارنی صاحب کی گود میں تھا اور جوں ڈھونڈنے کی مصروفیت میں ان کے انگوٹھوں کے ناخن آپس میں جڑتے تھے تو لگتا تھا، آواز میلوں دور تک جا رہی ہو گی۔ تب یاد آیا تھا اچانک، پھر وہی کھیما کے ساتھ کے ٹرک کے سفر میں ایکا ایک ظاہر ہو کر، سفر ختم ہونے تک لگاتار موجود رہا موت کا خوف اسکھ اکیلے کہاں آتا ہے۔

رات کے سناٹے میں، نیچے گھاٹی کی سمت سے سیاروں کا جھنڈ آتا ہے، اور یاد آتا ہے صو بیدارنی کا آنچل ہونٹوں میں دبا کر یہ بتانا کہ اسی سال جولائی میں گاؤں کے تین گھروں میں تار آئے۔ سنا، اُدھر امرتسر میں کوئی لڑائی ہوگئی... ایک سایہ فوجیوں کے گھر منڈلاتا پھرتا رہا ہے مہینے بھر۔

کسی بھی دن ہو سکتا ہے ان ہوے کا ہو جانا۔ فوجی گزرتا ہے تو صرف تار ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ شکل، صورت — اسی میں سب کچھ دیکھ لو۔ اچھا ہی ہے کہ جیون کا انت جب بھی ہو صو بیدارنی صاحبہ سے کہیں بہت دور ہو۔ ہاٹ کی کالکا کے مندر میں دیودار کے جڑواں پیڑ ہیں، سینکڑوں برس پرانے۔ جانا کل ہے — پیڑ آج ہی کیوں یاد آ پڑے؟ دونوں کو دیکھو تو ایک میں سے ہی دو کیے ہوئے سے دکھائی پڑتے ہیں۔ لگ بھگ برابر اونچے، بادلوں کو چھونے کو بڑھتے ہوئے سے۔ برابر سر سبز۔ دھوپ چھتری پر ہی اٹک جاتی ہے، نیچے کیسی گہری چھاؤں۔ ان میں ایک کو کاٹ دیجیے تو دوسرا سر دُھنتا دکھائی پڑے گا۔ ماتا، تو ہی رکھشا کرنا!

صو بیدارنی دیوی کا چولا سی چکی ہیں۔ چڑھاوے کے دوسرے سامان کے ساتھ دونوں گھنٹے بھی ایک کونے میں رکھ دیے گئے ہیں۔ بھیمو اور رامو، لاکھ منع کرتے بھی، کبھی کبھی بجا دیتے ہیں تو گھنٹے کی گولائی میں کھدے حروف ان کا نام پکارتے معلوم دیتے ہیں — شری بھیم سنگھ ولد ٹھاکر شری نین سنگھ ولد شریمان ٹھاکر اندر سنگھ ساکن جھلی گیر، شری رام سنگھ ولد ٹھاکر شری نین سنگھ ولد شریمان...

ہر بار اِن چھٹیوں بھر کا جشن ہے۔ دونوں چھوکروں پر اس بار میّا کی کالِکا کے دربار میں بدھائیاں جاتی ہیں تو بھی رنگ سب سے اوپر ہے۔ بچے اپنے دادا کی نقل میں 'دیوی جاگرن' لگاتے ہیں۔ بھیموا نے کیا کہا تھا کہ اگر کوئی بہن ہوتی تو اس میں دیوی کا اوتار کراتے؟

صوبیدارنی صاحبہ کی صورت کا عکس اور اثر بھی کس میں پائے گا؟ آدھی تخلیق اسی طرف ہے، آدھی اس سے باہر۔

گھر تو گھر ہے۔ اوپر دو منزلے میں گزرتے جیون میں نیچے گوٹھ [۱۵] کے جانوروں تک کا ساجھا جان پڑتا ہے۔ کچھ ہی دن کو آئے ہیں، تب بھی بھینس دوہنے، نہلانے، اُدھر دھار [۱۶] میں کے پیڑوں پر استوپ کی طرح چنی گئی گھاس کی پلّیوں کو اتروانے اور لکڑی پھاڑنے تک قسم قسم کے چھوٹے موٹے گھریلو کام ہیں۔ یہاں آکر سمجھ میں آتا ہے کہ ایک صوبیدارنی کے سر پر کتنے کام ہیں۔ بھائی کوئی سنگ آیا نہیں، بہنیں تھیں، ایک آسام میں کہیں ہے اپنے خاندان کے ساتھ، دوسری چار دنوں کو آئی، بنکھری والی دیدی، ہوا کے ساتھ ساتھ لوٹ گئی۔ سب کے اپنے اپنے کاروبار ہیں۔

کہو کہ بڈھے جی ابھی بھی چھوٹے موٹے کئی کام نبٹا لیتے ہیں۔ اس بار یہی تو سمجھا رہے تھے کہ آدھی پنشن پر بھی چلے آؤ۔ صوبیدارنی بھی یہی چاہتی ہیں، مگر ابھی اور چار پانچ سال کھینچ لینا ہی ٹھیک ہے۔ فوج کے رہے کو پھر یہاں کون سی نوکری دکانداری کرنی۔ پوری پنشن لے کر گھر بیٹھنا۔ یہی کھیتی باڑی سنبھالنی ہے اور بچوں کو آگے بڑھانا ہے۔

سوچتے جاؤ تو جیون کی دلیلیں پیٹھ پر سوار ہو جاتی ہیں۔ صوبیدارنی سے کچھ چھپا نہیں رہتا۔ کبھی اڑوس پڑوس گھومنے میں لگا دیتی ہیں، کبھی نمکین اور پیاز سامنے لگا دیتی ہیں۔ کھانے پینے کی چیزوں میں کچھ چھوٹ نہ جائے۔ دو چار دن گھریلو کھانوں کا مزہ۔ کبھی بھٹ مدرا کا جولا اور لہسن، ہری دھنیا کا نمک ہے، کبھی چوماس سے رکھی کرڑی لکڑی کا رائتہ، گڑیری کا بھنگ پڑا رس دار ساگ اور پوریاں، کبھی مٹھی بھر لہسن پڑی اور گھی میں جمبو سے بگھاری مسور کی دال ہے، ہری پالک لاہی کا ٹپکیا اور تازے تازے او کھلی کُٹے گھر کے چاولوں کا بھات۔

کبھی گھر میں ہی بکرا کٹ گیا۔ سان سون بھٹوے سے لے کر سری گڈیوں کا شوربہ! گھر میں نہ

[۱۵] گوٹھ: مکان کی نچلی منزل جہاں جانور رکھے جاتے ہیں۔ [۱۶] دھار: پہاڑ کی ڈھلان۔

ہوا، کبھی پاس پڑوس سے آگیا شکار۔ کبھی شہر میں کھانے پینے، گھومنے پھرنے، ہر چیز کی بہار۔۔ یہی سب دھوپ چھاؤں ٹھہری آدمی کے جیون میں، باقی کیا رکھا ٹھہرا۔ کیلاش کا دیوتا بھی آدمی کے آنگن میں اترا تو اسے بھی آخر آخر ناچ کود کے چل ہی دینا ہوا۔ بابو بڑے ہوشیار ہوے۔ کتنی کہاوتیں ہوئیں ان کے پاس۔ کبھی ترنگ میں ہوے تو پوتوں کے ساتھ ساتھ بہو کو بھی بٹھالیا۔ باپ بیٹے، دونوں کے سامنے رم کے پیگ ہوے۔ بابو کبھی 'او میرے رنگیلے جھوما جھومی ناچ' کی مستی میں، تو کبھی 'سدا نہ پھولے توری، سدا نہ ساون ہوئے' کے بیراگ میں۔

بعد کے دن تو بھاری ہوتے گئے۔ ہاٹ کے دیوی مندر سے لایا گیا لال کپڑا آنگن کنارے کے خوبانی کے پیڑ کی ٹہنی میں بندھا ہوا ہے لیکن نینا صوبیدار دیکھتے ہیں تو ریل گاڑی کے گارڈ کے ہاتھ میں تھمی ہری جھنڈی معلوم دیتا ہے۔ ہوا میں ہلتا ہے تو ''چلو، چل پڑو!'' کہتا سنائی پڑتا رہا ہے۔ اور اس وقت حال یہ ہے کہ سارا سامان بندھا پڑا ہے لیکن قلی ابھی تک کہیں نہیں دکھائی پڑا۔ کل شہر اسکول جانے والے بچے سے کہلوا بھیجا تھا کہ کسی مزدور کو بھجوادے ہمالیہ ہوٹل کا بچی سنگھ، مگر کہیں کوئی نشان ہی نہیں ہے۔

گاؤں کا حال یہ ہے کہ قلی کا کام پی ڈبلیو ڈی یا جنگلات کے ٹھیکوں پر کرنے والے بہت ہیں، لیکن برادروں کا بوجھ اٹھانا گناہ ہے۔ مایا موہ میں رہ بھی گئے آخری گنجائش تک۔ اب اگر کل صبح تک ٹنک پور ہی نہیں پہنچ پائے تو انبالہ چھاونی کہاں وقت پر پہنچنا ہو پائے گا۔ کئی بار جی میں آتا ہے کہ خود ہی لادیں اور چل پڑیں—— واپسی کا سامان ہے، بہت بھاری نہیں—— مگر جو دیکھے گا سو ہی ہنسے گا۔ ساری صوبیدار صاحبی مٹی مین مل جائے گی۔

صوبیدار بار بار سگریٹ سلگا رہے تھے اور بار بار گھڑی پر آنکھیں جاتی تھیں۔ بابو بوڑھے اور کمزور ہیں۔ بچے کچے۔ ڈیڑھ دو گھنٹے سے کم کا راستہ نہیں بس اڈے تک کا، اور دوپہر بعد تو آخری بس کیا، ٹرک ملنا بھی کٹھن ہوجائے گا۔ نینا صوبیدار ابھی مایوس اور بے چینی میں ہی ڈوبے تھے کہ دیکھا، صوبیدارنی بابو سے کچھ کہتی نزدیک پہنچی ہیں اور جب تک میں وہ ٹھیک سے سمجھیں، سوٹ کیس اٹھا کر سر پر رکھ لیا اور کہہ رہی ہیں کہ ''ہولڈال اس کے اوپر رکھ دو۔''

صوبیدارنی کے کہنے میں کچھ ایسی مضبوطی تھی اور صورت حال کا ایسا دباؤ کہ صوبیدار کو پاؤں سے

سر تک ایک جھر جھری سی تو ضرور ہوئی مگر اس دلیل کا کوئی جواب نہیں سوجھا کہ ''منھ تاکتے تو دن نکل جائے گا، تھوڑی دور تک تو چلے چلتے ہیں، راستے میں قلی جہاں بھی مل جائے گا...''

نئی بات اس میں کچھ نہیں۔ چھٹی پر آتے قلی ساتھ آتا ہے، واپسی میں گھر کے لوگ پہنچا دیتے ہیں۔ سپاہی لانس نائیک تک تو خود اپنا سامان نہیں اٹھاتے، حولدار صوبیدار کی تو ناک ہی کٹی سمجھیے۔

گاؤں کی سرحد کے ختم ہوتے ہوتے دل کافی کچھ جگہ پر آ گیا۔ بابو اور بچوں کی شبیہیں دھندلی پڑتی گئیں۔ گائے بھینس بکریوں تک کی یاد کچھ دور تک ساتھ چلتی آتی ہے۔ سرحد تک تو کھیت بھی ساتھ چلتے معلوم پڑتے ہیں۔ دروازے کے اوپر چپکایا گیا دسہرے کا چھاپا بھی۔ دسہرے کے ہریلے کے دن ساون کے رکشا بندھن کی سیج کر رکھی رکشا باندھتے اور ہریلا سر پر رکھتے ہوئے کیا کہا تھا، ٹھیک ماں کی طرح ___ ''جیتے رہنا، جاگتے رہنا، یوں ہی بار بار ملتے رہنا۔ سیار کی سی بدھی ہو، شیر کا سا بل! بالکوں کا ساہٹ ہو، جوگیوں کا سا گیان!''

رکشا کا منتر تو خود صوبیدار کو بھی یاد ٹھہرا ___ ییَن بدّھو بلی راجہ، دان وِیندرو مہابلا... یہ دھاگے ایسے ہی ہوئے۔ دان ویندرو[17] سے بھی نہیں توڑے جا سکے، ہم نر بندر کس گنتی میں! ماں جب تک رہی ٹھیک یہیں اس گدھیرے[18] تک آتی رہیں چھوڑنے۔ یہیں روک کر صاف شفاف گنگا جل انجلی میں بھر لاتی تھیں اور صوبیدار کے ماتھے پر چھڑکتی ہوئی بانہوں میں باندھ لیتی تھیں۔ دھاگوں کا ایک پرانا جال ہوا۔ گھر پہنچو تو اورشیہ[19] ہو جانے والا ٹھہرا۔ واپس لوٹتے میں لوہے کے تاروں کا گڑنا، یہ سب جیون کا عام بہاؤ ہوا۔ کس نے پار پایا، کون پا سکے گا۔ مکھ سار کی رُت میں، بیل کھلے ہیں، جُتائی کے وقت کہاں۔ ایک کے بعد دوسرا سگریٹ جلاتے ہوئے یہی گانے کو جی کر رہا تھا کہ 'چل اڑ جا رے پنچھی...ی...ی...ی...'

ٹیپ ریکارڈر، کیمرا ہوائی بیگ میں ہے۔ اس کے علاوہ ٹفن بھی صوبیدار کے ہاتھ میں۔ رُول کبھی کبھی ان ہی سے ٹکرا کر بج اٹھتا ہے۔ سوٹ کیس اور سفاری ہولڈال صوبیدارنی صاحبہ کے سر پر ہے۔ یوں تو بہت سوں کا یہی سلسلہ ہے ___ حولدار صاحب ٹرانزسٹر لٹکائے، رُول ہلاتے، گھڑی بار بار دیکھتے آگے آگے چل رہے ہیں اور پیچھے پیچھے گھر والی، سامان سر پر لادے ہوئے۔ مگر نینا صوبیدار کے ساتھ یہ پہلا موقع ہے۔ کبھی بھی اپنے سے دو انگل کم کر کے تو دیکھا ہی نہیں صوبیدارنی کو۔

---

[17] دان ویندرو: راکھشسوں کا راجہ۔ [18] گدھیرا: نالہ۔ [19] اورشیہ: دکھائی نہ دینے والا۔

ایکا ایک بولے، ''صوبیدارنی! آپ ذرا رکیے۔ یہ بیگ اور ٹفن آپ پکڑ لیجیے اب۔ تھوڑی دور تک اٹیچی ہولڈال میں لے چلتا ہوں...''

صوبیدارنی پیچھے کو مڑیں، ہولے سے مسکرائیں، تیزی سے آگے بڑھ گئیں، جیسے خوشبو پھیلاتی جاتی ہوں اپنی۔ بولتی گئیں، ''میرا تو یہ روز کا کام ہوا، رموا کے بابو! بیکار کی الجھن میں پڑ رہے ہو۔ کھیتوں میں 'پرسا' نہیں ڈھوتی کہ گھاس اناج کے گٹھر نہیں؟ اُس دن بھی تمھارے پیچھے پیچھے پالیوں کا جال لیے چل رہی تھی...''

''وہ گھر کا، روزداری کام ہوا... مگر یہ تو...''

''ایک طرح کی قلی گیری ہوئی،'' کو صوبیدار نے اپنے اندر ہی چھپالیا۔

''آج بات کرنے میں تم 'مائی ڈیر'، مائی ڈیر' نہیں کرر ہے ہو۔ اتنا اداس پڑ جانا بھی کیا ٹھہرا!''

اب صوبیدار کیسے بتائیں کہ آگ تو بیت گئی، راکھ رہ گئی۔ یہاں سے وہاں تک ایک بجھا بجھا پن چھایا پڑا ہے۔

''عزت تو اندر کا احساس ہوا۔ ہم نگوڑی 'تم تم' ہی تمرّاتی رہیں زندگی بھر۔ تم سے 'آپ آپ' سے نیچے نہیں اترا گیا۔ درگا ساس کہہ رہی تھیں، گھر والی کو عزت دینا کوئی اس کے صوبیدار سے سیکھے۔ تم جب وہاں رات دن ہم لوگوں کی چنتا میں گھلتے رہنے والے ہوے، تب کچھ نہیں؟ ایک دن کو تمھارا بوجھ ہمارے سر پر آ گیا تو کیا پربت آ ٹھہرا؟ سر کے تاج تو آخر تم ہی ہوے...''

صوبیدار کو لگا کہ صوبیدارنی کا بولنا پھر کانوں تک آتا چلا گیا اور صوبیدار کو لگا جیسے قلم سے جسم پر لکھے دے رہی ہے کہ اگلی چھٹیوں میں کیا کیا لیتے آنا ہے۔

پھر یاد میں لمس ابھرتے ہی گئے کہ گاؤں پہنچنے کے دن ایک ایک چیز کو کیسے ہزار آنکھوں سے دیکھتی سی مست ہو جاتی تھی صوبیدارنی۔ سنتھال صابن کی بٹی کو جب انھوں نے سونگھا تب اس سے خوشبو پھوٹنی شروع ہوئی تھی۔ لوبھ نہیں ہے، بس لائے ہوے کو مان دینا ہے۔ اِس وقت ''یہ مت بھولنا، یہ ضرور لیتے آنا،'' کی ساری رٹ صرف صوبیدار کا جوش اور فخر بڑھا دینے کے لیے ہے۔

گاؤں سے شہر تک کی اس سڑک پر یہ کوئی پہلی بار کا چلنا تو نہیں۔ ابھی چھٹیوں میں دو بار آ چکے

Scanned with CamScanner

ہیں۔ایک بار شہر گھوما، کچھ خریداری کی، میٹنی شو دیکھا، واپس لوٹ گئے۔دوسری بار میلہ گھومے، نائٹ شو دیکھا اور ہمالیہ ہوٹل میں ہی ٹھہر گئے — ہاں، صورت حال بدل گئی ہے تو سڑک بھی پاؤں تھامے لے رہی ہے۔

پتھوراگڑھ، جھولا دھار والی بڑی سڑک اب تھوڑے ہی فاصلے پر ہے۔اس گاؤں والی سڑک کے دونوں طرف پتھروں کی چنائی ہوئی ہے۔ہموار نہیں، اوبڑ کھابڑ ہے۔بوٹوں کی آواز کونوں کو چھوتی معلوم پڑتی ہے۔نظر نیچی چلی جائے تو کھیتوں میں گھاس بینتی عورتیں یا اِنارے کنارے کی زمین پر چرتے مویشی دکھائی پڑ جاتے ہیں۔اوپر آسمان کی طرف دیکھو، یہی سب پنچھی بن کر اڑتے سے جان پڑتے ہیں۔جہاں تک یہ گاؤں والی کچی سڑک جاتی ہے، سب ایک ہے۔پکی ڈامر والی سڑک آتے ہی الگ ہو گئے ہونے کا احساس ہوتا ہے۔

دور کھڑا ابھراڑی کا جنگل ''یاد رکھنا، بھولنا مت!'' پکارتا سا آگے کو آ رہا ہے اور قدرت صوبیدارنی ہی کی طرح گھاگھرا پھیلائے بیٹھی معلوم پڑتی ہے۔مسئیولے زیادہ لمبے نہیں اڑتے۔صرف ایک سے دوسری جھاڑی تک پھدکتے ہیں اور چیں چیں مچائے رہتے ہیں۔یاد آتا ہے کہ اس بار لڑکی کی آرزو اتنی کیوں رہی ہوگی تو وہاں انبالہ چھاؤنی کے ساتھ کے ایک فوجی افسر کے یہاں آنکھوں میں چھا گئی چھوٹی سی بچی کی شکل یادداشت میں ابھرتی آتی ہے۔یاد آتا ہے اس کا ''انکل، انکل'' کہنا اور کندھے پر چڑھنے کی ضد کرنا۔اور یہ کہ بابو کے بڑھاپے اور گھر۔کے ویران پڑ جانے کے ڈر سے خاندان کو ساتھ رکھنے کا موقع نہیں۔

کل یوں ہی پوچھ لیا کہ صوبیدارنی، ساتھ چلوگی؟ جواب آیا کہ کس بار نہیں چلی ہے۔جب سایہ نہ رہے تو سمجھو کہ ساتھ نہیں، اور اس وقت ساتھ چل رہی ہے تو سائے سے زیادہ کہاں ہے۔

قدرت کی ہی طرح، صوبیدارنی بھی تو جوں جوں اوجھل توں توں نمودار ہوتی جاتی ہے۔ہر بار یہی ہوتا آیا ہے۔بس میں بیٹھتے ہی یادیں پنچھیوں کے جھنڈوں کی طرح نمودار ہو جاتی ہیں اندر۔کون دن، کون لمحہ، کیسا بیتا صوبیدارنی کے ساتھ، جنگل کی ہوا کی طرح بجنے لگتا ہے اندر۔یہاں سے کیمپ پہنچنے تک ندی کا سفر ہے۔

اچانک رکیں اور ''دومنٹ ٹھہرنا'' کہتے کہتے صوبیدارنی نے سر پر کا سامان دیوار پر رکھوا دیے کا

Scanned with CamScanner

اشارہ کیا۔صو بیدار کو لگا، چڑھائی چڑھتے تھک گئی ہیں۔ سامان ٹھیک سے رکھواتے کچھ کہنے کو ہوے کہ جھجک اور شرارت میں مسکراتی صو بیدارنی تیزی سے نیچے کھیتوں کی جانب اتر گئیں۔ جب تک وہ لوٹیں ،نینا صو بیدار کو اچانک ہی بھراڑی کے جنگل کی وہ جل دھارا یاد ہو آئی جس کے منبعے کو دیکھتے انھوں نے صو بیدارنی سے مذاق کیا تھا: ''وہ نہیں شرماتی...'' ''صو بیدارنی کیا بولیں،'' دھرتی تو ماتا ہوئی۔اسے سب ہی ایک سے ہوے۔''

شادی کے بعد کا ایک برسوں لمبا سلسلہ ہے جو صو بیدارنی کو سیانی کرتا چلا گیا۔ آنے کے سال سے اب تک میں کیا سے کیا ہو گئیں۔ بھراڑی کے جنگل سے پھوٹی پتلی سی جل دھارا، دور تک کیا جائیے، نیچے گھاٹی تک میں پون چکی کے پاٹ گھماتی ندی ہو گئی ہے۔ جانے کتنے سوتوں سے پانی اکٹھا ہوتا گیا۔

روکتے روکتے بھی پھر سامان اٹھالیا۔چل پڑنے سے پہلے بولیں،'' آپ جانے لگتے ہو تو جانے کیا ہوتا ہے۔ اندر اندر ٹھنڈی سی معلوم پڑتی ہے۔ اِس بار تو دور تک کا ساتھ ہوا۔پچھلی بار آنگن میں ہی کھڑی تھی۔آپ آنکھوں سے اوجھل ہوے کہ... تب بھی...''

جب تک میں نینا صو بیدار کچھ کہنے کی کوشش کریں، وہ چل پڑیں۔ دو قدم پیچھے چلتے صاف صاف دکھتی ہیں۔ سر کے بوجھ اور ناہموار راستے کی وجہ سے کمر دائیں بائیں لچکتی ہے تو سنہرا سا گورا رنگ نظر تھام لیتا ہے۔ پنڈلیوں پر سے گھاگھرے کا پاٹ اٹھتا ہے تو مچھلی کے پانی میں کروٹ مارتے ہونے کی سی جھلملں۔ جاتے وقت صو بیدارنی ہر بار ایسی ہو آتی ہیں کہ ندی کا چھوٹنا ہے۔سفر کرتے میں گھنٹوں بعد کہیں کوئی ندی آتی ہے راستے میں تو کیسے اس کی آب اوپر تک آتی معلوم پڑتی ہے۔ یہ گیلاپن کبھی نہیں چھوٹتا۔ باہر اوجھل ہوتے ہی اندر بہنے لگتا ہے۔

بالکل چپکے آستین سے آنکھیں پونچھیں تو بھی کچھ سرسراہٹ سی آتی سنائی پڑی۔ نینا صو بیدار نے جرسی کی جیب میں سے نکال کر چشمہ لگالیا۔صو بیدارنی چلی جا رہی تھیں، ان کا تیز چلنا ہاتھ میں بندھی گھڑی پر وزن ڈالتا معلوم پڑ رہا تھا۔ دونوں ہاتھ اوپر کو اٹھائے چل رہی ہیں تو عورت ہونا اپنی بھاشا بولتا سا سنائی پڑتا ہے۔ ندی میں نہا کر کنارے جائیے، کپڑے بدلیے، واپس لوٹ آئیے۔ تھوڑا یاد پر زور دینے کی کوشش کریے کہ ندی بہتے ہونے کی آواز، خاص طور پر پہاڑ میں، کتنی دور دور تک ساتھ آتی ہے۔

Scanned with CamScanner

بڑی سڑک تک پہنچنے سے پہلے ہی کچھ قلی کندھے پر رسے ڈالے، شہر کی طرف جاتے دکھائی دے گئے تو صوبیدار نے زور سے پکار لیا۔ وہ ٹھٹکے تو آنے کا اشارہ کیا۔ تب تک میں صوبیدارنی نے سامان سر سے اتار، دیوار پر رکھ دیا۔

ایک ایک روپے کے نوٹوں کی ایک نئی گڈی جرسی سے نکال کر صوبیدارنی کے ہاتھوں میں تھمائی نیناصوبیدار نے۔ کہا کچھ نہیں، ہاتھوں کو چند لمحے یوں ہی تھامے رہے۔ صوبیدارنی ہی ہنس پڑیں۔ ''اتنی زیادہ رقم دے رہے ہو مزدوری میں ___ اگلی بار بھی ہم ہی لائیں گے صاحب کا سامان۔''

صوبیدارنی ہنس رہی تھیں۔ ہاتھوں کو الگ کرنا مشکل ہو گیا۔ بیل لپٹی جان پڑتی ہے۔ ایکا ایک بھراڑی کے جنگل میں 'نیولی' گاتے وقت کا منظر چھا گیا۔ اندر کوئی پھوٹ سا پڑا___ ''چھوڑو یار، صوبیدار! سارا بوریا بستر بھول جاؤ یہیں سڑک پر۔ یوں ہی ہاتھ پھنسائے صوبیدارنی کو لے اڑو۔ کھیت، گھاٹی، جنگل، ندی... سب کو اُلانگھتے چلے جاؤ۔ جب تھک جاؤ، صوبیدارنی کی گود میں سر رکھے، آنچل اوپر اٹھا دو اور پڑے رہو۔''

اس برفانی چوٹی کے پاس کا جھرنا صاف دکھائی دیتا ہے۔ جھانکو تو اپنے عکس جھلکتے ہیں۔

قلی نے سامان لاد لیا تو صوبیدارنی نے پاؤں کو چھوا اور سر تک سما گئیں۔ ان کی انگلیوں کا چھونا، بوٹوں تک کے اندر ہی نہیں، یاد کی پوری دنیا میں پھیل گیا۔ کچھ سمجھ نہیں پائے کہ پاؤں پر جھکی صوبیدارنی کو ''جیتی رہو، جاگتی رہو'' کیسے کہیں۔ صوبیدارنی اب وداع لینے کو کھڑی ہوئیں تو ٹیکے کا نشان جیسے ایکا ایک ظاہر ہو گیا ماتھے پر۔ جانے کتنی گہری لکیریں ابھر آئیں۔ آنکھوں کے بیچ کی جگہ غائب ہو گئی۔ دونوں اوپر تک ڈبڈبا اٹھی تھیں اب۔ نیناصوبیدار کو لگا، پنچھی کی جون لینے سے پہلے اس جھیل کا پار کرنا کٹھن ہے۔ صوبیدار کو محسوس ہوا، پنکھ ہوئے ہوتے تو ایک ہی اڑان میں اوجھل ہو جاتے۔

اوپر پکی سڑک پر پہنچتے میں صوبیدار مڑے نہیں۔ گاؤں کی کچی سڑک کا مہانہ بڑی سڑک میں سما گیا تب پلٹ کر دیکھا۔

صوبیدارنی اسی طرف ٹکٹکی لگائے کھڑی ہیں۔ اوجھل ہوتے تو انھیں ہی دیکھنا ہے۔

❊❊

گیتانجلی شری

ہندی سے ترجمہ: زیبا علوی

پرائیویٹ لائف

باہر دنیا کا بے کار شور اٹھ رہا تھا اور بند کھڑکی کی درازوں سے کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ اس نے چاہا کہ وہ کھڑکی کھول دے۔ پھر بند چھوڑ دینا ہی بہتر جانا۔

انھوں نے وہ چپلیں اس کے منھ پر دے ماریں اور پاگلوں کی طرح چیخے: ''بتاؤ یہ کہاں سے آئیں؟''

چاچی سسک سسک کر رو رہی تھیں۔ اس کے دل پر چھائے گھنے کالے بادل کو جیسے کوئی چیز چھیڑ نہیں پا رہی تھی۔

''یہ کیوں بتائے گی؟ ہاں ابھی رستوگی کو بلاتا ہوں، وہ بتائیں گے۔ یہیں، اس کے سامنے۔ تب دیکھتے ہیں یہ کیسے گھورتی ہے۔''

رستوگی مکان مالک تھے۔ پانچ مہینے سے اندر اندر ہی بھرتے چلے گئے تھے، اب جب موقع ملا تو ٹوٹے بند کی طرح پھٹ پڑے۔

پانچ مہینے سے وہ بھی چھپا گئی تھی کہ اس نے برساتی کرائے پر لے لی ہے اور ہاسٹل چھوڑ دیا ہے۔ تنخواہ کا ایک چوتھائی کرائے میں اٹھ جاتا ہے، پر اسے وہ منظور تھا۔ اپنے گھر کی تمنا اب زیادہ ہی گہری ہو گئی تھی، جسے وہ اپنی پسند سے سجا سکے، جہاں وہ اپنے دوستوں کو بلا سکے... ایک بھری پُری زندگی جیے۔ برساتی کے کونے کونے میں اس نے اپنی شخصیت کی چھاپ لگائی تھی۔ خود ڈزائن کیے

ہوئے کین کے فرنیچر سے آراستہ کیا تھا۔ چھت پر بون سائی جمع کیے تھے۔ باورچی خانے میں لکڑی کے برتن بھر دیے تھے۔ گیس، فرج، میوزک سسٹم، سب کے لیے جگہ بنائی تھی۔

دوستوں کا آنا جانا شروع ہو چکا تھا۔ اسے معلوم تھا انھیں بھی، چاچی کو بھی، یہ کبھی گوارا نہیں ہوگا کہ وہ اکیلی گھر بنا کر رہے۔ ایسے ہی ان کے دل کو کافی ملال تھا۔ وہ اسے نوکری کرنے سے نہیں روک پائے تھے۔ شادی کے لیے اسے کسی طور راضی نہیں کر پائے تھے۔ پہاڑ جیسی عمر ہو رہی تھی مگر وہ اسے 'عزت' سے بسر کرنے پر آمادہ نہیں کر پا رہے تھے۔ وہ ان کے لیے کھٹکتا کانٹا بن گئی تھی۔

ایک حد کے اندر وہ بدلتے زمانے کے ساتھ چلنے پر اعتراض نہیں کرتے تھے۔ اس کی سہیلیوں میں ایک مسلمان لڑکی بھی تھی — انھوں نے کبھی نہیں ٹوکا تھا۔ مگر ہر بات کی حد ہوتی ہے۔ وہ تو جیسے کہیں بھی رکنے کو تیار ہی نہیں تھی۔ کتنی بھی اس کی رسی ڈھیلی چھوڑو، وہ کھونٹے سے اور دور ہونا چاہتی تھی۔

اور آج تو جیسے رسی ہی توڑ دی تھی۔ ان کے اعتماد کو ایسی ٹھیس پہنچی تھی کہ بس۔ ایک برساتی میں — اکیلی — بغیر بتائے پانچ مہینے سے رہ رہی تھی، اور ... اور ... وہ آدمی ... وہ چپلیں ...

دکھ سے وہ تلملا اٹھے۔ "اڑا چلائے اور ہم چپ چاپ تماشا دیکھیں؟"

وہ چپ رہی۔ کیا اس نے ناسمجھی کی تھی جو خود ہی اس نے برساتی کے بارے میں چاچی کو اطلاع دے دی تھی؟ پر اپنا نام پتا چھپا کر بھی جیا جاتا ہے کیا؟ وہ بھی اپنے ہی گھر والوں سے؟ پھر چھپائے کیا؟ اس کا بھی تو حق ہے جینے کا، زندگی کو سمجھنے کا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جینے کو گناہ مان کر، خود کو گناہ گار سمجھ کر، سب سے کتراتی پھرے؟

پر یہ سب انھیں بکواس لگی تھی۔ "آگ میں ہاتھ ڈال کر آگ کو نہیں پہچانا جاتا۔"

اس نے بھی جوش میں جواب دیا تھا، "گاڑی کے نیچے نہ آجائیں، اس خوف سے سڑک پر چلنا ہی چھوڑ دیا جائے — یہ کہاں کی عقل مندی ہے؟"

وہ بلبلا پڑے تھے، "کس قدر ڈھیٹ ہوتی جا رہی ہے ... کوئی اس سے کچھ نہ کہے، بس آزاد چھوڑ دے، اور یہ جو چاہے کرتی رہے! ..."

وہ چپ ہی نہیں ہو پائے تھے، "الگ، اکیلے رہنے کی کیا ضرورت پڑ گئی؟ ہاسٹل میں کیا کمی ہے؟ ہر سہولت ہے، عزت ہے، حفاظت ہے، کوئی دیکھنے والا ہے ..."

Scanned with CamScanner

یہی تو وہ کہہ رہی تھی — کسی دیکھنے والے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی روزمرہ کی زندگی طے کرنے والا کوئی اور نہیں ہوگا۔

وہ جوالا مکھی کی طرح پھوٹ پڑے تھے، ''... اور یہ ضروری ہوتا ہے ہمارے سماج میں۔ لڑکی کسی نگرانی میں رہتی ہے -- پہلے ماں باپ، پھر شوہر اور پھر بیٹا اس کی دیکھ بھال کرتا ہے۔''

''پر میں اپنی دیکھ ریکھ خود کروں گی۔'' اسے لگا، کیسی ذلت ہے جو ایسی بات کو لفظ دینے پڑ رہے ہیں، جیسے کہنا پڑے: مجھے راتوں کو سونے کا اختیار ہے۔

''تم کتنی اچھی طرح کرو گی وہ تو میں ہی دیکھ رہا ہوں... '' وہ طوفان کی مانند امڈتے ہی چلے گئے، ''خاندان کی آبرو سے کھلواڑ کر رہی ہو... ہمارے سماج میں لڑکی کی بہت بڑی ہستی ہوتی ہے... دیوی ہوتی ہے... بہت سنبھل کر چلنا ہوتا ہے... لڑکی کے پلک جھپکنے تک کا مطلب لگا لیا جاتا ہے... عزت سب سے قیمتی سرمایہ ہے۔''

ہاں، اسے معلوم تھا، وہ کم بولنا اور کم نظر آنا جو لڑکی کی عزت بناتا ہے۔ اس کے بچپن میں وہ اسے اور ماں کو بھی لگاتار سناتے تھے، ''ایسے رہو کہ کسی کو پتا بھی نہ چلے کہ گھر پر کوئی ہے۔''

اس نے کہنا شروع کیا، ''جسے آپ عزت مانتے ہیں، اسے میں اپنی سب سے بڑی بے عزتی مانتی ہوں۔''

''بکواس مت کرو!'' وہ چیخ اٹھے، ''بیوقوف ہو... سمجھتی نہیں...''

اس نے ان کے کانپتے ہاتھوں کو دیکھا، ان کے چوڑے تمتماتے چہرے کو دیکھا، ان کی آنکھوں میں کٹر پن کی لو دیکھی۔

اس کی ساری باتیں انھیں بناوٹی لگ رہی ہوں گی — بڑی بڑی کتابوں سے رٹی ہوئی۔

اس نے دھیمے لہجے میں کہا، ''میں اپنے ڈھنگ سے جینا ٹھیک سمجھتی ہوں۔ آپ سمجھ سکتے ہیں تو یہاں رہیے۔ زبردستی تو میں سمجھا نہیں سکتی۔ میں نے تو یہی چاہا تھا کہ آپ بھی میری زندگی میں شریک ہوں... پر میری بے عزتی کرنے کے لیے نہیں... میری شخصیت کی، میری پرائیوٹ لائف کی... آپ کو قدر کرنی ہی پڑے گی۔ آپ کو اچھا نہیں لگتا تو چلے جائیے...''

ان کے بدن میں سنسنی پھیل گئی۔ ''یہ مجال...؟'' انھوں نے لپک کر اس کی بانہہ پکڑ لی۔

Scanned with CamScanner

اس نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ ڈپلی کیٹ چابی اٹھا کر وہ دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ جاتے جاتے بولی، ''دیکھیے، ہے تو یہ میرا ہی گھر۔ آپ اچھے سے رہ سکتے ہیں تو ٹھیک ہے۔ توڑ پھوڑ مچانا ہے تو چلے جائیے۔'' وہ خود پر قابو نہ رکھ سکی۔ ''یو کین گیٹ آؤٹ۔''

کہہ کر وہ چلی گئی۔

وہ پاگل ہاتھی کی طرح چکر کاٹنے لگے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اپنا خون ہے، اسے ہر حال میں بچانا ہوگا۔ آخری دم تک اس کے پیچھے جانا ہوگا۔ اس کا دماغ پھر گیا ہے۔ اپنے کو، سب کو، برباد کر کے رکھ دے گی۔ ایسے ہی لمحے کی رستوگی کو تلاش تھی۔

''صاحب، ہمارے ساتھ چائے پیجیے۔''

رستوگی بینک میں کام کرتے تھے۔ ان کی بیوی اور چار لڑکیاں تھیں۔ جیسے تیسے انھوں نے یہ گھر بنا لیا تھا اور اوپر کے دو کمرے کرائے پر اٹھا دیے تھے۔ سگریٹ شراب کا بندوبست اس طرح ہو گیا تھا۔ بیوی بیٹیوں کی خاطر انھوں نے وہ کیا جو شاید کرتے نہیں — اکیلی عورت کو انھوں نے برساتی دے دی۔ انھیں لگا وہ دن بھر بینک میں رہتے ہیں، گھر پر سب اکیلے ہوتے ہیں، کرائے دار کوئی سیدھی سادی عورت ہو تو اچھا رہے گا۔ یہ لڑکی پاس کی ایمبیسی میں ٹرانسلیٹر تھی۔ پڑھی لکھی تھی اور بھلے خاندان کی دکھائی دیتی تھی۔ ٹھیک ہی رہے گی۔

پر... اب انھیں اپنی بھول کا احساس ہو رہا تھا۔ ان کی بھی محلے میں عزت ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس عمر پر، بھلے یا برے گھر کی لڑکی اکیلی ہو تو ہر کسی کے دماغ میں سوال کا ابھرنا قدرتی امر ہے۔ رستوگی دل ہی دل میں کڑھنے لگے۔ کس طرح کچھ کریں، سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ یہ لڑکی ہے یا کچھ اور؟ چھت پر بیٹھ کر مردوں کے ساتھ سگریٹ پیتی ہے۔ کھلے عام نئے سال پر رستوگی کو شراب کی دکان پر مل گئی تھی۔ اور وہ کالے چشمے والا فرنگی آئے دن اس کے گھر گھسا رہتا ہے۔ دو راتیں وہاں ٹھہرا بھی تھا۔ شاید ہوائی اڈے سے سیدھا آ گیا تھا — اس کے سوٹ کیس پر ایتالیا ایرویز کی سلپ لگی تھی۔

''دیکھیے صاحب، آپ ہمارے بزرگ ہیں، آپ کی عزت کرتا ہوں... پر برا نہ مانیے... لڑکیوں کا اتنا آزاد ہونا ٹھیک نہیں... دس طرح کی باتیں ہوتی ہیں...''

''ہاں ہاں، بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔ آپ کی بھی لڑکیاں ہیں...''

Scanned with CamScanner

''ہاں صاحب، اسی لیے بول رہا ہوں... برا نہ مانیے گا، آپ بڑے آدمی ہیں... یہاں اس گھر میں بیٹھ کر... سگریٹ پیے...''

سگریٹ... بیئر... فرنگی...

''آپ بے فکر رہیے... کچھ مہینوں کی تھی تب سے میرے ساتھ ہے... میرا خون ہے... میں دیکھ لوں گا... انھی ہاتھوں سے چار ٹکڑے کر دوں گا...''

''ہمارے یہاں لڑکیاں کسی کے سامنے نہیں آتیں...'' انھوں نے اس سے چنگھاڑ کر کہا تھا۔ ''کسی کو اپنے کو چھونے تک نہیں دیتیں، باپ تک کو نہیں۔''

سچ کہہ رہے تھے۔ جب اس نے سڑک پار کرتے وقت بچپن میں ان کا ہاتھ تھام لیا تھا تو انھوں نے کہا تھا، ''لڑکیوں کو اپنی ماں کا ہاتھ پکڑنا چاہیے۔''

اس کے دل میں یادوں کا انبار لگ گیا۔ وہ چھوٹی لڑکی جس کو دیکھ کر انھوں نے گمبھیر آواز میں کہا تھا، ''تم بڑی ہو رہی ہو!''

وہ بے عزت ہو گئی تھی۔ وہ اس پر الزام لگا رہے تھے۔ اسے اپنے بدن پر شرم آ گئی۔

تب وہ فراک پہنتی تھی۔ انھوں نے ایک دن چاچی کو ڈانٹ دیا اور اسے فراک کے نیچے نیکر پہنوا دی، پوری ٹانگوں کو ڈھانکتی ہوئی۔

شاید اس کی شخصیت نے بڑھنا بند کر دیا، جس دن اس کا بدن بڑھنے لگا۔

''ہمارے یہاں عورت کا سب سے اونچا مقام ہے۔ اسے اپنے آپ کو سب سے دور رکھنا چاہیے۔ بدن کو چادر میں لپیٹ کر رکھنا ہے۔''

وہ شرم سے سمٹتی چلی گئی تھی۔ جتنا اس کا بدن بڑھا تھا وہ اتنا ہی سکڑ گئی تھی۔ اس کی ساری سوچ، اس کی ساری کوششیں اپنے جسم کی تبدیلی کو ڈھانپنے میں لگی تھیں، جیسے ساری دنیا کی نظریں وہیں لگی ہوں، اور اس کی ساری جان اس میں سمائی ہو۔

جب ایک شام ڈھلے گاڑی ایک گاؤں کے پاس پنکچر ہو گئی تھی تو وہ خوفزدہ ہوا تھے۔ انھوں نے ڈرائیور کو بھیج کر گاؤں والوں کو پہیہ مرمت کرنے کے لیے بلایا۔ دبی آواز میں اس سے کہا، ''چپ چاپ پیچھے کی سیٹ پر لیٹ جاؤ۔'' وہ گھبرا کر چاچی کی گود میں دبک گئی تھی اور چاچی نے اسے دوہر

Scanned with CamScanner

(ڈلائی) سے ڈھانپ دیا تھا۔ مردوں کی بھاری بھاری آوازیں اس کے کانوں میں ایک زمانے تک گونجتی رہیں۔ پھر گاڑی چل پڑی تھی۔

وہ بھی سوچتے ہوں گے، نہ جانے کیا کمی رہ گئی ان کے سکھانے میں۔ کیوں یہ خبط سوار ہوا اس پر جو اپنے وجود کو اپنی شخصیت سے الگ کرنے لگی؟ اتنی آزاد خیال ہوگئی؟ وہ اپنے آپ کو کوستے رہے اور اس نئی تعلیم کو اس کا ذمے دار قرار دیا۔ تبھی بڑے بوڑھے کہتے ہیں کہ لڑکی کو زیادہ تعلیم نہیں دینی چاہیے۔ اس پر کڑی نگاہ رکھنی چاہیے۔

•

انھوں نے اسے بہت اکیلا چھوڑا۔ انھیں پتا ہی نہ چلا کہ اس کا دماغ چند چیزیں آئیڈیلائز کر رہا ہے۔ ایک دن انھوں نے اسے اسکول کی کتاب میں چھپا کر رومینٹک کہانی پڑھتے ہوئے پکڑا تھا۔ اس پر بگڑے بھی تھے، ''ہمارے یہاں لڑکیاں سب کچھ دیر سے جانتی ہیں، وہ معصوم ہوتی ہیں۔''

پھر انھوں نے سیمون دی بووار کی کتاب جو وہ پڑھ رہی تھی کہیں ہمیشہ کے لیے چھپا دی تھی۔ چاچی کو کہا بھی تھا کہ اکیلے مت چھوڑا کرو، کوئی غلط چیز نہ سیکھ جائے۔

اسے وہ دن بھی یاد آیا جب وہ چھانٹ کر میٹھے امرود لائی تھی اور بچپنے میں ایک چھلانگ لگا کر ان کے دفتر میں کود آئی تھی۔ تب انھوں نے بہت زور سے اسے ڈانٹ دیا تھا، کیونکہ اس وقت وہ تیرہ سال کی تھی اور پتلی سی نائٹی پہنے اندر آدھمکی تھی، ٹائپ بابو کے سامنے۔ تب بھی انھوں نے کہا تھا، ''ہم کسی کو اپنا بدن نہیں دیکھنے دیتے، دور سے نمسکار کر کے اندر چلے جاتے ہیں۔''

اس کے سمٹتے ہوئے بچپن نے اسے جھک کر چلنا سکھا دیا۔ اپنے ہی جسم پر شرما کر کترانا سکھا دیا۔ سب کی نظر کے ڈر نے اسے سناٹے میں رہنا سکھا دیا۔

پر وہ تو بچپن کی بات تھی، بونے بچپن کی۔ سناٹے میں بھی نہ جانے کہاں سے سوچ کی چنگاری دبی پڑی تھی۔ انجانے میں جھونکے آتے رہے اور آگ بھڑک اٹھی۔

جب انھیں پتا چلا تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ اس نے ان کے ہر اصول کو، ہر آدرش کو یکسر ٹھکرا دیا۔ وہ کہتے، وہ بہت بے شرم ہوگئی ہے۔ وہ کہتی کہ وہ خود اعتماد ہوگئی ہے۔ وہ کہتی تھی، وہ جسم سے انسان بن گئی ہے۔ وہ کہتے تھے کہ وہ انسان سے گندہ جسم بن گئی ہے۔

Scanned with CamScanner

''کوئی اور لفظ نہیں بچا تمھارے لیے۔ گر گئی ہو۔ نیچ عورت بن چکی ہو... پاگل... آوارہ... اپنے ان بوڑھے چاچا چاچی کی موت بن گئی ہو...''

''جہاں سب کپڑے پہن کر گھومتے ہیں، وہاں بے لباس گھوموگی؟'' وہ چلّا پڑے۔

''آپ چلے جائیے... '' اس کے منھ سے سخت الفاظ نکل گئے، ''میری اپنی راہ ہے۔ اس عمر میں مجھے اپنے حساب سے جینے کا حق ہے۔ آپ کو میرے ڈھنگ نہیں بھاتے تو آپ جاسکتے ہیں... '' اس کے منھ سے نکل گیا۔

اُس وقت تو وہ چلے گئے، پر جا کر روتے رہے۔

وہ بھی روئی تھی — اپنی تیس سال کی ناکامی پر، اکیلی ہو کر سماج میں عزت نہ پانے کی لاچاری پر، مرد نہ ہونے کی، اس طرح جینے کی لعنت پر...

زندگی کا منچلاپن وہ قبول کرے، یہ حق اسے نہیں تھا۔ نئی سمتوں، نئی منزلوں کی تلاش اس کے لیے نہیں۔ اور اگر کھلی ہوا کے تھپیڑے لگ ہی گئے تو ہمدردی کرنے والا کوئی نہیں۔ یہ کون مانے گا کہ اس کی بھی زندگی پوچھ تاچھ کر نہیں آتی؟

یاد ہے وہ ہر اتوار کو برساتیوں کے اشتہار دیکھنا۔ کسی نے فون پر انکار کیا تو کسی نے اس کے پیچھے نظر پھینکی، ''آپ اکیلی... معاف کیجیے گا... '' کسی نے قانون بگھارنے شروع کر دیے، ''رات کو کوئی آدمی مہمان نہ ہو... شور نہ ہو... ملنے والوں کی لسٹ بنا دیجیے...''

پھر رستوگی نے بغیر کچھ کہے سنے اسے برساتی دے دی۔ ویسے ان کی بیوی پوری کوشش کرتیں کہ کچھ جان جائے — کبھی سگریٹ کا پیکٹ دیکھ کر آنکھیں پھیل جاتیں، کبھی کسی مرد کی جھلک پا کے۔ اور تو اور، جیسے ہی وہ اپنی ڈاک دیکھنے سیڑھی پر اترتی، وہ بھی اپنی ڈاک جانچنے دھم دھم سیڑھیاں اترنے لگتیں، جیسے دروازے کی اوٹ میں بس اسی کی تاک میں بیٹھی ہوں۔

چٹھیاں اٹھاتے ہوئے پوچھتیں، ''آپ کے ماں باپ نے آپ کی شادی نہیں کی؟''

''میں نے نہیں کی!'' اسے تھوڑا غصہ آتا۔

سو تو ٹھیک ہے، رستوگنی سوچتی ہوگی۔ ایک آدھ ایسے ہی رہ جاتی ہیں۔ پر یہ رنگ رلیاں کیسی؟ یہ سجتے دھجنے کی دھن کیسی؟ یہ ملنے ملانے کا موقع کیسا؟

Scanned with CamScanner

ہاں، بات صاف ہے۔ یا لکیر پر چلو، اور ٹھسّے سے چلو، مانگ میں سیندور، ماتھے پر بندیا، ہاتھ میں چوڑیاں —— اِترا اُو اب!

یا سنیاس لے لو...

بس عزت دار عورتوں کے لیے یہی دو راستے ہیں... تیسرا راستہ ہے —— گلطاؤں کا۔

اسے بھی ضد ہو گئی کہ دبنگ بنوں گی۔ کسی کو بہلانے کی کوشش نہیں کروں گی۔ جب اجو بھیا رہنے آئے اور لیٹر باکس کے پاس مکان مالکن پوچھ بیٹھیں، ''کون آئے ہیں؟ بڑی تیاری ہے؟'' تو اس نے ''مہمان'' کہہ کر منھ پھیر لیا۔

ان عزت کے بھوکوں کی کڑھن بڑھتی گئی۔

پر اب کھیل کا وارا نیارا کرنا ان کی طاقت اور اختیار میں تھا۔

رات نو بجے فرنگی اسے میوزک کانفرنس میں لے جانے آیا تو رستوگی، جو اپنے مہمان کے لیے کھڑے نہیں ہوتے تھے، سرپٹ دوڑ پڑے کہ کہیں مہمان اوپر تشریف لے جانے کا ارادہ نہ بدل دے، زینے کا دروازہ کھول آئے۔

اوپر وہ بیٹھ گئے تھے —— ساکت!

وہ اٹھی، ''میں دیر سے لوٹوں گی،'' اور چلی گئی۔

انھیں جیسے لقوہ مار گیا ہو —— سُن۔ اس سے پہلے کا کوئی تجربہ ہو تو کچھ دماغ میں بھی آئے کہ معاملے کو کیسے نمٹایا جائے۔ پر اس طرح لڑکی آنکھ ملا کر چل دے... اس لفنگے کے ساتھ...

نہیں، چپ نہیں بیٹھ سکتے —— کسی حالت میں نہیں۔ وہ دانت پیس کر غرائے تھے، ''بوڑھا ہوں، پر یہ نہ سمجھو بے کار ہوں... ایسا سبق سکھاؤں گا کہ اس دیس میں آنا بھول جائے گا... ایک ہڈی ثابت نہیں بچے گی...''

وہ ہاتھ ملتے رہ گئے۔

تب بیوی کے پیروں پر گرے اور انھیں ساتھ لے کر آئے، اچانک، آدھی رات کو۔

''یہ میں کیا سن رہی ہوں؟'' چاچی رونے لگیں۔

اس نے سمجھانے کی کوشش کی، ''چاچی سب کا حق ہے... سب کی پرائیویٹ لائف ہے...''

''پرائیویٹ لائف... ؟'' ان کی چیخ گلے میں اٹکنے لگی تھی۔ ''سنتی ہو؟ اب یہ پرائیویٹ لائف چلے گی!... دیکھ رہی ہو... دھندا...''

اور سَن سے وہ چپلیں اس کے کان کو رگڑتی ہوئی دیوار سے ٹکرا کر نیچے گر گئیں۔

''کس کی ہیں یہ چپلیں؟ پوچھو... بتاؤ... ؟ رستوگی جی، ایک منٹ ادھر آیئے۔ دیکھیے ہماری بیوی بوڑھی ہے، لنگڑی ہے، چل نہیں پاتی۔ پریشان ہو کر آتی ہے۔ آپ بتایئے کیا ہوتا ہے یہاں...''

وہ سن بیٹھی رہی۔

رستوگی نے اس کے نام آئے خط سامنے رکھ دیے۔

''پوچھو اس سے... پوچھو اس...''

شاید بیزار راتوں کا ذکر کر دیا ہو... یا اس کی کمر کے تل کو یاد کیا ہو...

اس نے دیکھا۔ وہیں، اس کے سامنے بے دردی سے اس کی آنتیں باہر کھینچی جا رہی تھیں۔

''مرد جانور ہوتا ہے، بھوکا بھیڑیا۔ وہ عورت کی عزت نہیں کرتا ہے... اسے کھاتا ہے...''

اسے دکھائی دے رہا تھا، وہی... اتنا ہی... جو انھیں دکھائی دے رہا تھا...

پتا نہیں اب بھی وہ ننگی تصویریں دیکھتے ہیں کہ نہیں۔ تب ان کی تکیہ کے نیچے اکثر فرنگی میگزینز پڑی رہتی تھیں، جن میں جسموں کی نمائش تھی، مردوں کے کھانے کے لیے...

میگزین کا اگلا صفحہ کھل گیا— جو ہمیشہ کھلا رہے گا، جو لگاتار انھیں دکھائی دیتا رہے گا۔

اس پر وہ ہو گی...

ان کی بھدی نگاہ پر اس نظریں جھک گئیں۔

رستوگی اٹھ کر چلے گئے تھے۔ گنجے سر اور کھچڑی مونچھوں والے معزز صاحب نے اپنی ڈگمگاتی عزت محلے میں سنبھال لی تھی۔

چاچی... چاچی تو پیدا ہی ہوئی تھی روتے ہوئے!

وہ غصے اور شرم سے کانپ رہے تھے۔

''ہماری لڑکیاں پاکباز ہوتی ہیں... وہ سب کچھ دیر سے جانتی ہیں... ہم سے کہتی ہے، نکل جاؤ... ہم تمھیں نکالیں گے... رستوگی تمھیں دھکے مارے گا...''

Scanned with CamScanner

اسے لگا وہ تیس سال کی بالغ نہیں ہے، وہ ایک ادھ مری چڑیا ہے۔

''پرائیویٹ لائف...'' وہ دہاڑے۔

پرائیویٹ لائف۔ کیا مطلب؟ انسان کی اپنی نجی زندگی؟ جس میں بہت سے ملے جلے اجزا ہیں ___ سکون، کام، اکیلا پن، دُکیلا پن، دوست، رومانس۔

نہیں! پرائیویٹ لائف کا مطلب ہے... بدکرداری...

''اس لیے اکیلے رہنا تھا... اس لیے... اس لیے؟''

کیا کیا کرتی ہے وہ؟ دنیا بھر کا حق ہے کہ جانے۔ کس سے کتنی دوری سے بات کرتی ہے؟ کسے چومتی ہے، ہونٹوں پر یا انگلیوں پر؟

اسے لگا، اس نے عزت سے جینا چاہا تھا، اپنی دنیا بنانے کی کوشش کی تھی...

اسے لگا، ابھی، اسی وقت ایک ریپ ہوا ہے ___ اس کی انسانیت کا، اس کی بالغ عمر کا۔

بچپن میں اس کا وجود اس کے جسم کے ایک حصے میں ساری جان، سارا جنون لے کر بس گیا تھا۔ وہیں اس کی عزت سما گئی تھی۔

اسے لگا اس کا وجود اس کے جسم سے پھسل کر زمین پر پڑا تڑپ رہا ہے۔

❊❊

کملیشور

ہندی سے ترجمہ: صدف کاظمی

ماس کا دریا

جانچ کرنے والی ڈاکٹرنی نے اتنا ہی کہا تھا کہ اسے کوئی پوشیدہ بیماری نہیں ہے، پر ٹی بی کے آثار ضرور ہیں۔ اس نے ایک پرچہ بھی لکھ دیا تھا اور کھانے کو غذا بھی بتائی تھی۔

کمیٹی پہلے ہی پیشے پر پابندی لگا چکی تھی۔ سب پریشان تھیں۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا ہوگا۔ ڈاکٹری جانچ میں بہتوں کا پیشہ پہلے ہی ٹھپ ہو چکا تھا۔ ابراہیم ٹھیکے دار نے جو چنی تھیں، وہ سب 'پاس' ہوگئی تھیں۔ ان کے نخرے بہت بڑھ گئے تھے۔ وہ بڑے غرور سے اپنے خاندانوں کا ذکر کرتی تھیں۔

ابراہیم نے چست اور درست لڑکیوں کو چھانٹ لیا تھا۔ دھیرے دھیرے وہ شہر کے اچھے حصے میں جا بسی تھیں۔ ابراہیم ان کی دیکھ بھال کرتا تھا اور جس ٹھیکے سے لے گیا تھا ان کا پیسہ مہینے کے مہینے چکا جاتا تھا۔

اس بار جب جگنو زیادہ پریشان تھی تو اس نے بھی ابراہیم سے کہا تھا کہ کسی ٹھور ٹھکانے پر بٹھا دے، پر ابراہیم نے دوٹوک جواب دے دیا تھا، ''بیاہ تو ہے نہیں کہ کسی کی آنکھ میں دھول جھونک کر گلے مڑھ دوں، جو آئے گا وہ تو بوٹی بوٹی دیکھے گا۔'' اور وہ کترا کر چلا گیا تھا۔

اُس دن اس کے دل پر پہلی چوٹ لگی تھی۔ اب وہ اس لائق بھی نہیں رہی؟ دوسری چوٹ تب لگی تھی جب ساتھ کے چوبارے سے شہناز نے ہاتھ مٹکاتے ہوئے گالی دی تھی، ''اری اللہ تجھے وہ دن بھی دکھائے گا جب گاہک تیری سیڑھیوں پر قدم بھی نہیں رکھے گا۔''

Scanned with CamScanner

شہناز کی اس بات پر محلے میں بڑا واویلا مچا تھا۔ یہ گالی تو بُری سے بُری کو بھی نہیں دی جاتی۔ سب کے گاہک جیتے رہیں۔ خدا مردوں کو روزی دے... جانگھ میں زور دے۔

اور اسی دن پہلی بار جھجکتا ہوا وہ آیا تھا۔ فتے اسے لایا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بڑا سا تھیلا تھا۔ وہ خاکی پینٹ اور نیلی قمیض پہنے تھا۔ داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ کانوں کے رووں اور بھنووں پر دھول کی ہلکی سی تہہ جمی تھی۔ کمرے میں جا کر جگنو کھاٹ پر خود بیٹھ گئی تھی تو وہ ہچکچایا سا کھڑا رہ گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ تھیلا کہاں رکھے۔ تب جگنو نے بڑی آسانی سے تھیلا لے کر سرہانے رکھ دیا تھا۔ وہ چپ چاپ کھاٹ پر بیٹھ گیا تھا۔ کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد جگنو نے کہا تھا، ''جوتے اتار لو۔'' اُس نے کرمچ کے جوتے اتارے تو بدبو کا ایک بھبکا اٹھا تھا، کچھ کچھ ویسا ہی جیسا کہ بہتوں کے کپڑے اتارنے پر اٹھا کرتا تھا، خاص طور سے اُس منسو کریانے والے کے پاس سے پھوٹتا تھا جو رات گیارہ کے بعد ہی آیا کرتا تھا اور بعد میں کمر کے درد کی وجہ سے اینٹ کی طرح بیٹھا رہ جاتا تھا۔ تب جگنو ہی اسے اٹھاتی تھی اور وہ جانگھیں کھجاتا ہوا چلا جاتا تھا۔ یا پھر کنور جیت ہوٹل والے کی طرح، جو بدبو تو دیتا ہی تھا، اٹھنے سے پہلے کھاٹ پہ بیٹھا ہوا اُوں اُوں کر کے ڈکاریں بھی لیتا تھا۔

بھبھک اس سے برداشت نہیں ہوئی تو وہ بولی تھی، ''جوتے پہن لو!''

وہ جوتے پہن کر پھر بیٹھ گیا تھا، تب اُسے بڑی کوفت ہوئی تھی۔

ایک منٹ تک وہ اسے گھورتی رہی تھی۔ پھر چڑ کر بولی تھی، ''یہ کوئی بیٹھک نہیں ہے... نمٹ کے اپنا رستہ ناپو۔'' اُس نے اپنی توہین محسوس کی تھی اور اپنے کو سنبھالنے کے بعد ہچکچا کر بولا تھا، ''تمھارا نام کیا ہے؟''

''جگنو۔''

''کہاں کی ہو؟''

''تم اپنا کام کرو...'' وہ پھر چڑ گئی تھی۔

اور تب اس نے سب کی طرح پوچھا تھا، ''تمھیں یہ پیشہ پسند ہے؟''

''ہاں!... تمھیں نہیں ہے؟'' کہتے ہوئے وہ لیٹ گئی تھی۔ اس نے ساڑھی کھسکالی تھی۔ وہ بھی لیٹ گیا تھا۔ پھر اس نے بلاؤز کے اندر ہاتھ ڈالنے کی جھجک بھری کوشش کی تھی۔

Scanned with CamScanner

''پریشان نہ کرو تو اچھا ہے...'' وہ بولی تھی۔

اب اس کے لیے کچھ بھی کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔ جگنو کے چہرے پر سستے پاؤڈر کی تہہ تھی۔ گردن پر پاؤڈر کی بتیاں سی بن گئی تھیں۔ ہونٹوں پر خون سوکھ کر چپک گیا تھا۔ کانوں کے ٹاپس مینڈک کی آنکھوں کی طرح ابھرے ہوئے تھے۔ بال تیل سے بھیگے ہوئے تھے۔ تکیہ بہت گندہ تھا اور چادر کچلے ہوئے چنبیلی کے پھول کی طرح میلی۔

تنگ کوٹھری میں عجیب سی بدبو بھری ہوئی تھی۔ ایک کونے میں پانی کا گھڑا رکھا تھا اور ٹام چینی کا ایک ڈبا۔ کونے میں کچھ چیتھڑے بھی پڑے تھے۔

وہ پڑا پڑا ادھر اُدھر دیکھتا رہا تھا۔ جگنو کے سرہانے ہی چھوٹی سی الماری تھی۔ اس کا پتھر تیل کے چکنے چکتوں سے بھرا ہوا تھا۔۔۔ ٹوٹا ہوا کنگھا، سستی نیل پالش کی شیشی اور جوڑے کی کچھ پنیں اس میں پڑی تھیں۔ الماری کی دیوار پر پنسل سے کچھ نام اور پتے لکھے ہوئے تھے۔ فلمی گیتوں کی کچھ کتابیں ایک کونے میں رکھی تھیں۔ ان کے پاس مرے ہوئے سانپوں کی طرح چٹیلے پڑے تھے۔

دیکھتے دیکھتے اس کے من میں گجگجاہٹ بھر گئی تھی۔ سہارے کے لیے اس نے جگنو کی جانگھ پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ جانگھ باسی مچھلی کی طرح پلپلی اور کھدر کی طرح کھردری تھی۔ جگنو کے کھلے ہوئے آدھے جسم سے ماوے کی مہک آرہی تھی۔ اس نے ہاتھ ہٹایا تو جانگھوں کے نیچے چادر پر آگیا تھا۔ اسے لگا تھا جیسے چادر بھیگی ہوئی ہو۔

''یہاں کمائی کا وقت ہوتا ہے... اتنے میں تو چار خوش ہو گئے ہوتے!'' جگنو نے کہا تھا اور اسے بانہوں میں لے لیا تھا۔

پھر جب وہ اٹھ کر بیٹھا تھا تو جگنو نے مذاق مذاق میں اس کا تھیلا کھول لیا تھا۔ ''بہت روپیہ بھر کر چلتے ہو!'' اسے لگا تھا کہ شاید وہ مذاق میں ایک آدھ روپیہ اور جھٹیانا چاہتی ہے۔ تھیلے میں کاغذ، اخبار اور روٹی دیکھ کر وہ شرمندہ ہو گئی تھی۔

''پھر کبھی آنا تو پوچھ لینا... سیدھے آؤ گے نا؟'' جگنو نے کوٹھری سے باہر نکلتے نکلتے کہا تھا۔ تب اس نے جگنو کو پہلی بار غور سے دیکھا تھا اور چپ چاپ چلا گیا تھا۔

جب بھی جگنو بازار سے نکلتی تو سر پر پلو ڈال کے۔ وہ اتنی چھچھوری بھی نہیں تھی کہ کوئی پھبتی

Scanned with CamScanner

کستا۔ سب اسے ایسے دیکھتے تھے جیسے اس پر ان کا پورا حق ہو۔ وہ راستہ چلتے کنکھیوں سے ان لوگوں کو ضرور دیکھ لیتی تھی جنھیں وہ اچھی طرح پہچانتی تھی اور جو اس کے مردوں کی طرح اس کے پاس آتے جاتے تھے۔ تبھی ایک دن وہ دکھائی پڑا تھا — وہی تھیلے والا آدمی۔ ایک عمارت کی پہلی منزل کے چوبارے پر کہنیاں ٹیکے وہ بیڑی پی رہا تھا۔ وہی قمیض پہنے تھا۔ عمارت پر لال جھنڈا لگا ہوا تھا جس کا سایہ اس کے کندھوں پر کانپ رہا تھا۔

ٹوٹی ہوئی چپل جڑوانے کے لیے وہ وہیں رک گئی تھی۔ وہ شاید اندر چلا گیا تھا۔

رات کو وہ آیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں پہچان تھی۔ اس بار وہ ہچکچا نہیں رہا تھا۔ کھاٹ پر بیٹھے بیٹھے جگنو نے اس سے پوچھا تھا، ''تم کیا کام کرتے ہو؟''

''کچھ نہیں،'' وہ بولا تھا، ''مزدوروں میں کام کرتا ہوں۔''

''ہمارا بھی کچھ کام کر دیا کرو... ہم بھی مزدور ہیں۔'' جگنو نے مذاق کیا تھا۔

''تمھیں دیر تو نہیں ہو رہی؟'' اس نے پوچھا تھا۔

''آج طبیعت ٹھیک نہیں ہے،'' جگنو اَلکساتے ہوئے بولی تھی۔

''کیا ہوا؟''

''کمر بہت دُکھ رہی ہے۔ سارے بدن میں ہڈ پھوٹن ہے،'' جگنو بولی تھی، ''پتا نہیں کیا ہو گیا ہے... تارا کو بلا دوں؟... بہت شرافت سے پیش آئے گی... سمجھدار عورت ہے۔''

اس نے منع کر دیا تھا۔ کوئی ایک منٹ ٹھہر کر وہ چلنے لگا تھا تو صرف اتنا ہی بولا تھا، ''میں ایسے ہی چلا آیا تھا۔'' پھر وہ چپ چاپ اندھیری سیڑھیوں میں اتر گیا تھا۔ جگنو خاموشی سے آ کر کھڑکی پر کھڑی ہو گئی تھی۔ اسے لگا تھا کہ وہ کسی اور زینے میں چڑھ جائے گا۔ گلی میں زیادہ آمد و رفت نہیں تھی۔ تھوڑی تھوڑی دور پر آدمیوں کے تین چار غول کھڑے ہوئے تھے۔ ان میں سے نکل کر کبھی کبھی کوئی کسی زینے پر چڑھ جاتا تھا۔ نانبائی کی چمنی میں سے دھواں نکل رہا تھا... وہ اسے دیکھتی رہی تھی۔ وہ کہیں رکا نہیں تھا، دھیرے دھیرے گلی پار کر سڑک کی طرف مڑ گیا تھا — اُسی سڑک پر جس پر وہ عمارت تھی جس میں وہ رہتا تھا۔

جگنو کو اس کا یوں لوٹ جانا بہت اچھا لگا تھا۔ ہلکی سی خوشی ہوئی تھی۔ کوٹھری کے پلنگ پر آ کر وہ لیٹ گئی تھی۔

Scanned with CamScanner

کوٹھری میں بہت سیلن تھی اور گھٹی گھٹی سی بدبو۔ اس نے دروازہ بند کرلیا تھا اور فلمی گیتوں کی کتاب اٹھا کر دل ہی دل میں پڑھتی رہی تھی۔

تبھی کواڑوں پر دستک ہوئی تھی اور اماں کی آواز آئی تھی، ''جگنو بیٹے! موا بے ہوش تو نہیں ہو گیا؟''

''یہاں کوئی نہیں ہے اماں۔''

''تو چوبارے پر نکل آ بیٹے... بڑی اچھی ہوا چل رہی ہے... گلی میں رونق بھی ہے،'' کہتے ہوئے اماں نے دروازہ کھول دیا تھا۔ ''طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''کچھ گڑبڑ ہے اماں۔''

''تو ایک گلاس دودھ پی لے بیٹا... ابھی تو وقت ہے... کوئی آ ہی گیا تو...''

اور وہ اٹھ آئی تھی۔ اس کی گردن پر الٹا ہاتھ رکھتے ہوئے اماں نے بخار دیکھا تھا اور کمر کے اوپر پیٹھ کے گوشت کی لوٹتی ہوئی سلوٹیں دیکھ کر بولی تھی، ''صحت کا خیال چھوڑ دیا ہے تو نے... کمر پر کتنی موٹی پرتیں گرنے لگی ہیں... تھوڑی سی ورزش کرلیا کر۔'' یہ کہتی ہوئی وہ دوسری کوٹھری کی طرف چلی گئی تھی۔

دوسری کوٹھری سے کچھ تیز تیز آوازیں آرہی تھیں اور اماں بڑبڑاتی ہوئی اندر چلی گئی تھی، ''یہ چڑیل بنا لڑے لگام نہیں ڈالنے دیتی... کسی دن اس کوٹھری میں قتل ہوگا۔''

یہ روز کی بات تھی۔ بلقیس کو اماں یوں ہی کوستی رہتی تھی۔ خود بلقیس کا کہنا تھا کہ اس کے پاس سے کوئی بنا اپنی کمر پکڑے واپس نہیں جا سکتا۔ بلقیس کو اس میں مزہ بھی آتا تھا۔ آدمی کو چھوڑتے ہی وہ دروازے پر آکر کھڑی ہو جاتی تھی اور اسے ہار کر جاتے ہوئے دیکھ کر تالیاں بجا کر بڑی اونچی ہنسی میں ہنستی تھی، ''اری او مری زبیدہ! ذرا دیکھ... رستم جا رہا ہے! بڑا آیا تھا پہلوان کا جنا! یہ مردوا سوئے گا عورت کے ساتھ!''

ایک دن ایک آدمی بگڑ گیا تھا۔ ''کیا بک رہی ہے؟''

''ارے جا جا، بھشتی کی اولاد... لے یہ چونی لے جا، چھٹانک بھر ملائی کھا لیجو۔''

اور وہ آدمی بہت بے عزت سا سیڑھیاں اتر گیا تھا۔ پورے کوٹھے میں بلقیس کی وجہ سے دہشت چھائی رہتی تھی۔ پتا نہیں کب جھگڑا ہو جائے۔ اور وہ ہاتھ نچا نچا کر بڑے فخر سے ہمیشہ کہا کرتی تھی، ''اپن تو

برہمچاری کی عورت ہیں۔''

جگنو کو دیکھ کر بلقیس ہمیشہ طعنہ دیتی تھی، ''تو تو کسی گھر بیٹھ جا'' پر جگنو کسی سے لڑی نہیں۔ وہ جانتی تھی کہ بلقیس بہت منہ پھٹ ہے۔ اماں تک کو نہیں گانٹھتی۔ اور اماں تھی کہ سب کے تن بدن کا خیال رکھتی تھی۔ بدن چست اور درست رکھنے کے لیے وہ ہمیشہ چیختی ہی رہتی تھی، ''بھینس کی طرح پھیلتی ہی جارہی ہے۔ ساٹن کا پیٹی کوٹ پہنا کر، آلو کھانا بند کر کلموہی۔''

پیٹ پر ڈھلان آتے ہی وہ زبیدہ کے لیے اندر سے پیٹی نکال لائی تھی۔ ''دن میں اسے باندھا کر... چائے چینی کم کر۔'' اور اس نے زین کی ہر ناپ کی انگیاں لا کر رکھ دی تھیں۔ اسے بس ایک ہی فکر رہتی تھی: ''میرا بس چلے تو عمر روک دوں تم لوگوں کے لیے۔''

دوپہر میں اماں بڑے پیار سے کبھی کسی کے بال سنوارنے بیٹھ جاتی۔ کبھی شام کے لیے ساڑھیوں پر استری کرتی، اور بسنت کے دن تو وہ سب کے لیے بسنتی جوڑا رنگتی تھی۔ فتے کے لیے بسنتی رومال رنگنا بھی نہ بھولتی۔ عید بقرعید، ہولی دیوالی بڑے حوصلے سے مناتی اور کبھی کبھی کملا کو یاد کر کے ڈبڈبائی آنکھوں سے کہتی، ''اس جیسی لڑکی تو ہزار کوکھوں نہیں جنم پائے گی... بھگوان نے کیا خوبصورتی بخشی تھی... ہاتھ لگائے میلی ہوتی تھی... اسے تو پیسے والوں کا ڈاہ کھا گیا۔ زہر دے دیا کتوں نے... بہت تڑپی تھی بے چاری... ہائے میں اسپتال تک نہ لے جا پائی۔''

جگنو چوبارے میں آ کر بیٹھ گئی تھی اور آتے جاتوں کو دیکھتی رہی تھی۔ بھیڑ دھیرے دھیرے ہلکی ہو رہی تھی۔ پھول گجرے والے اٹھ کر جا رہے تھے۔ اور اس نے دیکھا تھا، روز کی طرح منن مالی نے جاتے ہوئے ایک گجرا کلاوتی کی کھڑکی میں پھینکا تھا اور کلاوتی نے روز کی طرح مسکرا کر گالیاں دی تھیں۔ بنے قلعی والا دھلا ہوا تہمد اور جالی دار بنیان پہنے آیا تھا اور سیدھا شہناز کے کوٹھے پر چڑھ گیا تھا۔

شنکر پنواڑی کے سامنے چبوترے پر نیم پاگل چنی لال نے اپنا بورا بچھا لیا تھا اور تام چینی کے مگے میں چائے پیتے ہوئے بڑبڑا رہا تھا، ''ارے ظالم! اس دن ہاتھ قلم کروالوں گا جس دن غلط سُر نکل جائے— ارے ظالم...! یہیں اتر کر آئے گی... اسی بورے پر سہاگ رات ہوگی... ظالم!'' اور تبھی ایک لمحے کے لیے گلی میں موڑ پر جگنو کو اسی نیلی قمیض والے کا شک ہوا۔ شاید وہ پھر لوٹ کر آیا تھا اور ابھی چپکے سے کہیں چڑھ جائے گا۔ پر یہ اس کا وہم تھا۔ وہ نہیں تھا، کوئی اور آدمی تھا۔

Scanned with CamScanner

پھر بہت دن بعد وہ لوٹا تھا اور جگنو کی کوٹھری میں آتے ہی گھر کی طرح کھاٹ پر پسر گیا تھا۔ لیکن جوتے اتارنے کی پھر بھی اس کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔

''تم اپنا نام تو بتا دو،'' جگنو نے بغل میں لیٹتے ہوئے پوچھا تھا۔

''مدن لال... کیوں؟''

''ایسے ہی... یہاں نہیں تھے؟''

''جیل میں تھا... گرفتاریاں ہو گئی تھیں، اسی میں چلا گیا تھا۔''

''کیوں؟''

''ہڑتال چل رہی تھی نا... مالکوں نے بند کروا دیا تھا۔ بڑی مشکل سے رہائی ہوئی۔''

''اس ہڑتال وڑتال سے کچھ ہوتا بھی ہے؟ کاہے کو کی تھی؟''

''بغیر نوٹس چھانٹی ہوئی تھی... تمھاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔ اور بھی بہت سے معاملے تھے...''

''...جوتے اتارلوں؟'' مدن لال نے بہت جھجکتے ہوئے کہا۔

''اتارلو۔''

اور کرمچ کے جوتوں اور پسینے سے سنے ہوئے پیروں سے جو بھبھک نکلی تھی، اس سے جگنو کو کوئی خاص پریشانی نہیں ہوئی تھی... دھیرے دھیرے جیسے وہی بو اس کے چاروں طرف سما گئی تھی... اور پھر اس کے بدن میں بھر گئی تھی۔

مدن لال تو چلا گیا تھا... پر اس کی وہ بو رہ گئی تھی، اور انھی دنوں سب ویشیاؤں کو ڈاکٹری جانچ کے لیے حاضر ہونا پڑا تھا۔ ڈاکٹرنی نے اتنا ہی کہا تھا کہ کوئی پوشیدہ بیماری نہیں، پر ٹی بی کے آثار ضرور ہیں۔

دیکھتے دیکھتے اس کی کھانسی بڑھ گئی تھی، بخار رہنے لگا تھا۔ اماں اسپتال لے جا کر دکھا آئی تھی، پر روگ تھمنے میں نہیں آ رہا تھا۔ دھیرے دھیرے وہ کام کے لائق نہیں رہ گئی تھی۔ ایک دن خون تھوکا تھا تو بلقیس نے آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ ''ارے اسے ڈلواؤ کہیں باہر! ہمیں کیا مرنا ہے؟'' تو اماں نے اسے ڈانٹا تھا، پر اندر سے وہ بھی دہل گئی تھی۔ طرح طرح سے اس نے جگنو کو سمجھایا تھا کہ وہ اپنی صحت کی خاطر کہیں اور چلی جائے۔ ضرورت کے لیے سو پچاس روپے بھی لے جائے، پر اس طرح کی لاپروائی نہ کرے۔

Scanned with CamScanner

لیکن جگنو کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کہاں چلی جائے۔ پیسہ بھی پاس نہیں تھا اور سو دو سو سے کتنے دن کٹ سکتے تھے؟ آخر ہار کر وہ ٹی بی اسپتال میں بھرتی ہوگئی تھی۔ دھیرے دھیرے اماں کا دیا اور اپنے پاس کا سارا روپیہ ختم ہوگیا تھا۔ چار مہینے لگاتار اسے سینے ٹوریم میں رہنا پڑا تھا۔ اس کے بعد بھی چھٹی نہیں ملی تھی۔ ہاں کہیں تھوڑی بہت دیر کے لیے آنے جانے پر پابندی نہیں تھی۔ وہاں سے نکل کر وہ دو چار بار اماں کے پاس آئی بھی تھی۔ اماں نے کہا، ''کسی کو بتانا مت بیٹے کہ کہاں تھی... میں نے تو یہی کہا ہے کہ رام پور چلی گئی ہے، اپنی بہن کے پاس، کچھ دنوں میں واپس آجائے گی... پر مواد روغہ بہت پریشان کرتا تھا۔ اسے شک ہے کہ یہیں کہیں بیٹھنے لگی ہے۔''

اماں کی آنکھوں میں اپنائیت پا کر اسے بڑا سہارا ملا تھا۔ اماں اس کی حالت دیکھ دیکھ کر دکھی ہوتی رہی تھی۔ سچ مچ جگنو کا بدن جھلس سا گیا تھا۔ بال بہت چھدرے ہوگئے تھے اور چہرے کی سرخی غائب ہوگئی تھی۔

جگنو جب بھی شیشے میں خود کو دیکھتی تو گھبرا اٹھتی تھی۔ اب کیا ہوگا؟ کیسے بیتے گی یہ پہاڑ سی بیمار زندگی؟ کوئی اور سہارا بھی تو نہیں، کوئی ہنر بھی نہیں۔

پیشے پر پابندی لگ جانے کے باوجود کئی نئی لڑکیاں لکھنؤ بنارس سے آگئی تھیں اور انھوں نے بازار بگاڑ دیا تھا۔ سنا تھا شہناز کی حالت بھی خراب ہوگئی تھی، اور کلاوتی تو بھوکوں مرنے کی حالت میں پہنچ گئی تھی۔

یہ سب سن سن کر جگنو کا دل گھبرانے لگتا تھا۔

چلنے سے پہلے اس نے اماں سے کچھ روپے مانگے تو وہ اپنا رونا رونے اور بدحالی کا بیان کرنے لگی تھی۔ اس کی حالت بھی خستہ تھی۔

اور وہاں سے سینے ٹوریم لوٹتے ہوئے اس نے ان سب کی طرف امید بھری نظریں ڈالی تھیں جنھیں وہ جانتی تھی اور جو ابلتی جوانی کے دنوں میں اس کے پاس جاتے آتے رہتے تھے۔

منسو کریانے والے کو دکان پر بیٹھا دیکھ کر جگنو کے من میں نفرت سی بھر گئی تھی۔ اس کا کمر پکڑ بیٹھ جانا اور پھر جانگھیں کھجاتے ہوئے کوٹھری سے جیسے تیسے جانا —— آخ!

کنور جیت ہوٹل والا میلا پاجامہ پہنے نوٹ گن رہا تھا —— وہ اٹھنے سے پہلے ہمیشہ اُوں اُوں کی

Scanned with CamScanner

ڈکاریں لیتا تھا تو جگنو کا جی متلانے لگتا تھا۔

جگنو نے اوروں کو بھی دیکھا تھا جن سے تھوڑی بہت بھی اس کی ملاقات رہی تھی۔

سینے ٹوریم میں اور بہت دن رکنا نہیں ہوا۔ آخر آنا تو تھا ہی۔ پر وہ سبھی کی شکر گذار تھی — انھوں نے مصیبت اور تکلیف کے دنوں میں آنکھیں نہیں پھیری تھیں۔

اور جو کچھ اس نے جس سے لیا تھا، اسے نسخے کے پیچھے ہی نوٹ کر لیا تھا۔ ان دنوں میں کافی قرض چڑھ گیا تھا۔ کنور جیت ہوٹل والے نے بڑا احسان جتا کر سینتالیس روپے دیے تھے۔ منسو نے اپنا احسان تو نہیں جتایا تھا، پر روپے جلد سے جلد لوٹا دینے کی بات جتا دی تھی — پچیس روپے سے جیسے اس کا کاروبار ٹھپ ہوا جا رہا تھا۔

سنت رام فٹر نے بیس دیے تھے اور چلتے چلتے بڑا گندہ مذاق کیا تھا: ''سود میں ایک رات... ٹھیک ہے نا؟'' پر اس گندے مذاق سے اسے لگا تھا کہ آدمی کی آنکھ ابھی اس پر ٹکتی ہے۔ بدن اتنا گیا بیتا نہیں ہوا ہے جتنا شاید وہ سمجھ رہی تھی۔

تنگی کے ان دنوں میں اس نے مدن لال سے مل کر اس سے بھی تیس روپے لے لیے تھے۔ اس نے بس یہی کہا تھا، ''یہ چندے کے روپے ہیں، جلدی دے دوگی تو ٹھیک رہے گا۔ میرے پاس بھی اتنا نہیں ہوتا کہ بھر سکوں۔'' پر اس کی بات میں نہایت بے چارگی تھی۔ بہت مجبوری میں اس نے کہا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا تھا کہ وہ اسے غلط نہ سمجھے... اس کی اتنی اوقات نہیں ہے۔ اور پھر بغیر کچھ اور کہے وہ اپنی پارٹی کے دفتر میں چلا گیا تھا۔

ضرورت کی وجہ سے دل پر پتھر رکھ کر جگنو نے روپے لے لیے تھے، پر تکلیف بھی ہوئی تھی۔

اور اب، جب سے وہ سینے ٹوریم سے لوٹی تھی، پولیس والے پریشان کر رہے تھے۔ سات مہینے کا پیسہ انھیں نہیں ملا تھا۔ اس کوٹھے پر انھوں نے سب سے الگ الگ رقم باندھ رکھی تھی۔

لوٹ کر آنے کے بعد سے وہ اندر ہی اندر بڑی کمزوری سی محسوس کرتی تھی۔ بدن اب اتنا جھیل نہیں پاتا تھا۔ کوئی زیادہ چھیڑ چھاڑ کرتا تو ہلکی کھانسی آنے لگتی تھی اور پانچ پانچ سات سات منٹ تک اندر ہی دم پھولنے لگتا... اور لوگ تھے کہ سینے پر سارا وزن رکھ دیتے تھے۔

رہ رہ کر اب ویسی ہی الجھن ہوتی تھی جیسی کہ شروع شروع میں ہوا کرتی تھی، اور اسے لگتا تھا

Scanned with CamScanner

کہ اس نے یہ سب جیسے اب پہلی بار ہی شروع کیا ہے۔

بالوں کی ایک پرانی چوٹی وہ سات روپے میں کلاوتی سے خرید لائی تھی اور چھاتیوں پر بھی کپ لگانے لگی تھی۔ ہر بار انھیں نکالنے اور لگانے میں بڑی الجھن ہوتی تھی۔ کلف لگی دھوتیاں پہننے سے اسے ہمیشہ چڑ رہی تھی، پر اب کلف لگی ہی پہنتی تھی۔ بدن بھرا بھرا لگتا تھا۔

اتنا سب کرنے کے باوجود آمدنی کافی نہیں تھی۔ کوئی کوئی رات تو خالی ہی چلی جاتی تھی اور اپنی کوٹھری میں اکیلے لیٹے ہوئے وہ بہت گھبراتی تھی۔ یہ پہاڑ سی زندگی۔ دن دن ٹوٹتا ہوا جسم۔

نامرد قسم کے لوگوں سے اسے بے حد پریشانی ہوتی تھی، وہ حد سے زیادہ پریشان کرتے تھے۔ بوٹی بوٹی ٹٹولتے رہتے تھے، اور گرم ہونے کے انتظار میں بہت ستاتے تھے۔ جگہ بے جگہ ہاتھ ڈالتے تھے اور طرح طرح کی گندی فرمائشیں کرتے تھے۔

اس سے اچھے تو وہ تھے جو بھری بندوق کی طرح آتے تھے اور اپنا کام کر کے چلتے بنتے تھے۔ نہ بکواس کرتے تھے، نہ زیادہ ستاتے تھے۔ پر آمدنی اتنی بھی نہیں تھی کہ گزارہ ہو جائے۔ قرضہ اترنے میں نہیں آتا تھا۔

نسخے کے پیچھے سب کے روپے درج تھے... پر انھیں چکانے لائق پیسہ کبھی ہاتھ میں نہیں آتا تھا۔

آخر اور کوئی طریقہ نہیں رہ گیا۔ جانگھ کے جوڑ پر نکلا پھوڑا دکھانے کے لیے جگنو جب جراح کے پاس جا رہی تھی تو راستے میں منسو نے ٹوک دیا تھا، ''بہت دن ہو گئے... اب تو دھندا بھی چل رہا ہے۔''

چلتے چلتے وہ ایک طرف کو آ گئی تھی۔ پھر بہت مجبوری میں اس نے منسو سے کہا تھا، ''ایک پیسہ نہیں بچتا، کیا کروں... تم نے تو آنا جانا بھی چھوڑ دیا ہے۔''

''ہم نے تو گنگا جلی اٹھالی ہے... رنڈی بازی نہیں کریں گے۔ تلسی کی کنٹھی پہن لی ہے، یہ دیکھو!'' منسو بولا تو جگنو کو ہلکی سی ہنسی آ گئی تھی۔ وہ آنکھیں پھاڑے دیکھتا رہ گیا تھا۔

جانگھ کے جوڑ پر نکلے پھوڑے کی وجہ سے چلنے میں جگنو کو بڑی تکلیف ہو رہی تھی۔ وہ ٹانگیں پھیلا کر چل رہی تھی... منسو کا دل ڈول رہا تھا۔ گلی کے موڑ پر آ کر منسو نے دھیرے سے کہا، ''تو پھر... بتایا نہیں تم نے... کب تک انتظام کرو گی؟''

''دم ہو تو وصول کر لے جاؤ،'' جگنو نے اپنی مجبوری کو پیتے ہوئے بناوٹی شوخی سے کہا تھا، اور گلی

Scanned with CamScanner

میں مڑ گئی تھی۔ اپنی اس بات پر اسے بڑی شرم آئی تھی... مگر پھر لگا تھا کہ ٹھیک ہی تو کیا اس نے... خواہ مخواہ کی عزت کا کیا مطلب؟ اور پھر کسی کا قرض لے کر کیوں مرے؟ جو اتر جائے سو اچھا ہی ہے۔

جراح نے بتایا تھا کہ ابھی پھوڑا پکنے میں دن لگیں گے۔ باندھنے کے لیے پلٹس دے دی تھی۔ جب وہ لوٹی تو دوپہر ہو رہی تھی۔ سب اپنے اپنے چبوتروں پر بیٹھی مسکوٹ کر رہی تھیں۔ یہی وقت ہوتا ہے جب سب جاگ کر اٹھ جاتی ہیں اور شام کی تیاری سے پہلے مل بیٹھ لیتی ہیں۔ گلی میں سے کچی عمر کے لونڈوں کا غول گزر رہا تھا۔ وہ گندے اشارے کر کر کے عورتوں کو چھیڑ رہے تھے اور باپوں کو دی جانے والی گالیوں کا مزہ لے رہے تھے۔ یہ آوارہ لونڈے روز گزرتے تھے اور ان کا روز کا یہی شغل تھا۔ ڈھلتی عمر کی عورتیں گندے اشارے دیکھ دیکھ کر انؔ کے باپوں کو گالیاں دیتی تھیں اور جوان عورتیں مسکراتی رہتی تھیں۔ کبھی کبھی حسن، بنواری یا لنگڑا اماتادین ان لونڈوں کو دوڑا بھی دیتا تھا۔ تب وہ گلی کے نکڑ پر پہنچ کر گالیاں دیتے تھے اور نیکر یا گھٹنا اٹھا کر فحش حرکتیں کرتے تھے۔ لونڈوں کا یہ غول مسجد کے پیچھے والی بستی سے آیا کرتا تھا۔

دوپہر میں ہی دکھ سکھ کی باتیں ہوا کرتی تھیں اور چغلی چباؤ بھی۔ زیادہ تر چغلی ان کی ہوا کرتی تھی جو اس محلے سے اٹھ کر شریفوں کی بستیوں میں چلی گئی تھیں، جنھیں چھانٹ چھانٹ کر ابراہیم لے گیا تھا۔

شام ہوتے ہی گلی گرمانے لگتی تھی۔ پھول ہار والے آجاتے تھے۔ پنواڑیوں کی دکانیں سج جاتی تھیں اور غفور کی دکان پر ایک پولیس والا آ بیٹھتا تھا۔ اس کے بیٹھتے ہی غفور کھلے عام بوتلیں بیچنا شروع کر دیتا تھا۔

جگنو شام کو پلٹس ہٹا دیتی تھی اور بڑے بے دلی سے سنگار کر کے بیٹھ جاتی تھی۔ پھوڑا گانٹھ بن کر رہ گیا تھا۔ درد بہت کرتا تھا۔ پھر بھی وہ جیسے تیسے ایک آدھ کو خوش کر ہی دیتی تھی۔

چوبارے پر بیٹھے بیٹھے جب وہ سوچ میں ڈوب جاتی اور بے سہارا پہاڑ سی زندگی سامنے پھیل جاتی تو بہت گھبراتی تھی۔ آخر کیا ہوگا؟ وہ تو دانے دانے کو محتاج ہو جائے گی۔ لنگڑی گھوڑی کی زندگی وہ کیسے جی پائے گی؟ کیا اسے بھی مسجد کی سیڑھیوں پر برقع پہن کر بیٹھنا ہوگا اور اللہ کے نام پر ہاتھ پھیلانا ہوگا؟ اختری کی طرح... بی ہبّو اور چمپا کی طرح؟ جی جب گھبراتا تو وہ زہر کھانے کی بات سوچتی... یا ڈوب مرنے کی۔

Scanned with CamScanner

سینکڑوں مرد آئے اور گئے... پر کوئی ایک ایسا نہیں آیا جس کی پرچھائیں تلے ہی عمر کٹ جاتی۔

ذرا زیادہ جان پہچان تو انھی سے تھی جن سے روپے لیے تھے۔ پر آسرا وہاں بھی نہیں تھا۔ کس کا کیا بھروسا... کون کہاں چلا جائے۔ عمر کے ساتھ سب لوٹ جاتے ہیں۔ جہاں بال بچے بڑے ہوئے کہ ان کا آنا جانا بند۔ جہاں عمر ڈھلی کہ آدمی نے دوسرا شوق اور شغل تلاش کیا۔ تب کون آئے گا؟ پرانی پہچانی شکلیں بھی نہیں دکھائی دیں گی۔ تب کتنا عجیب اور اکیلا لگے گا... بیتے ہوئے وقت میں بیٹھ کر جینا کتنا تکلیف دہ ہوگا۔

پچھلے دنوں میں اسے بس یہی ایک تسکین ملی ہے کہ کبھی قرض دار اپنا پیسہ وصولنے کے لیے اس کے پاس آتے رہے ہیں۔ اسے امید تھی کہ منسو ضرور آئے گا۔ وہ اپنا پیسہ ضرور وصول کرے گا۔ اور وہ آیا تھا۔

منسو سے ویسا ہی بھبھکا اٹھا تھا اور وہ آیا بھی گیارہ کے بعد ہی تھا اور نمٹ چکنے کے بعد کمر پکڑ کر بیٹھ گیا تھا۔ جگنو بھی پست پڑی ہوئی تھی۔ پھوڑے پر دباؤ پڑنے کی وجہ سے وہ بلبلا اٹھی تھی اور اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ منسو کو اٹھا کر دروازے تک پہنچا آئے تاکہ وہ ہمیشہ کی طرح جانگھیں کھجاتا ہوا چلا جائے۔

منسو کی اکڑی کمر جب کچھ ڈھیلی پڑی تو بولا تھا، ''حساب یاد رکھنا...''

جگنو نے ''اچھا'' کہا تھا اور منسو کو سہارا دے کر اٹھا دیا تھا۔

رات کافی ہو گئی تھی۔ وہ وہیں پڑی پڑی کوٹھری کی دیواروں کو دیکھتی رہی تھی۔ پر ان میں دیکھنے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ مٹ میلی بھدی دیواریں جن پر کبھی اس نے ردّی رسالوں سے کاٹ کاٹ کر فلمی ستاروں کی تصویریں چپکائی تھیں۔ کونے کی کیل پر ایک ڈوری میں پرانی چوڑیوں کا گچھا لٹک رہا تھا اور دیوار کی کناری کے سہارے نیل پالش کی خالی شیشی پڑی تھی۔

کھاٹ کے نیچے گودڑ تھا اور ٹین کا بکسا۔ بکسے میں بارہ برس پہلے کا ایک پرچہ پڑا ہوا ہے۔ جس کے حروف بھی اڑ گئے ہوں گے۔ اب اس پرچے کا کوئی مطلب نہیں رہ گیا ہے۔ مسودہ مردہ ہو چکا ہے۔ اب کون جاتا ہے واپس... اور کون بلاتا ہے واپس۔ زندگیوں کے بیچ سے وقت کا دریا کنارے کاٹتا ہوا نکل گیا ہے... کہیں کوئی نہیں ہے... کوئی کہیں نہیں ہے۔

Scanned with CamScanner

صبح اٹھی تو بدن ٹوٹ رہا تھا۔ پھوڑے میں بہت درد تھا۔ جانگھ کا جوڑ پھٹا جاتا تھا۔ اس نے پھر پلٹس باندھ لی تھی۔ اور شام کو جیسے تیسے تیار ہو گئی تھی۔ پھر کوٹھری میں جا کر سب کا حساب جوڑنے لگی تھی۔ الماری کی دیوار پر اس نے نشان لگا رکھے تھے کہ کون کتنی مرتبہ آیا اور کتنے روپے پٹ گئے۔ سنت رام فنڑ چ مچ بہت بدتمیزی سے پیش آیا تھا۔ بیس روپے کے بدلے میں وہ چار بار ہو گیا تھا اور پانچویں بار جب جانے لگا تھا تو جگنو نے بہت آہستہ سے کہا تھا، ''یوں ہی جا رہے ہو؟''

''کیوں؟'' سنت رام کی نگاہوں میں کمینہ پن تھا۔

''روپیہ تو پچھلی بار پٹ گیا تھا!'' اس نے بہت جھجکتے ہوئے پر صاف صاف کہا تھا۔

''ایک بار سود کا!'' سنت رام نے بڑے گندے لہجے میں کہا تھا، ''پھوکٹ کا پیسہ نہیں آتا... سمجھی؟'' اور کوٹھری سے نکل کر سیڑھیاں اتر گیا تھا۔

جگنو مایوسی میں دیکھتی رہ گئی تھی۔ اور ہمجولیوں کی طرح وہ جھگڑا بھی نہیں کر سکتی تھی۔ چیخ چلا بھی نہیں پاتی تھی اور آدمی کو بے عزت کر کے بھیجنا نہیں بنتا تھا۔

کنور جیت ہوٹل والے کے سب سے زیادہ پیسے چڑھے ہوئے تھے۔ وہ صرف تین بار آیا تھا۔ کل پندرہ روپے پٹے تھے، منسو کے بھی بیس اتر گئے تھے۔ ہلکی راحت ملی تھی اسے کہ تبھی پھوڑا ٹیس اٹھا تھا۔ وہ ٹانگیں پھیلا کر وہیں بستر پر لیٹ گئی تھی۔

دروازے پر آہٹ ہوئی تو دیکھا مدن لال تھا۔ اسے دیکھتے ہی ایک لمحے کو وہ اندر ہی اندر جھلا اٹھی تھی۔ جیسے ایک اور سود خور پٹھان سامنے آ کر کھڑا ہو گیا ہو... اپنی وصولی کے لیے۔

مدن لال اس بیچ نہیں آیا تھا۔ اس وقت اس کا آنا جگنو کو کھل گیا تھا۔ پھر بھی بے چارگی میں اس نے اس کو اندر بلا لیا تھا۔ مدن لال کھاٹ پر بیٹھ گیا تھا۔ اپنا تھیلا اس نے سرہانے سرکا دیا تھا۔ جگنو خاموشی سے تھیلے کو ٹٹولنے لگی تھی۔ اس میں کچھ پوسٹر تھے اور تہہ کیا ہوا ایک جھنڈا۔ ایک دو پرانے سے رجسٹر بھی تھے۔ اس کا دل دھڑک اٹھا تھا کہ کہیں وہ نقد پیسے کا تقاضا نہ کر دے۔ پھوڑا الگ ٹیس رہا تھا۔

مدن لال وہی پرانے کپڑے پہنے ہوئے تھا اور وہی جوتے۔ پسینے کی بو پوری کوٹھری میں بھر گئی تھی۔

''بہت دنوں بعد آنا ہوا،'' جیسے تیسے جگنو نے کہا تھا۔

''جوتے اتار لوں؟'' مدن لال نے دھیمی آواز میں کہا تھا۔

Scanned with CamScanner

''اتارلو۔''

''دروازہ بند کردوں؟''

''آج بہت تکلیف ہے... جانگھ کے جوڑ پر پھوڑا نکلا ہے، سیدھی تو لیٹ بھی جاؤں پر جانگھ موڑتے جان نکلتی ہے...'' جگنو نے کہا تو مدن لال تسمے کھولتے کھولتے ٹھٹک گیا۔ دل ہی دل میں وہ شرمار ہا تھا۔ جگنو بھی بہت اٹ پٹا محسوس کر رہی تھی۔ پر مدن لال نے اسے اُبار لیا تھا۔ وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا تھا۔ لیکن ہر لمحے جگنو کو ڈر لگ رہا تھا کہ گھوم پھر کر بات پیسوں پر نہ آجائے۔

''اچھا، تو چلتا ہوں۔'' مدن لال تھیلا لے کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے بہت بھری بھری نظروں سے جگنو کو دیکھا تھا۔ اسے آج لوٹتے ہوئے تکلیف ہو رہی تھی۔

اور ساری باتوں کے باوجود جگنو اب دوبارہ اسے رکنے کو کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔

بہت جھجکتے ہوئے اس نے کہا تھا، ''وہ تمھارے روپے...''

''ان کے لیے نہیں،'' مدن لال نے کہا تھا، ''تمھارے لیے آیا تھا۔''

اس کی بغلوں کے نیچے بھرا ہوا پسینہ سیاہی کے دھبے کی طرح چمک رہا تھا۔ بانہوں کی ابھری ہوئی نسیں پسیجی ہوئی تھیں۔ اس نے پسیجے ہوئے ہاتھوں سے جگنو کا ہاتھ پکڑا تھا تو لگا تھا جیسے ہتھیلی میں گدالی روئی کی ہلکی سی تپش آگئی ہو۔

''میں پھر آؤں گا،'' کہہ کر مدن لال چلا گیا تھا۔ جگنو سیدھی چوبارے پر آگئی تھی۔ دل میں کہیں افسوس بھی تھا کہ اسے ایسے ہی لوٹ جانا پڑا۔ وہ مدن لال کو دیکھتی رہی تھی۔ وہ گلی میں تین چار گھر پار کر کے کھڑا ہو گیا۔ اس کا گلی میں رکنا جیسے جگنو سے سہا نہیں جا رہا تھا۔ پھر وہ اوپر چوبارے پر ایک نظر ڈال کر پانچویں کوٹھے کی سیڑھیاں چڑھ گیا تھا۔ پتا نہیں کیسی تلملاہٹ اسے ہوئی تھی۔ پھوڑا اور زور سے ٹیس اٹھا تھا۔ پھر دھیرے دھیرے جلن شانت ہو گئی تھی۔ اگر اسے روکا ہوتا تو وہ شاید نہ جاتا۔ آخر اسے بھی تو... اب جلن برداشت ہونے لگی تھی۔ وہ تو صرف اس کی تکلیف کا خیال کر کے لوٹ گیا تھا۔ اس کے پسیجے ہاتھ کی گرمی میں کسی طرح کا دھوکا نہیں تھا۔

تبھی کنور جیت آگیا تھا۔ ایکا ایک لگا تھا جیسے کوئی پرایا گھر میں گھس آیا ہو۔ پر اپنے کو سنبھالتے ہوئے اس نے مسکرا کر دیکھا تھا۔

Scanned with CamScanner

بلقیس ادھر کونے میں کھڑی کسی پہلوان سے بات کر رہی تھی۔ جگنو چپ چاپ کنور جیت کو لے کر کوٹھری میں چلی گئی تھی۔ دروازہ بھیڑ لیا تھا۔ کنور جیت نے کنڈی چڑھا دی تھی۔

''آج تکلیف بہت ہے... پھوڑا پک گیا ہے،'' جگنو نے جیسے عاجزی سے اسے سمجھایا تھا۔

''ابھی تک ٹھیک نہیں ہوا؟'' کنور جیت نے پوچھا تھا۔

''ہاں، شاید دوایک دن میں پھوٹ جائے،'' جگنو نے جیسے معافی مانگی تھی۔

''بالکل تکلیف نہیں ہونے دوں گا... بہت دھیرج سے...'' کہتے ہوئے کنور جیت کھاٹ پر لیٹ گیا تھا۔

''مگر آج...'' جگنو نے کہا تو اس نے بہت نرمی سے اسے اپنے ساتھ لٹا لیا تھا اور بولا تھا:

''ذرا سی بھی تکلیف نہیں ہونے دوں گا۔''

جگنو بہت بے بس ہو گئی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیسے سمجھائے۔ تبھی اس نے اس کی چھاتیوں پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ دھیرے سے کروٹ لے کر جگنو نے لائٹ بجھا دی تھی، بلاؤز میں ہاتھ ڈال کر کپ نکالے اور کھاٹ کے نیچے سرکا دیے تھے۔

بہت بار اس نے کراہ دبائی اور کنور جیت کو روکا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا چھا جاتا تھا، اور زور پڑتے ہی جانگھ پھٹنے لگتی تھی۔ کنور جیت تین چار بار رکا۔ پھر جیسے اس پر شیطان سوار ہو گیا تھا۔

''ارے رک تو...'' وہ چیخی تھی مگر وہ جگنو کی ٹانگیں دبا کر حاوی ہو گیا تھا۔

''اری اماں ری... مار ڈالا!'' وہ پوری آواز میں چیخی تھی، جیسے کسی نے قتل کر دیا ہو اور تڑپ کر بے ہوش ہو گئی تھی۔

''سالی!'' ہانپتے ہوئے کنور جیت بولا اور اسے چھوڑ کر نڈھال سا بیٹھ گیا تھا۔

کوئی ایک منٹ بعد جگنو کو ہوش آیا تھا۔ درد کچھ تھما تھا تو اس کے ہاتھ پیر چلے تھے۔ تکیے کے نیچے سے کپڑا نکال کر اس نے لائٹ جلائی تو پوری جانگھ پھوٹے ہوئے پھوڑے کے مواد سے بھری ہوئی تھی اور کنور جیت اس سے بالکل الگ بیٹھا اوں اوں کر کے ڈکاریں لے رہا تھا۔

''پھوٹ گیا نا،'' وہ کھڑا ہوتے ہوئے بولا تھا اور اس نے جانگھ پر ساڑھی کھسکا لی تھی۔

''دھیان رکھنا، چوتھی باری ہوئی!'' کنور جیت نے کہا اور کنڈی کھول کر کوٹھری سے باہر نکل گیا تھا۔

Scanned with CamScanner

ساڑھی کھسکا کر وہ مواد پونچھنے لگی تھی۔ ایکا ایک دل بہت گھبرا اٹھا تھا۔ اس نے دھیرے سے فتے کو آواز دی۔ فتے آیا تو اس نے گھڑے سے پانی نکلوایا تھا اور کپڑا بھگو کر مواد پونچھتے ہوئے بولی تھی، ''دیکھ فتے... اُدھر بملا کے گھر ایک آدمی گیا ہے... چلا نہ گیا ہو تو ذرا بلا لا۔ نیلی قمیض پہنے ہے، تھیلا ہے اس کے پاس۔''

''گاہک آدمی ہے؟'' فتے بولا تھا۔

''نہیں، آپس کا آدمی ہے،'' جگنو نے کہا تھا، ''ذرا سا پانی اور دے دے۔''

فتے گھڑے سے پانی نکال کر لایا تھا تو کچھ سوچتے ہوئے، بولی تھی، ''رہنے دے... تو اپنا کام کر۔ وہ کہہ گیا ہے، آجائے گا کبھی۔'' یہ کہتے کہتے اس نے پھوڑے کو ہلکے سے دبایا تو کچھ اور مواد نکل پڑا تھا اور درد سے اس کے چہرے پر پسینہ پھوٹ آیا تھا۔

❊❊

سٹی پریس میں دستیاب رسائل وجرائد

کتابی سلسلہ مکالمہ کراچی
مدیر: مبین مرزا

کتابی سلسلہ دنیازاد کراچی
مدیر: آصف فرخی

ماہنامہ آئندہ کراچی
مدیر: محمود واجد

ماہنامہ جریدہ کراچی
مدیر: خالد جامعی/عمر حمید ہاشمی

سہ ماہی بادبان کراچی
مدیر: ناصر بغدادی

ارتقا کراچی
ترتیب: حسن عابد، راحت سعید

سویرا لاہور
ترتیب: محمد سلیم الرحمٰن/ریاض احمد

دبستان لاہور
مدیر: مرتضیٰ برلاس

سہ ماہی ادراک گوجرانوالہ
مدیر: خالد فتح محمد، اسد ملک

قرطاس گوجرانوالہ
مدیر: مکنون احمد جان

سمبل راولپنڈی
مدیر: محمد علی فرشی

سہ ماہی نیا ورق ممبئی
مدیر: ساجد رشید

سہ ماہی اردو ادب دہلی
مدیر: اسلم پرویز

ماہنامہ اردو دنیا نئی دہلی
مدیر: ڈاکٹر علی جاوید، مخمور سعیدی

سہ ماہی استعارہ دہلی
مدیر: صلاح الدین پرویز

شعر و حکمت حیدرآباد دکن
مدیر: شہریار، مغنی تبسم

ALHAMRA *Literary Review*
(Islamabad)
Ed. Ilona Yousuf

HIMAL *Southasian*
(Kathmandu, Nepal)
Ed. Kanak Dixit

Scanned with CamScanner

PAKISTANI ENGLISH BOOKS

The Distance of a Shout
(Poetry)
Kishwar Naheed
Rs.295

Four Walls and a Black Veil
(Poetry)
Fahmida Riaz
Rs.275

The New Crusades
Constructing the Muslim Enemy
Emran Qureshi & Michael A. Sells
Rs.495

Fires in an Autumn Garden
Short Stories from Urdu and Regional Languages of Pakistan
Ed. Asif Farrukhi
Rs.60

Culture and Identity
Selected English Writings of Faiz
Ed. Sheema Majeed
Rs.395

Alfarabi: The Political Writings
(Philosophy)
Charles E. Butterworth
Rs.495

Military Inc.
Inside Pakistan's Military Economy
Ayesha Siddiqa
Rs.595

Written in the Season of Fear
(Poetry)
Iftikhar Arif
Rs.395

Jihad, Hindutva and the Taliban
South Asia at the Crossroads
Iftikhar Malik
Rs.495

An Indian Passage to Europe
The Travels of Fath Nawaz Jang
Ed. Omar Khalidi
Rs.450

The Light
English translation of 'Roshnai''
Sajjad Zaheer
Tr. Amina Azfar
Rs.495

We've Learnt Nothing from History
Pakistan: Politics and Military Power
M. Asghar Khan
Rs.450

Scanned with CamScanner

کہانیاں

عطرِ کافور
نیر مسعود
Rs.80

عاقبت کا توشہ
نکہت حسن
Rs.85

دور کی آواز
فیروز مکرجی
Rs.150

ایک اور آدمی
حسن منظر
Rs.85

صحرا کی شہزادی
سکینہ جلوانہ
Rs.120

خطِ مرموز
فہمیدہ ریاض
Rs.100

آئینۂ حیرت
اور دوسری تحریریں
سید رفیق حسین
Rs.375

سوار
اور دوسرے افسانے
شمس الرحمٰن فاروقی
Rs.240

نربدا
اور دوسری کہانیاں
اسد محمد خاں
Rs.180

عربی کہانیاں
انتخاب اور ترتیب
اجمل کمال
Rs.180

ایرانی کہانیاں
انتخاب اور ترجمہ
نیر مسعود
Rs.90

ہندی کہانیاں (۳ حصے)
انتخاب اور ترتیب
اجمل کمال
Rs.540 (Rs.180 فی حصہ)

لالٹین اور دوسری کہانیاں
محمد خالد اختر
(زیرِ طبع)

طاؤس چمن کی مینا
نیر مسعود
(زیرِ طبع)

سوئی بھوک
حسن منظر
(زیرِ طبع)

Scanned with CamScanner

شخصیات

انیس
نیر مسعود
Rs,375

جوئندہ یابندہ
رالف رسل، ترجمہ: ارجمند آرا
Rs.295

جوابِ دوست
نسیم انصاری
Rs.70

قرۃ العین حیدر کے خطوط ایک دوست کے نام
ترتیب: خالد حسن
Rs.180

گردشِ پا
زبیر رضوی
Rs.70

دیواروں کے باہر
ندا فاضلی
Rs.100

دیواروں کے بیچ
ندا فاضلی
Rs.80

میری ناکام زندگی
اختر حامد خاں
Rs.80

میرا بچپن
عذرا عباس
Rs.80

نئے خاکے
اختر حامد خاں
Rs.80

چند بزرگ
اختر حامد خاں
Rs.80

Choosing to Stay
Nasim Ansari
Rs.160

Scanned with CamScanner

شاعری

آدمی کی زندگی
فہمیدہ ریاض
Rs.70

کلیات اختر الایمان
مرتبین: سلطانہ ایمان، بیدار بخت
Rs.350

نیم تاریک محبت
ذی شان ساحل
Rs.100

گرد آلود آسمان کے ستارے
ذی شان ساحل
Rs.60

رات
سعید الدین
Rs.50

روکو کو اور دوسری دنیائیں
افضال احمد سیّد
Rs.50

ای میل
اور دوسری نظمیں
ذی شان ساحل
Rs.150

شب نامہ
اور دوسری نظمیں
ذی شان ساحل
Rs.150

کراچی
اور دوسری نظمیں
ذی شان ساحل
Rs.100

جنگ کے دنوں میں
ذی شان ساحل
Rs.125

سائے چراغ کے
احمد عظیم
Rs.150

مٹی کا مضمون
فرخ یار
Rs.150

On the Outside
Zeeshan Sahil
Rs.150

The Colour of Black Flowers
Shams-ur-Rahman Faruqi
Rs.250

پریم وانی
(گیت، ترجمہ اور فرہنگ)
میرا بائی
مرتبہ: سردار جعفری
(زیرِ طبع)

کبیر بانی
(گیت، ترجمہ اور حواشی)
کبیر
مرتبہ: سردار جعفری
(زیرِ طبع)

Scanned with CamScanner

سٹی پریس کی کتابیں یہاں دستیاب ہیں

فضلی سنز
ٹیمپل روڈ، اردو بازار
کراچی

ویلکم بک پورٹ
اردو بازار
کراچی

تھامس اینڈ تھامس
نزد صدر جی پی او
کراچی

سٹی بک پوائنٹ
نزد مقدس مسجد، اردو بازار
کراچی

دی سیکنڈ فلور
5/6-C، خیابان اتحاد
ڈیفنس فیز 7، کراچی

مکتبہ دانیال
عبداللہ ہارون روڈ، نزد جبیس ہوٹل
صدر، کراچی

سندھی لینگویج اتھارٹی
لطیف آباد
حیدرآباد

سندھی ادبی بورڈ بک اسٹال
تلک چاڑی
حیدرآباد

کریمی بک کارپوریشن
نزد چاندنی شاپنگ مال
حیدرآباد کینٹ

خالد بک ڈپو
درانی چوک
خانپور

کتاب نگر
حسن آرکیڈ
ملتان کینٹ

ڈاکٹر ریاض مجید
D-288، پیپلز کالونی
فیصل آباد

کوپرا بک شاپ
70، شاہراہ قائداعظم
لاہور

بک ہوم
بک اسٹریٹ، 46، مزنگ روڈ
لاہور

لندن بک کمپنی
کوہسار مارکیٹ،
F-6-3، اسلام آباد

مسٹر بکس
10۔ڈی
سپر مارکیٹ
اسلام آباد

قلات پبلشرز
رستم جی لین، جناح روڈ
کوئٹہ

مکران بک ہاؤس
ایئرپورٹ روڈ
نزد دشتی مارکیٹ
گوادر

Scanned with CamScanner

سالانہ خریداری

ایک اہم اطلاع

براہ کرم نوٹ کر لیجیے کہ بڑھتی ہوئی لاگت کے پیش نظر یکم جولائی ۲۰۰۷ء سے آج کی سالانہ خریداری کی شرح میں اضافہ کیا جا رہا ہے۔ اب پاکستان میں چار شماروں کے لیے سالانہ خریداری کی شرح، بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ، چار سو روپے ہوگی۔ یہ نرخ یکم جولائی کے بعد نئی خریداری اور تجدید خریداری دونوں پر نافذ ہوگا۔ اسی طرح بیرون ملک سالانہ خریداری کی شرح، بشمول رجسٹرڈ ہوائی ڈاک خرچ، چار شماروں کے لیے پچاس امریکی ڈالر ہوگی۔

سالانہ خریدار پہلے کی طرح سٹی پریس بک کلب کی طرف سے کتابوں کی خریداری پر دی جانے والی رعایت سے مستفید ہوسکیں گے۔

امید ہے کہ ہمیں اپنے مستقل پڑھنے والوں کا تعاون پہلے کی طرح حاصل رہے گا۔ شکریہ۔

Scanned with CamScanner

کراچی کی کہانی

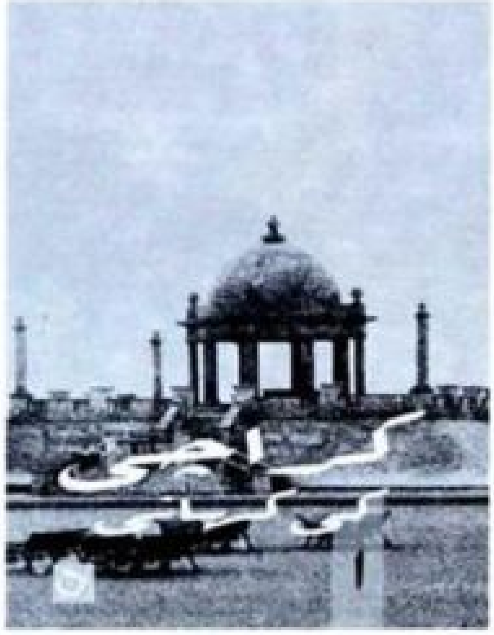

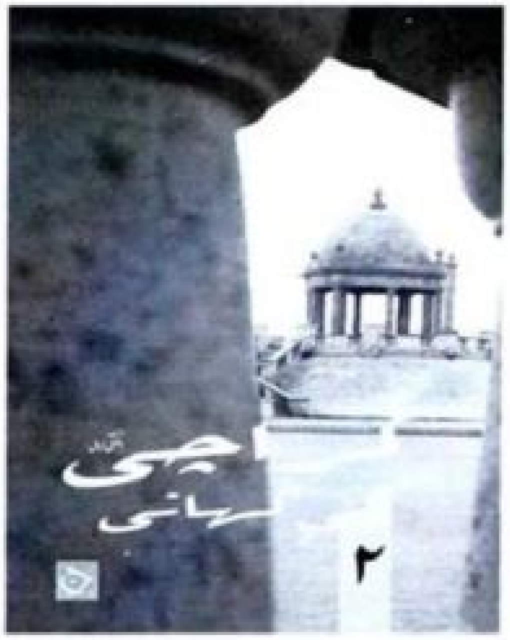

کراچی کے بارے میں معلومات کا ایک جامع ذخیرہ:

آج سے سو برس بعد بھی دو جلدوں پر مشتمل یہ انتخاب

اس بڑے شہر کی بابت بنیادی معلومات کے ماخذ کے طور پر کارآمد ہوگا۔

— روزنامہ ڈان، کراچی

اٹھارویں صدی سے موجودہ دور تک کراچی شہر کے عہد بہ عہد سفر کی دستاویز

منتخب یادداشتیں، مضامین، تجزیے، نقشے اور تصویریں

۹۵۰ صفحات پر مشتمل دو جلدوں میں

قیمت: ۱۱۰۰ روپے

سہ ماہی ''آج'' کے سالانہ خریداروں کے لیے خصوصی رعایتی قیمت: ۵۵۰ روپے

Scanned with CamScanner

۵۷

قیمت
۱۲۰ روپے

آج کی کتابیں
۳۱۶ مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ،
صدر، کراچی ۷۴۴۰۰

Scanned with CamScanner